سلسلۂ ندوۃ المصنفین

نمبر (۷)

غلامانِ اسلام

جس میں اُن مقتدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کیے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت واقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقشِ دوام بنکر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔

تالیف

مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ فاضل دیوبند

مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

سلسلۂ ندوۃ المصنفین

(۷)

غلامانِ اسلام

جس میں اُن مقدر ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کیے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقشِ دوام بن کر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں

تالیف

مولانا سعید احمد ایم۔ اے فاضلِ دیوبند

منیجر ندوۃ المصنفین کے اہتمام سے

جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی

غیر مجلد ۱۲؍ (۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء) مجلد ۵؍

فہرست مضامین

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
ع	۱۰	مخالفت	مخالفت
۱۲	۶	آمیہ	اُمَیَّہ
۲۰	۱۴	نگینگے	نگینگی
۲۴	۱۳	خولد	خُویلد
۴۲	۳	کی	کے
"	"	اُٹھائیں	اُٹھائے
۴۷	۸	۹۴	۹۱
۵۴	۸	تم لوگ تمنا کرو	تم اپنی تمنائیں ظاہر کرو
۵۶	۲	عبداللہ بن ابی کر	عبداللہ بن ابی بکر
۵۸	۲	تھے	تھا
۷۱	۹	جد جہد	جد و جہد
۸۴	۱۰	اس میں	زمین کی کسی گوشہ میں
۱۲۱	۱۰	مجھے	مجھ سے
۱۲۷	۶	فقر منش	فقیر منش
۱۲۸	۹	ہیں	سے
۱۳۱	۱۱	اسی لیے	اس لیے
۱۴۸	۱۴	راز گار	روزگار
۱۶۷	۱۰	سُفان	سفیان
۱۶۹	۲	کمیشن	کشش
۱۸۹	۴	وذعا	ودعًا
۲۲۱	۱۳	واجد	ماجد
۲۴۶	۸	نملق	غلق
"	۱۶	کا اندازہ اس	کا اس
۲۶۰	۲	تنبہ	تنبیہ
۲۷۵	۱۰	اگرچہ یہ ظاہری	اگرچہ ظاہری
۳۲۸	۱۲	معینًا	مُعْتَنِیًا
۳۳۲	۱۵	سب ال میری میرے	سب ال میرے
۴۱۶	۱۵	مسرورًا	سرورًا
۴۳۰	۸	بنی تصلب	دینی تصلب
۴۴۵	۱۳	بغوری	بغوی
۴۸۴	۱۱	ملامت بود دو اسرار	ملامت بود در اسرار
۴۸۵	۳	محیط	مہبط
۴۸۷	۱۳	بنتا	ہنستا
۴۹۴	۲	تویہ	توبہ
۵۳۱	۷	زیادہ	زیادہ تر

اِنتساب

اُن مقدس، پاکیزہ روحوں کے نام جن میں سے ہر ایک
زبانِ حال سے پکار پکار کہہ رہی ہے۔

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرۂ آفتابِ تابانیم

ندوۃ المصنفین دہلی

مقدّمہ

اس کتاب کے پہلے حصّہ میں جو "اسلام میں غلامی کی حقیقت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام نے غلامی کے رواج کو کس مصلحت سے یک قلم ممنوع قرار نہیں دیا اور اُس نے اس رواج کو باقی رکھا بھی تو کن اصلاحات و ترمیمات کے ساتھ جس کی وجہ سے غلامی غلامی نہیں بلکہ برادری بن گئی۔ اب اس دوسرے حصّہ میں تاریخی شہادتوں کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات پر کس طرح عمل کیا، غلاموں سے متعلق اُن کی ذہنیتوں میں اسلام نے کیسا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس انقلاب سے مسلمانوں کی اجتماعی و تمدنی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی۔ قبل اس کے کہ آپ اصل کتاب کا مطالعہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ میں اختصار کے ساتھ اُن عظیم الشان نتائج و اثرات کا تذکرہ کر دیا جائے جو غلامی اور غلاموں سے متعلق اسلام کی روشن تعلیمات، اور اُس کے بلند نقطۂ نظر پر مرتب ہوئے اور جن کا ثبوت آپ کو اصل کتاب کے ہر صفحہ میں ملیگا

اسلام میں غلامی کا تصور اسلام سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں تک نے غلامی کو نوعِ انسانی کی ایک مستقل صنف قرار دے کر عام انسانوں کو آزاد اور غلام کی دو قسموں پر تقسیم کر رکھا تھا اور پھر جتنے تمدنی اور معاشرتی حقوق تھے وہ سب آزاد لوگوں کے لیے مخصوص تھے۔ غلام اُن سے بہرہ اندوز

نہیں ہو سکتے تھے۔ ان قوموں کی اس ذہنیت کا اثر یہ ہوا کہ غلام کو سوسائٹی کی نگاہ میں ذلیل سمجھا جاتا
تھا۔ سوشل زندگی میں اُس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ پھر اُس کی بیوی بچے اور اولاد در اولاد اُن سب کے
ساتھ اسی نفرت و حقارت کا معاملہ ہوتا تھا، لیکن اسلام نے غلامی کو اُس زمانہ کے آئینِ جنگ کے
مطابق محض ایک قسم کی سزا قرار دیا، جس کا تعلق اُس شخص کی ذات سے دائمی نہیں بلکہ محض عارضی
اور زوال پذیر ہوتا ہے۔ اسلام میں جس طرح ذات پات کی ادرادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ کی طبقاتی تقسیم قطعاً
ایک بے معنی چیز ہے۔ اسی طرح اسلامی نقطۂ نظر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسانی سوسائٹی کو
آزاد اور غلاموں کے دو طبقوں پر تقسیم کیا جائے۔ اور پھر دونوں کے مدنی و شہری حقوق کی الگ الگ
تشخیص و تعیین کی جائے[1]۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک غلامی کی حیثیت سزا کی سی ہے آزاد
اور غلام میں فرق و امتیاز ہے لیکن سوشل معاملات، تمدنی حقوق اور انسانی مقتضیات کے اعتبار سے
آقا اور غلام دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مصر کے نامور فاضل اور مصنف ڈاکٹر حسن ابراہیم
نے بالکل صحیح لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"اسلام نے غلاموں کی حالت کو سدھارا اور آزادی کی راہ میں ان کی دستگیری کی، اسلام نے
کھانے پینے، لباس اور تعلیم و تہذیب اور دوسرے بڑے بڑے مدنی و شہری حقوق
(Civil rights) میں آقا اور غلام دونوں کو برابر کے درجہ میں رکھا ہے[2]"

آزاد کردہ غلام کی حیثیت یہی وجہ ہے کہ اسلام میں غلام جب تک غلام رہتا ہے اُس کے لیے بحیثیت
سزا یافتہ ہونے کے کچھ ایسی پابندیاں ضرور ہیں جن سے اُس کے انسانی شرف و عظمت پر کوئی اثر

[1] اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے دیکھو "اسلام میں غلامی کی حقیقت" [2] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۲۳۱۔

نہیں پڑتا، لیکن آزاد ہو جانے کے بعد تو ۔ جس کے لیے اسلام نے متعدد اختیاری اور اضطراری طریقے تجویز کیے ہیں اور فکِّ رقبہ کو سب سے بڑا ثواب کا کام قرار دے کر اس کی طرف مسلمانوں کو شدید رغبت دلائی ہے ۔ غلام اور آزاد میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔

امام نووی اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اِنّ حکم السید علیہ وملکہ لہٗ	غلام پر اس کے آقا کا حکم اور اس کی ملکیت غلام کی
کحبل فی رقبۃ العبد وکالغل	گردن میں ایک رسی اور اس طوق کی طرح ہے جو اس
المانع لہ من الخروج فاذا اعتق	کو نکلنے سے منع کرے، لیکن جب وہ آزاد ہو جاتا ہے
فکانّہٗ اُطلقت رقبتہٗ من ذلک[1]	تو گویا اس کی گردن رسی یا طوق سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے

ولاء کا تعلق | بلکہ آزاد ہونے کے بعد غلام اور آقا میں ایسا تعلق اور رابطہ قائم ہو جاتا ہے کہ غلام اپنے آقا کے خاندانی یا قبائلی شرف و مجد میں برابر کا شریک سمجھا جاتا ہے، شریعت اسلام کی اصطلاح میں اس تعلق کو ولاء کہتے ہیں۔ اور اس کو "الولاء لحمۃ کلحمۃ النسب" فرما کر اتنا مضبوط اور ناقابل انفکاک قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح وہ شخص جو اپنے باپ کے علاوہ اپنے آپ کو کسی اور شخص کا بیٹا بتاتا ہو عند الشرع ملعون ہے، اسی طرح جو غلام کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے اس پر بھی لعنت بھیجی گئی ہے[2]۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مولی القوم منھم (کسی قوم کا مولیٰ اسی کا ایک فرد ہوتا ہے) علامہ ابن خلدون اس کی توضیح اس طرح کرتے ہیں:۔

"اہل عصبیت جب غیر نسب کے لوگوں کے ساتھ کوئی مخالفت کرتے ہیں، یا ان کو غلام بناتے

---

[1] شرح صحیح مسلم ج ۹ ص ۱۳۵ [2] صحیح مسلم کتاب العتق

ہیں اور یہ لوگ ان کے ساتھ مکمل مل کر رہتے ہیں تو یہ بھی عصبیت میں اہل قبیلہ کے شریک بنجاتے ہیں جیسا کہ ارشاد نبوی ہے "مولی القوم منھم" یہ مولیٰ عام ہے، خواہ مولیٰ رِق ہو یا مولیٰ عتاقہ[1]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:-

تمام بڑی بڑی حکومتوں کے آزاد کردہ غلاموں کا حال یہی تھا، یہ حکومت کے ولاء میں حصہ دار ہونے کے باعث نہایت عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ حکومتِ بنو عباس میں تُرک موالی، بنو برمک، اور بنو نوبخت اس دعوے کے شاہد عدل ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ ہارون رشید کے ولاء کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے جعفر بن یحییٰ بن خالد کس قدر معظم و محترم سمجھا جاتا تھا[1]"

آزاد کردہ غلام کے مدنی حقوق آزاد ہونے کے بعد اب وہ تمام کام کر سکتا ہے جو ایک حُرّالاصل انسان کے لیے جائز ہیں، وہ لشکروں کی قیادت کر سکتا ہے۔ چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، اور اپنے اندرونی و بیرونی معاملات میں تصرف و اختیار کا پورا مجاز ہے۔

قیادتِ لشکر حضرت اُسامہ بن زید بن حارثہؓ غلام زادہ تھے، اور کمسن بھی لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس لشکر کی قیادت کے لیے منتخب فرمایا جس میں حضرت عمر ایسے اکابرِ صحابہ شامل تھے۔ یہ لشکر مقام خندق تک پہنچا تھا کہ سید کونین کا وصال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے بعض حضرات کی چہ میگوئیوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ہی باقی رکھا، اور اب آپ نے اس لشکر کو روانہ کیا تو اس شان سے کہ حضرت اسامہ

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۹۶۔

گھوڑے پر سوار تھے۔ اور خود خلیفۂ اسلام اُن کی مشایعت کے لیے پاپیادہ چل رہا تھا۔ اسامہ بولے "آپ کو خدا کی قسم! یا تو آپ بھی سوار ہو جائیے، ورنہ پھر میں بھی اُترا جاتا ہوں" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "نہیں تمہیں خدا کی قسم! تم ہرگز نیچے نہ اترو اور میں بھی سوار نہیں ہونگا"[1]

امامت

آج کل نماز میں امامت ہر کہ ومہ کر لیتا ہے لیکن عہد صحابہ میں اس منصب وقیع کی یہ بوالحالت نہیں تھی۔ اس زمانہ میں وہی حضرات امامت کر سکتے تھے جو علم وفضل اور تقویٰ وطہارت میں نمایاں شخصیت رکھتے تھے اور مسلمانوں میں جنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلام کو غلامی کے رواج پر بدنام کرنے والوں کو تعجب ہوگا کہ اس عہد میں احرار کی طرح غلام بھی امامت کرتے تھے۔ اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ حضرت سالم مولےٰ حذیفہ جن کی امامت کا واقعہ حدیث کی متعدد صحیح کتابوں میں مذکور ہے، وہ تو خیر آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے علاوہ متعدد واقعات ایسے بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غلام غلامی کی حالت میں امامت کرتے تھے۔ مثلاً ابوسفیان جو عبداللہ بن احمد کے غلام تھے آزاد ہونے سے پہلے بھی نماز پڑھاتے تھے، اور اکابر صحابہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے، چنانچہ داؤد بن الحصین کے الفاظ یہ ہیں: اِنَّ اباسفیانَ کان یَؤمُّ بنی عبدالاشھل فی مسجدھم وھو مکاتَبٌ فی رمضان وفیھم قومٌ قد شھدوا بدرًا والعقبۃ۔ یہ واقعہ تو اُن کے مکاتب ہونے کے زمانہ کا ہے لیکن ایک مرتبہ جبکہ یہ مکاتب بھی نہیں بلکہ رقیق محض تھے نماز پڑھا رہے تھے کہ محمد بن مسلمہ، اور سلمۃ بن سلامۃ جو مشہور صحابی ہیں ادھر سے گذرے تو ابوسفیان کی قرأت سُننے کے لیے کھڑے ہو گئے، اور پھر فرمایا۔

---

[1] تاریخ ابن جریر طبری ج ۳ ص ۲۱۲۔

ما بهذا من امام باس[1] ایسے امام میں تو مضائقہ نہیں ہے۔

اسی طرح ذکوان بھی جو حضرت عائشہ کے غلام تھے اور جن کو انہوں نے مدبر کر دیا تھا قریش کی امامت کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ مقام حراء اور ثبیر کے درمیان قیام پذیر تھیں، ان سے شرف نیاز حاصل کرنے قریش کے بڑے بڑے وفد آتے تھے، اسی اثناء میں نماز کا وقت ہو جاتا تھا تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر امامت کرتے تھے، اور اگر وہ موجود نہ ہوتے تو ذکوان (فنا ہا) اس فرض کو انجام دیتے تھے[2]

شادی | آج کل سادات اور شیوخ غیر ذات کے لوگوں سے خواہ وہ کیسے ہی حرّ الاصل ہوں ازدواجی تعلق قائم کرنا اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں، لیکن عہد صحابہ وتابعین میں غلاموں سے متعلق اسلام کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کا اثر یہ تھا کہ نہایت نجیب الطرفین حضرات بھی باندیوں اور غلاموں سے شادی کرنے کو ذرا معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ امام زین العابدینؒ جو خانوادۂ نبوت کے چشم وچراغ تھے اُن سے بڑھ کر نجیب وشریف کون ہوگا، سید الشہدا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد ان کی والدۂ محترمہ (شہر بانو) بیوہ ہوگئیں تو امام زین العابدینؓ نے اُن کا نکاح امام حسینؓ کے غلام زبید سے کر دیا اور خود اپنا نکاح اپنی ایک باندی سے اُسے آزاد کر کے کر لیا۔ عبدالملک بن مروان نے اس پر طعن کیا تو امام عالیمقام نے جواب میں ارشاد فرمایا "ہم سب کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسوۂ حسنہ تھے۔ آپ نے حضرت صفیہ کو آزاد کر کے اپنا نکاح اُن سے کیا، اور اپنی پھوپی زاد بہن حضرتِ زینب بنت جحش کو اپنے غلام حضرت

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۲۶ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۸۔

زید کے حبالۂ عقد میں دیا۔[1]

حفظِ ناموس غلاموں اور باندیوں کے ناموس کی حفاظت بالکل احرار کے ناموس کی طرح کی جاتی تھی اگر کوئی شخص اس پر حملہ کرتا تو اُسے خاطر خواہ سزا ملتی تھی۔ عہدِ فاروقی کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ کسی غلام نے ایک باندی کے ناموس کو مجروح کرنے کی کوشش کی، حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے غلام کے کوڑے لگوائے اور اُس کو شہر بدر کر دیا۔[2]

کسی غلام اور حُر میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا، تو غلامی اور آزادی سے صرفِ نظر کر کے معاملہ کی واقعی تحقیق کیجاتی تھی۔ اور پھر جس کا حق ثابت ہوتا تھا، اُسے بے تکلف دلا دیا جاتا تھا، ایک مرتبہ حضرت اُسامہ بن زید مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اور عمرو بن عثمان میں ایک جائداد سے متعلق نزاع ہو گیا، دونوں میں سے ہر ایک اُس کی ملکیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ عمرو بن عثمان نے کہا "اے اُسامہ! کیا تمہیں میرا مولیٰ بننے سے نفرت ہے؟ حضرت اُسامہ نے فرمایا "بخدا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ولاء کے بدلہ میں تو میں تجھ سے نسبی تعلق قائم کرنے کو بھی قبول نہیں کر سکتا" فیصلہ کے لیے دونوں حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سعید بن العاص اس مجلس میں موجود تھے، وہ یہ دیکھ کر عمرو بن عثمان کے حامی ہو گئے اور اُسے حجت کی تلقین کرنے لگے۔ اب حضرتِ حسنؓ آگے بڑھے اور وہ حضرت اُسامہ کے پہلو میں بیٹھ کر انہیں دلیل بتانے لگے۔ اس کے بعد عتبہ بن ابی سفیان، عمرو بن عثمان کا حامی ہو گیا۔ اتنے میں امام حسینؓ بھی تشریف لے آئے اور وہ بھی حضرت اُسامہ کی حمایت کرنے لگے۔ غرضکہ اس طرح دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک جانب عبدالرحمن

---

[1] کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۹۴ [2] مؤطا امام محمدؒ باب الاستکراہ فی الزنا۔

بن ام الحکم اور ولید بن عقبہ تھے جو عمرو بن عثمان کے حامی تھے، اور دوسری جانب حضرت عبداللہ بن عباس، اور عبداللہ بن جعفر تھے جو حضرت اُسامہ کی تائید کر رہے تھے، دونوں طرف کے دلائل و شواہد سُننے کے بعد امیر معاویہ نے فرمایا "جو اصل معاملہ ہے وہ مجھ کو معلوم ہے، جب یہ جائداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسامہ کو عطا فرمائی تھی، اُس وقت میں خود وہاں موجود تھا" اس فیصلہ کو سُن کر تمام ہاشمی جو یہاں موجود تھے بہت خوش ہوئے اور گھر واپس چلے آئے[1]

تحصیل علم وفضل غلاموں اور آزادوں میں سوشل مساوات اور برابری کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ تحصیلِ علم و کمال کے دروازے دونوں پر یکساں کھُلے ہوئے تھے اور جو غلام اپنی فطری استعداد، محنت اور ذاتی ذوق و شوق کے باعث علم وفضل میں کوئی نمایاں مقام حاصل کر لیتے تھے اُن کی تعظیم و تکریم اُن کی علمی جلالتِ شان کے مطابق کی جاتی تھی، بڑے بڑے سلاطین و امراء اُن کی قدر دانی کرتے، اور اُن کی عظمت و برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ عہد تابعین تو اس لحاظ سے خاص طور پر مشہور ہے کہ اس زمانہ میں فقہ کے اکثر مراکز پر موالی کا قبضہ تھا۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم کا بیان ہے کہ جب عبادلہ ثلاثہ یعنی حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کا انتقال ہوگیا تو تمام ممالک میں فقہ کے مراکز موالی کی طرف منتقل ہوگئے۔ چنانچہ مکہ میں حضرت عطاء بن ابی رباح یمن میں طاؤس بن کیسان یمامہ میں یحییٰ بن ابی کثیر، بصرہ میں حسن بصری، کوفہ میں ابراہیم النخعی، شام میں مکحول الدمشقی، اور خراسان میں عطاء الخراسانی فقہ میں مرجعِ انام تھے۔ البتہ مدینہ میں صرف حضرت سعید بن المسیب فقہ کے امام

---

[1] الکامل للمبرد، مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۸۱۔

سمجھے جاتے تھے، جو قریشی الاصل تھے[1]۔ اُستاذ کرد علی جو عہد حاضر کے مشہور مفکر اسلام اور مصنف ہیں لکھتے ہیں:۔

"غلام زیادہ تر روم، فارس، حبش، سوڈان وغیرہ اُن قوموں میں سے ہوتے تھے جو جزیرۃ العرب کے پروس میں واقع تھیں اور جنہوں نے عربوں سے جنگ کی تھی ان میں کثرت سے وہ لوگ تھے جن کی اولاد کو مسلمانوں نے اچھی تربیت دی، اُن کو قرآن و سنت کا عالم بنایا جسکی وجہ سے علم و فضل میں عربی الاصل صحابہ اور کبارِ تابعین کے ہمسر ہو گئے، کوئی شہر ایسا نہیں تھا جس میں طالبان علم موالی کی بھاری تعداد موجود نہ ہو اور بعض شہروں میں تو فقہاء موالی کی تعداد عرب فقہا سے کہیں زیادہ تھی[2]۔"

اسلام کی عام اخلاقی تعلیم اور خصوصاً اُن تعلیمات نے جو غلاموں اور باندیوں سے متعلق تھیں، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال نے عربوں کی پُرانی ذہنی عصبیت میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی تھی، لیکن پھر بھی عام لوگوں میں پُرانی ذہنیت کا کچھ اثر باقی تھا کہ اکابرِ صحابہ اور اہل بیت کے عمل نے اس کا بالکل خاتمہ کر دیا، جاحظ کا بیان ہے کہ لوگ باندیوں سے نکاح کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور اسی طرح جو باندیوں کے بطن سے ہوتے تھے ان کو بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، لیکن جب ان لوگوں نے حضرت ابو القاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم بن عبداللہ بن عمر اور علی بن الحسینؓ کو دیکھا کہ ان تینوں کی والدہائے محترمہ وہ خواتین تھیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی تھیں[3] اور اس کے باوجود مدینہ حجاز اور عراق میں کیا تمام روئے زمین

---

[1] معجم البلدان ج ۳ ص ۱۲؍۴ [2] الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹۴۔

[3] علی بن الحسینؓ کی والدۂ ماجدہ کے متعلق اس روایت کو اگرچہ ابن خلکان جیسے نامور مورخ نے قبول کیا ہے تاہم اسکی صحت میں بہت کچھ کلام کی گنجائش ہے۔ مگر جیسا کہ ظاہر ہے اس وقت ہمارا موضوع اس روایت کی تنقیح نہیں بلکہ غلاموں اور باندیوں کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر اور ان کی ذہنیت کے لحاظ سے اس کی اہمیت ظاہر کرنا ہے۔

میں کوئی نہ تھا جو عزت وشرف میں ان کا حریف بن سکے، توان لوگوں کی ذہنیتوں میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی، ابو العباس مبرد نے اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے جاحظ کی تائید ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں بھی حضرت ابو القاسم، سالم، اور علی بن الحسین رحمہم اللہ کا تذکرہ ہے[1]۔

مسلمانوں کی اس پاک صاف ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ قول استاذ کرد علی "وہ غلاموں کے ساتھ اپنا جیسا معاملہ کرتے تھے۔ اُن کے لیے فراخیٔ عیش کے دروازے کھلے رکھتے تھے انہیں تعلیم دیتے اور بہترین تربیت سے آراستہ کرتے تھے، ان کی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ غلاموں کا نکاح اپنی بیٹیوں سے، اور اپنا نکاح لونڈیوں سے کرتے تھے، یہاں تک کہ غلام لطف وکرم کی اس روح پرور فضا میں رہ کر اپنے آپ کو آزاد، اور آقا کے گھر کا ایک فیملی ممبر سمجھتا تھا[2]۔

اس اعلےٰ تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوکر، غلاموں، اور غلام زادوں نے تاریخ میں کیسے کیسے عجیب وغریب علمی اور عملی شاندار کارنامے کئے؟ اور مسلمانوں نے ان کے کمالات ذاتی، اور علم وفضل کی کس طرح قدر کی؟ اور اسلامی سوسائٹی نے اُن کے ساتھ کس تعظیم وتکریم کا معاملہ کیا؟ یہ چند سوالات ہیں جن کے تحقیقی ومستند جوابات آپ کو زیر نظر کتاب کے صفحات میں ملینگے۔

آخر میں کتاب کی نسبت دو ایک باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس کتاب کی تصنیف کا ارادہ کیا گیا تھا، تو خیال تھا کہ اس میں محدثین وفقہاء اور اولیاء

---

[1] دیکھو الکامل للمبرد ج ۲ ص ۹۸ [2] الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹۴۔

وصوفیا کے ذکر کے ساتھ اُن سلاطین و امرا کا ذکر بھی شامل کر دیا جائے جنہوں نے غلام ہونے کے باوجود عظیم الشان سیاسی کام انجام دیے ہیں لیکن تاریخ و سیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سلاطین و امراء کا ذکر تو درکنار۔ ایک ضخیم جلد میں تمام محدثین و فقہاء کا تذکرہ بھی نہیں آسکتا، چنانچہ اس کتاب میں بہت ہی منتخب اور نمایاں اربابِ علم و فضل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر ان کا استیعاب کیا جاتا تو انہی کے حالات میں کئی جلدیں ہو جاتیں۔ پھر غلام سلاطین و امراء بھی اس کثرت سے ہیں کہ اُن کے ذکر کے لیے ایک جلد کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس بنا پر مجبوراً اس کتاب کو علماء و فضلاء کے ذکر تک محدود رکھا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عربی زبان میں "مولیٰ" کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس کے معنیٰ آزاد کردہ غلام بھی ہیں۔ اور مولیٰ اُس کو بھی کہتے ہیں جو عجمی ہونے کے باوصف کسی عربی خاندان میں مسلمان ہوا ہو، اور اُس سے مخالفت کرلی ہو۔ اس بنا پر میں نے یہ نہیں کیا کہ ہر وہ شخص جس کے نام کے آگے "مولیٰ" کا لفظ لکھا دیکھا اُس کو "غلامانِ اسلام" کی فہرست میں شامل کر لیا، بلکہ اپنی بساط کے مطابق تحقیق کی ہے کہ مولیٰ سے واقعی آزاد کردہ غلام مُراد ہے یا نہیں؟ اسی بنا پر امام بخاری وغیرہ اصحاب کا ذکر چھوڑ دیا گیا جن کو بعض اربابِ سیر نے مولیٰ لکھا ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہاں ولاءِ عتاقہ مراد نہیں بلکہ ولاءِ اسلام مراد ہے۔ اسی طرح میں نے امام شعبی وغیرہ ایسے اصحاب کا تذکرہ بھی شاملِ کتاب نہیں کیا ہے، جن کی نسبت ایک ضعیف سی روایت ہے کہ ان کی ماں جنگ جلولاء کے قیدیوں میں سے تھیں اور حضرت شعبی کے والد شرجبیل کے حصّہ میں آئی تھیں۔ کیونکہ اگر یہ روایت قوی ہوتی تب بھی اولاد

چونکہ خیر الابوین کے تابع ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت شعبی غلام نہیں کہلا سکتے تھے۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے عہد صحابہ کے غلاموں کا تذکرہ ہے، پھر تابعین اور اُس کے بعد اتباع تابعین وغیرہم کا۔ یہ تقسیم طبقہ وار ہے۔ افسوس ہے کہ میں سنین کے اعتبار سے ترتیب قائم نہیں رکھ سکا۔ یعنی اس میں آپ کو بعض اُن بزرگوں کے حالات پہلے ملینگے جن کا بعد میں انتقال ہوا ہے۔ اور جو سنہ وفات کے اعتبار سے ان سے متقدم ہیں ان کا ذکر بعد میں ہے۔ ناموں کی تقدیم و تاخیر میں میں نے حتی الوسع جلالتِ مرتبت کا لحاظ ضرور رکھا ہے لیکن کہیں کہیں اس کا خلاف بھی ہو گیا ہے

واقعات کی تحقیق و تنقیح میں متعدد بھر محنت و جستجو سے کام لیا گیا ہے جو نہایت ہی مستند تاریخی مآخذ ہیں، اُن کی مدد سے معتبر اور بالکل صحیح واقعات فراہم کر کے احتیاط سے مرتب کیے گئے ہیں۔

مجھ کو یہ کہنے میں مسرت ہے کہ اگر برادر محترم مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی خود کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح نہ کرتے تو یقیناً کتاب میں بعض جگہ میری کوتاہی کی وجہ سے نہایت فاحش غلطیاں رہ جاتیں، لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب اب بھی غلطیوں سے بالکل مبرا ہے۔ اول تو کوئی انسانی کام خطا سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا اور پھر کام بھی ایک اُس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر و خطا ہو۔ اُس کی نسبت بالکل صحت کا دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟ بہر حال یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اللہ کی توفیق

سے ہی انجام پذیر ہو سکا ہے۔

وَمَا توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم وھو حسبی ونعم الوکیل

سعید احمد

ندوۃ المصنفین دہلی

۱۸۔ جون سنہ ۴۰ء

غلامانِ اسلام

تالیف

مولانا سعید احمد صاحب ایم اے فاضل دیوبند

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

حضرت ثوبان رضؓ

والد کا نام حجدر یا بجدد تھا، کنیت ابوعبداللہ، اور نام ثوبان یمن کے باشندے تھے، پہلے غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر آزاد کر دیا، اور فرمایا "اگر تم اپنے خاندان میں جانا چاہتے ہو تو وہاں چلے جاؤ، اور اگر یہاں قیام کرنا پسند کرو تو تم میرے اہل بیت میں سے ہو" انھوں نے بارگاہ نبوی میں رہنا ہی اختیار فرمایا اور سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے[1]

ایک مرتبہ آپ نے اہلِ بیت کے لیے دعا کی، حضرت ثوبان بولے "انا من اھل البیت" (میں بھی اہل بیت میں سے ہوں؟) حضرت نے فرمایا "ہاں! جب تک تم کسی دروازہ کی چوکھٹ پر نہ کھڑے ہو یا کسی امیر کے پاس سوال کرنے نہ جاؤ"[2]

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما رہے حضرت ثوبان جلوت وخلوت میں آپ کے ساتھ رہے، وفات کے بعد کچھ دنوں تک مدینہ میں ہی قیام رہا، پھر رملہ (شام) میں اقامت اختیار کر لی اور وہیں ۵۴ھ میں وفات پائی۔

حضرتِ ثوبان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شرفِ غلامی حاصل تھا وہ اس کا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱۔ [2] اصابہ جلد ۱ ص ۲۱۲

اس قدر احترام کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حمص میں بیمار ہو گئے اور وہاں کا گورنر آپ کی عیادت کے لیے نہ آیا تو آپ نے اُس کو لکھا "اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا غلام تمہارے یہاں ہوتا تو کیا تم اُس کی عیادت کے لیے نہ آتے؟ گورنر حضرت ثوبان کے ان الفاظ سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً بدحواسی کے عالم میں گھر سے نکلا اور آپ کے گھر آکر دیر تک مزاج پرسی کرتا رہا[1]۔

حضرتِ ثوبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ اس لیے آپ کو احادیث کثرت سے یاد تھیں، اور پھر حفظ حدیث کے ساتھ وہ اُس کی اشاعت و تبلیغ کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔ اس فضل و کمال کی وجہ سے لوگ آپ سے احادیث سُننے کے مشتاق رہتے تھے ایک بار لوگوں نے اس کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا "جو مسلمان خدا کے لیے ایک سجدہ کرتا ہے۔ خدا اُس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے۔ اور اس کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے[2]۔

بڑے بڑے علماء اُن سے اپنی مسموعہ احادیث کی تصدیق کراتے تھے۔ معدان بن طلحہ جلیل القدر محدث تھے۔ اُنھوں نے حضرت ابو دَرداء سے ایک حدیث سُنی تو اُس کی تصدیق حضرت ثوبان سے کی[3]۔

معدان کے علاوہ ابو ادریس الخولانی۔ ابو عامر الالہانی، عبدالرحمٰن بن غنم، جبیر بن نفیر اور دوسرے ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے[4]۔

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل، ج ۵ ص ۲۸۰ [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۷۶

[3] ابو داؤد ج ۱ ص ۲۴۷ [4] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۳۱

حضرت بلالِ بن رباحؓ

ابو عبداللہ کنیت، بلال نام، والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا۔ اصل کے اعتبار سے حبشی تھے۔ مکہ میں پیدا ہوئے، اُمیہ بن خلف اُن کا آقا تھا۔[1]

اسلام آپ اُن سات "السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" میں سے تھے جنہوں نے توحید کی دعوت پر سب سے پہلے لبّیک کہا۔ اس "جرم" میں اُن کا آقا اُمیہ بن خلف اُن کو سخت اذیتیں پہنچاتا تھا، تپتی ہوئی ریگ، اور جلتے ہوئے سنگریزوں پر ان کو لٹا دیتا اور زدوکوب کرتا۔ مشرکین کے لڑکے ان کے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر اس زور سے کھینچتے کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ مگر توحید کی شراب طہور نے ان کو جس کیفِ جاں نواز سے آشنا کر دیا تھا، اُس کا نشہ کہیں ان تکلیفوں سے کم ہو سکتا تھا۔ ابوجہل اُن کو مُنہ کے بل سنگریزوں پر لٹا کر اوپر سے پتھر کی چکّی رکھ دیتا اور جب آفتاب کی گرمی تیز ہو جاتی، تو پوچھتا "بلال! اب بھی محمد کے خدا سے باز نہ آؤ گے؟" شمع نبوت کا یہ پروانۂ جاں نثار اس وقت بھی کہتا "اَحَد اَحَد" یعنی خدا ایک ہے ایک ہے[2]۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک روز اس حالت میں دیکھا تو خرید کر آزاد کر دیا۔

فضائل حضرت بلال کی آواز نہایت شیریں اور دلکش تھی، اس لیے مدینہ طیبہ میں جب مسجد کی تعمیر ہو چکی اور نماز پنجگانہ کا اہتمام کیا گیا، تو حضرت بلال مؤذن مقرر ہوئے۔ آپ اسلام کے

---

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت بلال [2] اسد الغابہ ذکر حضرت بلال۔

سب سے پہلے موذن ہیں۔

آپ سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوات میں بھی شریک رہے۔ معرکۂ بدر میں اُمیہ بن خلف انہی کی شمشیر ابدار سے قتل ہوا۔[1] فتح مکہ کے وقت کوکبۂ نبوی مکہ میں شان و تجمل کے ساتھ داخل ہوا تو حضرت بلال اُس وقت بھی ہمراہ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ "بلال! کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دو" اللہ اکبر! وہ حریم قدس جس کو اسلام کے معمار اولین حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے تعمیر کیا تھا، ایک عرصہ تک بتکدہ رہنے کے بعد پھر ایک حبشی نژاد غلام کی اذان توحید سے گونجا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:۔

ابوبکرٍ سَیِّدُنَا وَاَعْتَقَ سَیِّدَنَا یعنی	ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور اُنہوں نے ہمارے سردار یعنی
بِلالاً[2]	بلال کو آزاد کرایا۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں "ایک دن فجر کی نماز کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو بلا کر پوچھا" اپنا کوئی ایسا عمل تم مجھ کو بتاؤ جس پر ثواب کی توقع سب سے زیادہ ہو، کیونکہ میں نے تمہارے جوتوں کی آواز اپنے آگے جنت میں سُنی ہے، حضرت بلال نے فرمایا "میں نے ایسا عمل تو کوئی نہیں کیا، البتہ دن رات میں کوئی وضو ایسا نہیں ہے کہ اُس کے بعد میں نے

---

[1] حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر خوش ہو کر یہ شعر پڑھا:۔

هنیئاً زادك الرحمٰن خیراً   فقد ادركت ثارك یا بلال

مبارک ہو، خدا تمہارے لیے خیر و برکت کو زیادہ کرے، تم نے اے بلال اب اپنا بدلہ پالیا۔

[2] بخاری باب مناقب حضرت بلال۔

نماز نہ پڑھی ہو۔[1]

سبقتِ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و حضر میں ساتھ رہنے کے باعث حضرتِ بلال رضی اللہ عنہ کو جو شرف حاصل تھا، تمام صحابہ اُس کا احترام کرتے تھے۔ ایک بار حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں کسی کام کے لیے رؤسائے مکّہ کا ایک گروہ بابِ خلافت پر حاضر ہوا اور باریابی کی اجازت طلب کی۔ ان کے ساتھ حضرتِ بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حضرتِ بلال رضی اللہ عنہ کو اندر بلایا۔ بعض سردارانِ قریش کو یہ بات ناگوار گزری اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شرفا منتظر بیٹھے ہیں اور ایک غلام کو شرفِ باریابی حاصل ہو رہا ہے۔ اِس پر عکرمہ بن ابی جہل نے کہا "بلانے والے نے سب کو ایک آواز سے بلایا لیکن ہم نے اُس وقت بھی اُس آواز کو بعد میں سُنا۔ لہٰذا اب بھی وہ ہی لوگ پہلے باریابی حاصل کرنے کے حقدار ہیں جنھوں نے اسلام کی آواز پر ہم سے پہلے لبیک کہا۔ آج ہمیں شکایت کا کوئی حق نہیں ہے"۔

نکاح آپ نے متعدد نکاح کیے تھے اور اُن کی بعض بیویاں عرب کے شریف و معزز خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ ابن ابی بکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہماری ہمشیرہ کا نکاح کسی سے کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا "تم بلال کو چاہتے ہو؟" وہ پھر واپس آئے اور یہی عرض کیا۔ حضور نے پھر وہی فرمایا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا، بالآخر وہ راضی ہو گئے اور کہا "آپ کو اختیار ہے"۔ چنانچہ آپ نے ابوبکر کی صاحبزادی کا نکاح حضرت بلال سے کر دیا۔[2] حضرتِ قتادہ کی روایت کے مطابق آپ کا ایک نکاح بنو زہرہ کی

---

[1] صحیح بخاری، باب فضل الطہور باللیل والنہار [2] طبقات ابن سعد ص ۱۶۹ جلد ۳

ایک عرب عورت سے بھی ہوا تھا[۱] اور آپ کی بیوی کا نام ہند الخولانیہ تھا[۲]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت بلال ملک شام میں جاکر متوطن ہو گئے تھے بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے وہاں بھی ایک نکاح کیا تھا[۳]۔

حلیہ حضرت بلال کا جسم لاغر، رنگ سیاہ، اور قد نہایت طویل تھا۔ سر کے بال نہایت گھنے، خمدار اور اکثر سفید تھے[۴]۔

وفات ۲۰ھ میں کم وبیش ساٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور دمشق میں باب الصغیر کے قریب دفن ہوئے[۵]۔

---

[۱] طبقات ابن سعد ص ۱۶۹ جلد ۳ [۲] ابن عساکر ص ۳۰۱ جلد ۳

[۳] مولانا شبلی نے حضرت بلال کے واقعہ نکاح کو مؤثر پیرایہ میں نظم کیا ہے، ہم اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں:-

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے بلال — کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں — جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
ہوں غلام ابن غلام اور حبشی زادہ — یہ بھی سن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
ان فضائل پہ مجھے خواہش تزویج بھی ہے — ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے حذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور — جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر
عہدِ فاروق میں جب دن کہ ہوئی ان کی وفات — یہ کہا حضرت فاروق نے بادیدۂ تر
اٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا آقا! — اٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر
اس مساوات پہ ہے معشر اسلام کو ناز — نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلم اکبر!

[۴] طبقات ابن سعد ص ۲۳۸، ۱۶۰ [۵] اسد الغابہ، ذکر حضرت بلال

حضرت صُہَیب بِن سِنَان

صہیب نام اور ابو یحییٰ کنیت تھی، والد کا نام سنان، اور والدہ کا نام سلمیٰ بنت قعید تھا۔

اِن کے والد اور ان کے چچا شاہ فارس کی طرف سے مقام ابلہ میں حاکم تھے۔ اِن لوگوں کے مکانات لبِ دجلہ شہر موصل کے پاس تھے۔ اہل روم نے ان پر شبخوں مارا اور حضرتِ صہیب کو جو اُس وقت صغیر السن تھے پکڑ کر لے گئے اور غلام بنا لیا۔ پھر ان کو قبیلۂ کلب کے لوگوں نے خرید لیا اور مکہ لے آئے۔ عبد اللہ بن جدعان نے کلب سے خرید کر آزاد کر دیا[1]

لیکن ایک دوسری روایت ہے کہ وہ خود بھاگ کر آئے تھے اور عبد اللہ بن جدعان سے محالفت کرلی تھی۔ اور ابن جدعان کی اخیر زندگی تک اُس کے ساتھ رہے[2]۔

اسلام | مکہ معظمہ میں تیس آدمی اسلام لا چکے تھے کہ حضرت صہیب حضرت عمار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ آپ نے ان میں اور حارث بن صمّہ کے درمیان مواخات کرا دی تھی۔

کفار و مشرکین مکہ نے ان پر طرح طرح کے جانگسل مصائب توڑے۔ بالآخر حضرت علی کی معیت میں ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ مکہ سے روانہ ہو رہے تھے کہ کفار نے تعاقب کیا۔ اُنہوں نے اپنا ترکش سنبھال لیا، اور فرمانے لگے "اے قریش کے لوگو! تم جانتے ہو میں تم سب سے اچھا تیرانداز ہوں، خدا کی قسم تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے یہاں تک کہ جتنے تیر میرے پاس ہیں، وہ سب

[1] اسد الغابہ باب الصاد والہاء [2] طبقات ابن سعد ص ۱۶۱ ج ۳۔

میں تم پر ختم کر دونگا، اور اس کے بعد اپنی تلوار سے کام لونگا جب تک وہ میرے ہاتھ میں رہیگی ، ہاں اگر تم میرا مال چاہتے ہو، تو میں تمہیں بتا دوں۔ ان لوگوں نے کہا " اچھا تم ہمیں اپنا مال ہی بتا دو" چنانچہ حضرت صہیب نے اُن کو اپنے مال کا پتہ بتا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا " اے ابویحییٰ! تمہاری تجارت بہت اچھی رہی۔ اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی :۔

ومِنَ النّاسِ من یشری نفسہٗ ابتغاءَ مرضات اللہ واللہ رؤفٌ بالعباد	بعض لوگ وہ ہیں جو اپنی جان اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

مزاح | طبیعت میں مزاح بیحد تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں مکہ سے روانہ ہو کر قبا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس وقت آپ کے سامنے کھجوریں رکھی ہوئی تھیں اور آپ اُن کا شغل کر رہے تھے، میری ایک آنکھ آشوب کر آئی تھی۔ راستہ میں تشنگی اور بھوک کا غلبہ رہا تھا اس لیے جاتے ہی میں نے کھجوریں کھانی شروع کر دیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "کیا تم آشوب چشم کی حالت میں بھی کھجوریں کھاتے ہو؟" میں بولا " یا رسول اللہ! میں اُس آنکھ کی طرف سے کھاتا ہوں جو اچھی ہے۔ سرور کائناتؐ یہ سُنتے ہی مسکرانے لگے، یہاں تک کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔[2]

غزوات | حضرت صہیب تیراندازی میں کمال رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر، احد، خندق اور تمام دوسرے معرکوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ عالمِ پیری میں وہ لوگوں کو جمع کرکے نہایت

---

[1] اسد الغابہ ذکر حضرت صہیب۔ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۹۹ و اسد الغابہ۔

لطف کے ساتھ اپنے جنگی کارناموں کی دلچسپ داستان سُنایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کو ان سے بہت محبت تھی۔ اُنہوں نے وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ حضرت صہیبؓ ہی میرے جنازے کی نماز پڑھائیں اور اہل شوریٰ جب تک مسئلہ خلافت کو طے نہ کریں وہ خلیفہ کے فرائض انجام دیں۔ چنانچہ اُنہوں نے تین دن تک بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ امامت کا فرض انجام دیا۔[1]

حضرت صہیبؓ کا بچپن رومیوں میں گزرا تھا۔ اس لیے زبان میں عجمیت پیدا ہوگئی تھی حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے "اے صہیب تم میں صرف تین باتیں ہیں جن کو میں بُرا سمجھتا ہوں اگر وہ نہ ہوتیں تو میں کسی کو تم پر فضیلت نہ دیتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے کو عرب کی طرف منسوب کرتے ہو۔ حالانکہ تمہاری زبان عجمی ہے۔ اور تم اپنی کنیت ابویحییٰ بتاتے ہو جو ایک نبی کا نام تھا۔ اور اپنا مال فضول خرچ کرتے ہو۔ حضرت صہیبؓ نے فرمایا: میں مال بیجا خرچ نہیں کرتا۔ اور میری کنیت ابویحییٰ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی ہے۔ لہذا میں اس کو ترک نہ کرونگا، اور میں اپنے تئیں جو عرب کی طرف منسوب کرتا ہوں تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ میں درحقیقت عربی ہی ہوں، مگر کمسنی میں اہل روم مجھ کو پکڑ کرلے گئے تھے۔ اس لیے میں نے اُن کی زبان حاصل کرلی۔[2]

حلیہ حضرتِ صہیبؓ کا قد درمیانہ تھا، نہ بہت کوتاہ، نہ زیادہ دراز۔ رنگ بہت سرخ تھا سر کے بال گھنے تھے، بڑھاپے میں مہندی کا خضاب کرتے تھے۔[3]

وفات ۳۸ھ میں بماہِ شوال مدینہ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس کی تھی۔

---

[1] اُسد الغابہ ص ۳۳ ج ۳۔ [2] اسد الغابہ ص ۳۰ جلد ۳۔ [3] طبقات ابن سعد ص ۱۶ جلد ۳

بقیع میں مدفون ہوئے۔

فضائل | آپ نے متعدد حدیثیں بھی روایت کی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "صہیب روم کا پھل ہے" اور آپ کی دلجوئی کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ ایک بار ابو سفیان (مسلمان ہونے سے قبل) حضرت سلمان، حضرت بلال، اور حضرت صہیب کے پاس سے گزرا تو ان تینوں نے کہا "اللہ کی تلوار نے اب تک اس دشمنِ خدا کی گردن نہیں اڑائی" حضرت ابوبکر نے یہ سنا تو فرمایا "تم لوگ قریش کے بزرگ کی نسبت ایسا کہتے ہو؟" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا "تم نے شاید ان کو خفا کر دیا؟ اگر واقعی ناراض کر دیا ہے تو گویا تم نے اپنے خدا کو ناراض کر دیا" یہ سن کر حضرت ابوبکر ان تینوں بزرگوں کے پاس آئے۔ اور فرمایا "اے میرے پیارے بھائیو! کیا میں نے تم کو ناراض کر دیا" انہوں نے کہا "نہیں ہم غضبناک نہیں ہوئے اے بھائی خدا تمہاری مغفرت کرے"[۲]

حضرتِ صہیب کی نسبت ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

نِعْمَ الْعَبْدُ صُهَيْبٌ لَوْ لَمْ يَخَفِ اللّٰهَ لَمْ يَعْصِهٖ[۳]	صہیب اچھے بندے ہیں، اگر وہ اللہ کا خوف نہ کرتے، تب بھی اس کی معصیت نہ کرتے۔

اسلام کی ایک یہ بھی عجیب شان ہے کہ وادیِ فاران کے داعیِ حق کی دعوتِ توحید پر کفر و شرک کی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کے باوجود جن بزرگوں نے سب سے پہلے اس دعوت کو قبول کیا، اُن میں حضرت ابوبکر ایسے بزرگِ قریش کے ساتھ حضرت بلال، حضرت صہیب

---

[۱] اسد الغابہ ذکر حضرت صہیب [۲] صحیح مسلم بحوالہ کتاب التاج الجامع للاصول ج ۳ ص ۳۴۴ [۳] ایضاً

حضرت عمار اور حضرت خباب ایسے "غلاموں" کے اسماءِ گرامی بھی نظر آتے ہیں جن کی ذات گرامی اسلام کے لیے سرمایۂ افتخار، اور جن کے اعمال مسلمانوں کے لیے باعثِ تقلید تھے۔ یہی وہ بزرگ تھے جنہوں نے سطوتِ اسلام کا پرچم لہرایا، اور اُس کی عظمت و بزرگی کا اعتراف اہلِ عالم سے کرایا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

حضرت ابُوفُکیہ

یسار نام، ابوفکیہ کنیت، قبیلۂ ازد سے تعلق رکھتے تھے، صفوان بن آمیہ کے غلام تھے[1]۔ دعوتِ اسلام کی صدا، کفر شکن مکہ میں نئی نئی بلند ہوئی تھی کہ آپ مسلمان ہوگئے۔ حضرت بلال اور حضرت صہیب کی طرح ان پر بھی شدید مظالم کئے جاتے تھے۔ آتش خیز دوپہر میں ان کو تپتی ہوئی ریت پر منہ کے بل لٹا کر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جاتا تھا کہ جنبش نہ کرسکیں یہاں تک کہ حضرت ابوفکیہ اس ظلم کی تاب نہ لاکر بیہوش ہوجاتے تھے۔ ایک بار اُمیہ نے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو جلتی ہوئی ریت پر ڈال دیا اور گلا گھونٹنے لگا۔ اتنے میں اُس کا بھائی ابی بن خلف ادھر سے گزرا اور کہنے لگا "اور مارو" چنانچہ اُمیہ برابر مارتا رہا، یہاں تک کہ اُن کو بے جان سمجھ کر چھوڑ دیا۔ حضرت ابوبکر ادھر سے گذرے، ابوفکیہ کو اس حال میں دیکھ کر جی بھر آیا فوراً اُن کو خریدا اور فی سبیل اللہ آزاد کردیا[2]۔

---

[1] اصابہ ج ۷، ص ۱۵۲۔

ہجرت ووفات آزادی کے بعد ہجرت ثانیہ کے موقع پر حبشہ چلے گئے۔ سخت ترین مصائب وآلام برداشت کرنے کی وجہ سے اعضاء میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے اور غزوۂ بدر سے پہلے ہی وفات پا گئے[1]۔

حضرت سلمان فارسی رضی

نام ونسب اسلام سے پہلے آپ کا نام مابہ تھا، مجوسی المذہب تھے، آپ کے والد اصفہان کے قریہ جی کے باشندے تھے۔ بعض کہتے ہیں آپ فارس کے شہر رامہرمز سے تعلق رکھتے تھے والد کا نام یوذخشان بن مورسلان تھا جو فارس کے ایک آتشکدہ کی خدمت کرتے تھے۔ صیغۂ معاش کاشتکاری وزمینداری تھا[2]۔

اسلام سے پہلے حضرت سلمان کے والد ان کے ساتھ بڑی محبت کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کو لڑکیوں کی طرح گھر سے باہر نہ جانے دیتے تھے حضرت سلمان فطرۃً مذہبی جوش وولولہ لے کر آئے تھے۔ اس لیے آتش کدہ کی خدمت اس انہماک سے کرتے تھے کہ آگ برابر روشن رہتی تھی۔

عیسائیت کی طرف میلان ایک مرتبہ والد نے کہا کہ میں اپنی جائداد کی دیکھ بھال کے لیے خود جا نہیں سکتا، تم ہو آؤ۔ سلمان رض راضی ہو گئے، راستہ میں ایک گرجا ملا جس میں اس وقت نماز

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ق اول ص ۹۱۔

[2] لیکن ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت سلمان ایک بادشاہ کے لڑکے تھے۔ حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کو نقل کیا ہے۔

ہو رہی تھی، سلمانؓ کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ گھر آئے تو والد کو اس کی خبر ہوئی وہ بہت برہم ہوئے اور اُن کو گھر میں مقید کر دیا۔ انہوں نے عیسائیوں سے کہلا بھیجا کہ کوئی قافلہ شام جائے تو مجھ کو اس کی خبر کرنا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ سلمان موقع پا کر اس قافلہ کے ساتھ شام کی طرف چل دیے، جہاں پہنچ کر اُنہوں نے معلوم کیا کہ عیسائیوں کا یہاں سب سے بڑا پیشوا کون ہے؟ لوگوں نے کہا، بشپ۔ سلمان اس بشپ کے پاس گئے اور اُس کے کیر کٹر کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ شخص انتہا درجہ کا ذلیل فطرت اور بدعمل تھا۔ سلمان اس کی بدعملی کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے مگر کہہ نہیں سکتے تھے۔ آخر کار وہ مر گیا، اور اُس کا قائم مقام جو دوسرا بشپ ہوا وہ بڑا عابد و زاہد اور تارک الدنیا تھا۔ سلمان اُس سے بہت مانوس تھے۔ جب یہ مرنے لگا تو سلمان نے پوچھا اب میں کس کے پاس جاؤں۔ اُس نے موصل کے کسی شخص کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ سلمان یہاں آئے تو دیکھا کہ واقعی یہ شخص بڑا عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار ہے۔ مگر چند روز کے بعد جب اس کا بھی انتقال ہونے لگا تو اُس نے سلمان کو وصیت کی کہ مقام نصیبین کے فلاں شخص کے پاس چلے جائیں۔ بشپ کی وصیت کے مطابق سلمان نے نصیبین آ کر دیکھا کہ واقعی یہ شخص بھی پہلے دو بشپوں کی طرح عابد و زاہد ہے۔ اتفاق کی بات چند روز کے بعد اُس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور اُس کی وصیت کے مطابق حضرت سلمان عموریہ آئے۔ یہاں اُنہوں نے کچھ بکریاں خرید لیں اور اُن سے معاش کا انتظام کرنے لگے۔ آخر کار وقت آیا کہ اس اسقف کا ساغر حیات بھی چھلکنے لگا۔ سلمان نے اُس سے کہا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ بشپ بولا۔ اب میری نظر میں کوئی بشپ ایسا نہیں ہے جس کے پاس جانے کی میں تم کو ہدایت کروں البتہ

ہاں اُس نبی کے ظہور کا انتظار کرو جو ریگستان عرب سے اُٹھ کر دین براہیمی کو زندہ کریگا۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ وہ ہدیہ قبول کریگا لیکن صدقہ کو اپنے لیے حرام سمجھیگا۔ اس کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ اگر تم اس سے مل سکو تو ضرور ملنا۔

غلامی اس بشپ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک حضرت سلمانؓ عموریہ میں مقیم رہے۔ کہ اتنے میں بنو کلب کا ایک قافلہ ان کے پاس سے گزرا۔ سلمانؓ نے ان لوگوں سے کہا "میں تم کو اپنی بکریاں اور گائیں دیدونگا۔ تم مجھ کو اپنے شہر میں لے چلو۔ قافلہ راضی ہوگیا، اور حضرت سلمانؓ ان کے ساتھ چلے آئے۔ مگر بعد میں ان لوگوں نے غداری کی۔ وادی القریٰ پہنچ کر انہوں نے حضرت سلمانؓ کو غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ انہوں نے یہاں کھجوریں دیکھیں تو سمجھے میرا گوہر مقصود یہیں ملیگا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے۔ حضرت سلمانؓ اپنے آقاؤں کی شدید سختیوں کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکے پھر جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اُسی دوران میں بنو قریظہ کے ایک شخص نے حضرت سلمانؓ کو خرید لیا، اور اپنے ہمراہ اُن کو لے کر مدینہ چلا آیا۔

قبولِ اسلام قیام مدینہ کے زمانہ میں حضرت سلمان فرماتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے باغ میں ایک درخت پر کام کر رہا تھا۔ اتنے میں اُس کا ایک چچا زاد بھائی آیا اور کہنے لگا خدا بنی قیلہ (انصار) کو غارت کرے میں اُن کے پاس سے ابھی گزرا تو دیکھا کہ ایک شخص جو اپنے تئیں نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور جو مکہ سے آیا ہے۔ یہ سب لوگ اُس کے اردگرد جمع ہیں۔ میں یہ سُنتے ہی اس درجہ اثر پذیر ہوا کہ ایک بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ قریب تھا کہ درخت سے گر پڑوں۔ بڑی عجلت

سے کے ساتھ اپنے آقا کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ اُس نے میرے طمانچہ مارا اور کہنے لگا
تھا اپنا کام کر، تجھ کو ان باتوں سے کیا غرض؟ حضرت سلمان اُس وقت تو خاموش ہو گئے، رات
ہوئی تو کوئی چیز لے کر قبا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض
کی کہ میرے پاس یہ چیز جمع ہو گئی تھی، اب میں اس کو آپ کے پاس بہ طور صدقہ لے کر آیا ہوں
کیونکہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک صالح بزرگ ہیں، اور آپ کے ساتھ حاجتمند لوگ ہیں
آنحضرت نے اُس کو دیکھ کر اپنا دستِ مبارک روک لیا، اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا "کھاؤ"۔
چنانچہ وہ سب کھانے میں مشغول ہو گئے اور سلمان واپس چلے آئے۔ پھر ایک مرتبہ اور آپ
کی خدمت میں حسب سابق کوئی چیز لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا یہ آپ کے لیے ہدیہ ہے،
صدقہ نہیں۔ آپ نے دست مبارک بڑھایا اور اُس میں سے خود بھی کھایا اور دوستوں کو بھی
کھلایا۔ حضرت سلمان فرماتے ہیں "میں نے یہ دیکھ کر کہا "یہ دو علامتیں تو صحیح نکلیں، اب ایک خاتم
نبوت کی علامت اور رہ گئی ہے، اُس کا بھی امتحان کر لینا چاہیے" چنانچہ ایک اور دن حضرت
سلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ اُس وقت ایک جنازہ
کے ساتھ بقیع الغرقد جا رہے تھے۔ حضرت سلمان خاتم نبوت دیکھنے کی غرض سے پیچھے ہو گئے۔
آنحضرت نے ان کا منشا معلوم کر لیا، اور اپنے دوش مقدس سے چادر سرکا دی۔ حضرت سلمان
نے خاتم نبوت دیکھی تو فوراً بڑھ کر بوسہ دیا اور رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
اُن کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اب حضرت سلمان نے آپ کو اپنا پورا واقعہ سُنایا جس سے آپ نے
بڑی دلچسپی لی، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ کے اصحاب بھی اس کو سُنیں۔ اس وقت حضرت سلمانؓ

اُس دولتِ لازوال کے مالک تھے جس کی تلاش وجستجو میں وہ اب تک سرگرداں پھرتے رہے تھے۔

آزادی | لیکن غلامی کے باعث وہ آزادی کے ساتھ تمام اسلامی فرائض انجام نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ آپ بدر واُحد کے معرکوں میں شرکت نہیں فرما سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلمان کی اس مجبوری وبے بسی کو محسوس کرتے تھے۔ آپ نے اُن سے فرمایا: "تم اپنے آقا سے مکاتبت[1] کرلو۔ حضرت سلمان نے آقا سے اس کی خواہش ظاہر کی۔ معاملہ تین سو کھجور کے درخت لگانے اور چالیس اُوقیہ سونے کے ادا کرنے پر طے ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم فرمایا کہ کھجور کے درخت لگانے میں سلمان کی مدد کریں۔ سب نے حسب مقدرت ان کی امداد کی۔ جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے۔ رہا سونا، اُس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے ایک شخص انڈے کی برابر سونا لیے ہوئے حاضرِ خدمت ہوا۔ تولنے پر معلوم ہوا کہ ٹھیک چالیس اوقیہ تھا۔ آنحضرت نے بُلا کر حضرت سلمان کو دلوا دیا جس کو ادا کرکے وہ نعمت آزادی سے بہرہ اندوز ہوگئے۔

مواخاۃ | آزادی کے بعد عرب کے قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ کسی کے حلیف ہوکر رہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان کی مواخات حضرت ابوالدرداء سے کرادی[2]

غزوہ خندق | آزادی کے بعد سب سے پہلا معرکہ خندق کا پیش آیا۔ حضرت سلمان نے اس میں بڑے جوش وخروش اور شوق وذوق کے ساتھ شرکت فرمائی، بلکہ حق یہ ہے کہ اس معرکہ کی

---

[1] یعنی کوئی معاوضہ دے کر آزادی حاصل کرو۔

[2] شروع سے یہاں تک کے تمام حالات اُسد الغابہ ج ۲ ص ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰ و ۳۳۱ سے ماخوذ ہیں۔

کامیابی ظاہری اسباب کے پیش نظر بڑی حد تک حضرت سلمان کی تجربہ کاری، دانائی اور فراست کے ہی باعث تھی۔ اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل ایک زبردست جمعیت کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف اُمنڈ آئے تھے۔ حملہ مدینہ پر تھا جس کے اردگرد نہ قلعہ تھا اور نہ فصیل تھی۔ اُدھر دشمنوں کی جمعیتِ کثیر، اور مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، حضرت سلمانؓ ایران کی معرکہ آرائیاں دیکھے ہوئے تھے۔ جنگ کے اصول سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت سلمانؓ نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں سے کھُلے میدان میں جنگ نہ کرنی چاہیے، بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ چاروں طرف خندقیں کھود کر شہر کو محفوظ کر دیا جائے۔ اس تجویز کو پسند کیا گیا، خندق کھودی گئی تو اُس کی کھُدائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفسِ نفیس شریک تھے۔ آپؐ نے انصار و مہاجرین کی یہ محنت و مشقت دیکھی تو بے ساختہ زبانِ مبارک سے نکلا اللّٰھم اِنَّ العیش عیش الاٰخرۃ، فاغفر الانصار والمھاجرۃ (ترجمہ: اے اللہ زندگی تو دراصل آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو انصار و مہاجرین کو بخش دے) فداکاران رسالت پناہ نے نبوت کی لسانِ صدق و محبت کو یوں نوا پیرا دیکھا تو جوشِ اطاعت میں بول اُٹھے۔

نحن الّذین بایعوا محمّدًا — علی الجھاد مابقینا ابدًا[1]

ہم ہی ہیں وہ جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہم زندہ رہینگے

یہ واقعہ ۸۔ ذی قعدہ ۵ھ کا ہے۔ حضور پُر نور نے خود حدود قائم کیں۔ داغ بیل ڈال کر

---

[1] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق۔

دس دس گز زمین دس دس آدمیوں پر تقسیم کر دی۔ انصار و مہاجرین میں اختلاف ہوا کہ حضرت سلمان کدھر رہینگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سلمانُ مناا ھل البیت (سلمان تو ہمارے اہل بیت میں سے ہے)

حافظ ابن حجر کی روایت کے مطابق دشمنان اسلام چوبیس ہزار کی فوجِ گراں لیے ہوئے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ یہاں آکر دیکھا خندق کھُدی ہوئی ہے، اور اندر پہنچنا سخت دشوار ہے۔ وہ اس طریقۂ جنگ سے پہلے سے بے خبر تھے وہیں محاصرہ کرکے پڑ گئے۔ تقریبًا ایک ماہ تک مسلسل محاصرہ قائم رہا۔ مگر شہر تک پہنچنا اُن کو نصیب نہ ہوا مشرکین میں سے عمرو بن عبدود ایک مشہور بہادر جنگجو تھا، وہ ہمت کرکے آگے بڑھا اور خندق عبور کر گیا۔ اب اس نے عرب کے دستور کے مطابق للکار کر کہا "کون ہے جو میرے مقابل آئے" حضرت علی نے فرمایا: "میں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خود دستِ مبارک سے تلوار عنایت کی اور عمامہ باندھا، کچھ گفتگو کے بعد دونوں میں جنگ ہوئی۔ عمرو بن عبدود کے پہلے وار کے بعد حضرت علی نے اس زور سے حملہ کیا کہ اُن کی تلوار حریفِ مقابل کا شانہ کاٹ کر نیچے اُتر آئی۔ ساتھ ہی حضرت علی نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہوگیا[1]۔ اس فتح میں بڑا دخل خندق کو تھا جس کا مشورہ حضرت سلمان نے ہی دیا تھا، اس لیے اس غزوہ کی کامیابی کو حضرت سلمان کے فضائل میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

خندق کے بعد کوئی غزوہ ایسا نہیں ہوا جس میں حضرت سلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۰ و ۳۹۲۔

کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں۔ علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں:۔

ولم یتخلف عن مشہد بعد الخندق[1] خندق کے بعد آپ کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عہد فاروق کی ایرانی جنگوں میں بھی آپ شریک ہوئے اور چونکہ یہ خود ایرانی الاصل تھے اور جنگ کے طریقوں سے پوری طرح باخبر، اس لیے آپ سے اسلامی لشکر کو بڑی مدد ملی۔

گورنری حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں مدائن کے گورنر تھے۔ اس کے باوجود درویشی وفقر کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے، اور اُس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچھاتے تھے[2]۔

زہد واتقاء زہد واتقاء کی شان یہ تھی کہ عمر بھر کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ ایک مرتبہ حضرت حذیفہ نے حضرت سلمان سے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے لیے ایک مکان بنا دیں" حضرت سلمان نے فرمایا "کیوں! کیا تم میرے لیے ایسا مکان بنانا چاہتے ہو جیسا کہ تمہارا مکان مدائن میں ہے" حضرت حذیفہ نے کہا، "نہیں ہم آپ کے لیے بانس کا مکان بنائیں گے جس کی چھت گھانس اور پھونس کی ہوگی، اور جو اس قدر مختصر ہوگا کہ آپ کھڑے ہونگے تو اُس کی چھت آپ کے سر کو لگیگی۔ اور آپ لیٹینگے تو اُس کی دیواریں آپ کے دونوں پہلوؤں کو لگینگے۔ حضرت سلمان بولے "تم نے میرے دل کی بات پالی[3]"۔

پہلے گزر چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوالدرداء اور حضرت سلمان

---

[1] اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۰۔ [2] طبقات ابن سعد ذکر حضرت سلمان [3] اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۳۱۔

دونوں میں مواخات کرادی تھی۔ حضور پر نور کی وفات کے بعد ابوالدرداؓ شام چلے گئے۔
اور حضرت سلمان عراق میں قیام پذیر تھے۔ شام سے حضرت ابوالدرداؓ نے اپنے بھائی کو
لکھا "میں یہاں بہت خوش ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مال و اولاد دونوں کی نعمت وافر
عطا فرمائی ہے۔ اور میں یہاں ارض مقدس میں ہوں" آپ نے اس کا جواب لکھا "سنو!
مال و اولاد کی کثرت یا ارض مقدس میں ہونا خیر نہیں ہے بلکہ خیر یہ ہے کہ تم کوئی ایسا عمل
کرو جو تمہارے لیے مفید ہو، اور تم اپنے تئیں مردہ لوگوں میں سے سمجھو"[1]

فضائل حضرت سلمان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تقرب حاصل تھا۔ حضرت
عائشہ فرماتی ہیں "سلمان رات کو دیر تک آپ کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ
ہم کو یہ ڈر ہو گیا کہ کہیں آپ ہم سے غافل نہ ہو جائیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا "جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے۔ علی، عمار، اور سلمانؓ۔ حضرت علی سے کسی نے
حضرت سلمان کے علم کے متعلق پوچھا۔ آپ نے فرمایا "انہیں اول و آخر کا علم دیا گیا ہے
اور وہ ایک ایسے سمندر ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتا"[2] حضرت صہیب کے واقعہ میں گزر چکا
ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق صہیب، بلال اور سلمان پر ناراض ہو گئے، آنحضرت
کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق سے ناراضگی کا اظہار کیا جس
پر انہیں پشیمان ہونا پڑا۔

ایک دفعہ حضرت سلمان نے اپنے اسلامی بھائی ابو درداء کی بیوی کو آشفتہ حال دیکھا

---

[1] اُسد الغابہ جلد ۲ ص ۳۳۱۔ [2] اُسد الغابہ جلد ۲ ص ۳۳۱۔

پوچھا "تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے؟" وہ کہنے لگی "میں کس کے لیے بناؤ سنگار کروں۔ تمہارے بھائی تو بالکل ہی تارک دنیا ہو گئے ہیں؟" حضرت ابوالدرداءؓ مکان پر تشریف لائے تو حضرت سلمان کے لیے کھانا منگایا، مگر خود معذرت کی کہ میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان بولے "تو میں بھی کھانا نہ کھاؤنگا"۔ رات کو آپ نے وہیں قیام فرمایا۔ شب کے آخر میں حضرت ابو درداءؓ عبادت کے لیے اُٹھے تو آپ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "تم پر تمہارے رب تمہاری آنکھ اور تمہاری بیوی کا سب کا حق ہے۔ روزوں کے ساتھ افطار اور شب بیداری کے ساتھ سونا بھی ضروری ہے۔ اگلے دن صبح کو دونوں نے یہ معاملہ بارگاہِ رسالت پناہ میں پیش کیا" آپ نے ابوالدرداءؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا" سلمان تم سے زیادہ مذہب سے واقف ہیں" [۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تقرب خاص رکھنے کی وجہ سے صحابۂ کرام بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ آپ اُس وقت تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو دیکھتے ہی تکیہ آپ کے لیے ڈال دیا۔ حضرت سلمان نے فرمایا" اللہ اور اُس کے رسول نے بالکل سچ فرمایا"۔ عمرؓ بولے "اے ابو عبداللہ کچھ بیان کیجیے" آپ نے فرمایا "میں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اُس وقت آپ ایک تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ آپ نے اُس کو میرے سامنے ڈال دیا۔ پھر فرمایا "اے سلمان جو کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے پاس جائے اور وہ اُس کے لیے از راہِ تعظیم و تکریم اپنا تکیہ پیش کر دے تو خدا اُس کی مغفرت کر دیگا" [۲]

---

[۱] استیعاب جلد ۲ ص ۵۷۰ [۲] مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۹۹۔

حضرت معاذ بن جبل خود بہت بڑے عالم اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے شاگرد سے کہا کہ چار آدمیوں سے علم حاصل کرنا، ان میں ایک حضرت سلمان کا بھی نام تھا۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلمان علم سے پُر ہے[1]۔ آپ نے اُن کو "سلمان الخیر" کا لقب بھی عطا فرمایا تھا۔

علالت اور وفات آپ کی عمر کے متعلق ارباب سیر و تاریخ نے عجیب و غریب روایتیں لکھی ہیں۔ صاحب اصابہ فرماتے ہیں "اس میں تو کسی کو شک ہی نہیں کہ حضرت سلمان کی عمر ڈھائی سو برس کی تھی۔ پھر ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے اسّی برس کی عمر پائی تھی بہر حال حضرت عثمان کے عہدِ خلافت میں علیل ہوئے حضرتِ سعد آپ کی عیادت کے لیے تشریف لے گیے، آپ رونے لگے۔ سعد نے فرمایا "آپ روتے کیوں ہیں؟ اب موت قریب آ رہی ہے، آنحضرت آپ سے خوش دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ اب آپ وہاں اُن سے جا کر ملینگے۔ بولے خدا کی قسم! میں موت سے نہیں گھبراتا۔ اور نہ دنیا کی حرص میری دامنگیر ہے۔ رونا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہمارا سامان ایک مسافر کے سامانِ رحلت سے زیادہ نہ ہو، اور میرے پاس یہاں اس قدر سانپ جمع ہیں۔ سعد فرماتے ہیں کہ کل سامان جس کو سانپ سے تعبیر کیا گیا تھا، یہ تھا۔ ایک بڑا پیالہ، ایک لگن اور ایک تسلہ۔ اس کے بعد سعدؓ نے کہا "مجھ کو کوئی نصیحت کیجیے"۔ فرمایا "جب کسی کام کا قصد کرو، فیصلہ کرو، یا تقسیم کرو تو خدا کو یاد رکھو[2]"۔

---

[1] طبقات ابن سعد جز ۴ ص ۶۱ [2] ابن سعد جز ۴ ص ۶۵۔

حضرتِ سعد کے علاوہ دوسرے احباب نے بھی آپ سے وصیت و نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "تم میں سے ہر شخص کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ حج، عمرہ، جہاد کرتے یا قرآن پڑھتے ہوئے جان دے اور گناہ و معصیت کی حالت میں نہ مرے"۔ اخیر لمحاتِ زندگی میں سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب آئے تو دیکھا آشیانۂ قدس کا طائر زرّیں بال قفسِ عنصری سے جدا ہو کر ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گیا ہے۔ رضی اللہ عنہ۔

حضرت زید بن حارثہؓ

نام و نسب زید نام، کنیت اُسامہ حِبُّ رسولِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب" لقب تھا۔ والد کا نام حارثہ اور ماں کا نام سعدیٰ بنت ثعلبہ تھا، والد یمن کے ایک نہایت معزز قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے اور والدہ قبیلہ طے کی ایک شاخ بنو معن سے تھیں۔

غلامی حضرت زید ابھی صغیر السن تھے کہ اُن کی والدہ انہیں ساتھ لے کر اپنے قبیلہ بنو معن کے پاس گئیں۔ راہ میں بنو قین کی ایک جماعت نے غارتگری کی اور زید کو غلام بنا کر بازار عکاظ میں بیچنا چاہا، حکیم بن حزام نے اپنی پھوپی حضرت خدیجہ بنتِ خولد رضی اللہ عنہا کے لیے چار سو درہم کے بدلہ میں خرید کر لیا۔ سعادتمندی و اقبال ازل میں مقدر ہو چکا تھا حضرت خدیجہ نے نبوت سے قبل انہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کر دیا۔ اس وقت حضرت زید

کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ سرورِ عالم نے ان کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا چنانچہ لوگ عام طور پر آپ کو زید بن محمدؐ کہا کرتے تھے۔ پھر جب آیت اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ "لوگوں کو ان کے باپوں کے نام سے بلاؤ" نازل ہوئی تو یہ کہنا چھوڑ دیا گیا۔

حضرت زید کے والد کو ان کے اس طرح گم ہو جانے کا بڑا صدمہ ہوا یہ سب کے چہیتے اور لاڈلے تھے۔ صاحب اسد الغابہ اور ابن سعد نے اُن کے چند اشعار جو انہوں نے فراق فرزند سے بے تاب ہو کر کہے تھے، نقل کیے ہیں:۔

۱۔ بکیت علیٰ زید و لم ادر ما فعل ‌ ‌ ‌ ‌ احیٌّ فیرجیٰ ام اتیٰ دونہ الاجل

۲۔ فواللہ ما ادری وان کنت سائلا ‌ ‌ ‌ ‌ اغالک سہل الارض ام غالک الجبل

۳۔ فیا لیت شعری ھل لک الدھر رجعۃ ‌ ‌ ‌ ‌ فحسبی من الدنیا رجوعک لی بجل

۴۔ تذکرنیہ الشمس عند طلوعھا ‌ ‌ ‌ ‌ وتعرض ذکراہ اذا قارب الطفل

۵۔ وان ھبّت الارواح ھیّجن ذکرہٗ ‌ ‌ ‌ ‌ فیا طول ما حزنی علیہ ویا وجل

۶۔ سأعمل نصّ العیس فی الارض جاھدا ‌ ‌ ‌ ‌ ولا أسأم التطواف او تسأم الابل

۷۔ حیاتی او تأتی علیّ منیّتی ‌ ‌ ‌ ‌ وکلّ امرءٍ فانٍ وان غرّہ الامل

۸۔ واوصی بہ قیساً و عمرا کلیھما ‌ ‌ ‌ ‌ واوصی یزیدا ثمّ من بعدھم جبل

ترجمہ

۱۔ میں زید کے لیے رویا پھر بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا حال کیا ہے۔ آیا وہ زندہ ہے کہ پھر اس سے ملنے کی توقع کی جائے، یا وہ مر گیا ہے۔

۲۔ بخدا اگرچہ میں سوال کرتا پھرتا ہوں لیکن پھر بھی نہیں جانتا کہ تجھ کو نرم زمین نے ہلاک کر دیا یا سخت زمین تجھ کو لے بیٹھی۔

۳۔ اے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تو کبھی واپس آئیگا یا نہیں۔ تیرا واپس آنا ہی میرے لیے دنیا میں بہت کافی ہے۔

۴۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اُس کی یاد دلاتا ہے، اور پھر جب ڈوبنے کے قریب ہوتا ہے تو اُس وقت بھی اُس کی یاد پیش آتی ہے۔

۵۔ ہوائیں چلتی ہیں تو وہ بھی اُس کی یاد کو بھڑکا دیتی ہیں۔ آہ! میرا غم کتنا طویل و دراز اور میرے خوف کا کیا عالم ہے۔

۶۔ میں پوری کوشش کے ساتھ دنیا بھر میں اونٹ پر بیٹھ کر چکر لگاؤنگا اور ان چکروں سے تھکونگا نہیں، یہاں تک کہ اونٹنی ہی تھک جائے۔

۷۔ زندگی بھر! یہاں تک کہ مجھ پر موت آجائے، اور ہر آدمی فنا پذیر ہے۔ اگرچہ اُس کو اُمید نے دھوکہ دے رکھا ہو۔

۸۔ میں قیس اور عمرو دونوں کو اس کے جستجو کی وصیت کرتا ہوں اور یزید کو اُن کے بعد جبلہ کو وصیت کرتا ہوں۔ (جبل سے مُراد حضرت زید کے بھائی جبلہ بن حارثہ ہیں اور یزید اُن کے علاتی بھائی تھے)

ایک سال کلب کے چند آدمی حج کرنے کے لیے مکہ معظمہ آئے۔ یہاں اُنہوں نے زیدؓ کو دیکھا تو پہچان لیا، اُنہوں نے ساتھ چلنے کو کہا ہوگا حضرت زید نے فرمایا "میری طرف سے

یہ پیغام میرے گھر والوں کو پہنچا دینا۔

۱۔ اَحِنُّ اِلیٰ قومی وَاِن کنتُ نائیًا ۔۔۔ فانی قعیدُ البیتِ عند المشاعر

۲۔ فَکُفُّوا من الوجد الذی قد شجاکُم ۔۔۔ ولا تعملوا فی الارض نَصَّ الاباعر

۳۔ فانی بحمد اللہ فی خیرِ اُسْرَۃٍ ۔۔۔ کرامِ مَعَدٍّ کابرًا بعد کابرِ

(ترجمہ)

۱۔ میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں اگرچہ بعید ہوں۔ میں خانہ کعبہ میں مشعرالحرام کے قریب رہتا ہوں۔

۲۔ پس تم اُس غم سے باز آجاؤ جس نے تم کو غمگین کر رکھا ہے۔ اور اونٹوں کو زمین میں مت ہنکاؤ۔

۳۔ کیونکہ میں بحمد اللہ بہت اچھے قبیلے میں ہوں جو پشتہا پشت سے معد کے شریف آدمیوں کا قبیلہ ہے۔

کلبیوں نے جا کر حضرت زید کے والد حارثہ کو اس واقعہ کی پوری اطلاع دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کے پاس یہ مقیم تھے، آپ کے اور آپ کے اہل خانہ کے حالات بھی سنائے۔ حارثہ کی چشم تمنا جو دیدۂ یعقوب کی طرح ایک "روزنِ دیوار" ہو کر رہ گئی تھی اس میں پھر امید و ارمان کا نور جھلکنے لگا۔ یہ اور اُن کے بھائی کعب دونوں فدیہ لے کر حضرت رسالتمآب کی خدمت بلند مرتبت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "اے عبدالمطلب کے فرزند ارجمند۔ اے ہاشم کے نور نظر، اے اپنی قوم کے سیدِ اعلیٰ ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے کے معاملہ میں گفتگو کرنے آئے ہیں، آپ اُس کو ہمارے حوالہ کر کے ہم پر احسان کیجیے، اور اُس کا فدیہ قبول فرمائیے"۔ آپ نے پوچھا "وہ کون ہے؟" بولے "زید بن حارثہ" ارشاد ہوا "کیا اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟" انہوں نے پوچھا "وہ کیا؟" فرمایا "زید کو بلالو

اُسے اختیار دے دیدو، اگر وہ تمہارے ساتھ جانا پسند کرے تو ساتھ چلا جائے۔ اگر مجھ کو ترجیح دے تو میں اُس شخص پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا جو مجھ کو ترجیح دیتا ہے"۔ یہ سب اس پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ زید بن حارثہ کو بلایا گیا۔ آپ نے پوچھا "تم انہیں پہچانتے ہو۔ بولے جی ہاں! یہ میرے باپ ہیں اور یہ میرے چچا ہیں" اس کے بعد آپ نے فرمایا "رہا میں، تو تم مجھ کو جانتے ہی ہو۔ اور میرا تمہارے ساتھ جیسا کچھ طرز رہا ہے اُس کو بھی جانتے ہو، اب تمہیں اختیار ہے، مجھ کو پسند کرو یا اِن دونوں کو اختیار کر لو"

حضرت زید سرورِ کونین کی غلامی کا شرف و مجد حاصل کر چکے تھے جس پر دنیا جہان کی نعمتیں اور آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں؛ بے تامل بولے "میں ان دونوں کو ترجیح نہیں دیتا میں وہ نہیں ہوں کہ کسی کو آپ پر ترجیح دے سکوں، آپ میرے لیے بمنزلہٗ والد بھی ہیں اور چچا بھی۔ حارثہ اور اُن کے بھائی کعب بولے "زید! افسوس! تم آزادی پر غلامی کو اور اپنے باپ اور چچا پر غیر کو ترجیح دیتے ہو؟ فرمایا "جی ہاں! مجھے اس ذاتِ گرامی میں کچھ ایسی ہی خوبیاں نظر آئی ہیں کہ میں کبھی کسی شخص کو اُن پر ترجیح نہیں دے سکتا"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کی غیر معمولی وفاداری و اطاعت کوشی کا یہ ولولہ انگیز مظاہرہ دیکھا تو فرطِ ترحم و شفقت سے حضرت زید کا ہاتھ پکڑ کر مقام حجر تک تشریف لائے، اور اعلان فرما دیا "اے وہ لوگو جو اس وقت موجود ہو۔ تم سب گواہ رہو کہ زید میرا فرزند ہے، وہ میرا وارث ہوگا، اور میں اُس کا وارث ہونگا۔ حضرت زید کے والد اور چچا نے یہ دیکھا تو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو گئے اور واپس چلے گئے[1]

[1] یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ طبقات ابن سعد میں بھی مذکور ہے، مگر ہم نے اُسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۴ و ۲۲۵ سے لیا ہے۔

اسلام | پھر جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرق مبارک پر ختم رسالت کا تاج گوہریں رکھا گیا۔ اور اسلام کا شروع شروع میں غلغلہ بلند ہوا تو حضرت زید بھی دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے بلکہ امام زہری کی روایت ہے ماعلمنا احدًا اسلم قبل زید بن حارثہ (ہم کو نہیں معلوم کہ حضرت زید سے پہلے کوئی اور اسلام لایا ہو) لیکن اس میں علماء نے کلام کیا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جس طرح عورتوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والی حضرت خدیجہ۔ مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق اور بچوں میں حضرت علی ہیں۔ اسی طرح غلاموں میں سے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے حضرت زید ہیں۔ حضرت حمزہ مسلمان ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے ان کی مواخات کرادی۔

نکاح | حضرت اُم ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آیا اور کنیز تھیں۔ آپ نے حضرت زید کا نکاح اِن سے کر دیا، جن کے بطن سے حضرت اُسامہ بن زید پیدا ہوئے۔

ہجرت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ حضرت زید بھیؓ مدینہ پہنچے۔ آنحضرتؐ نے ان کو حضرت اُسید بن حضیر انصاری کا جو قبیلۂ عبدالاشہل کے معزز رئیس تھے، بھائی بنادیا اور ان کے رہنے کے لیے ایک مکان مخصوص کردیا۔ یہیں آپ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کردیا۔ مگر طبائع کی عدم موافقت کے باعث دونوں میں نباہ نہ ہوسکا، مجبوراً حضرت زید نے آپ کو طلاق دیدی۔

یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ حضرت زید کا نکاح حضرت زینب کے ساتھ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے اور رائے سے ہوا تھا حضرت زینب اس رشتہ پر رضامند نہیں

تھیں لیکن آپ کو حضرتِ زید بہت عزیز تھے، اس لیے آپ نے چاہا کہ اُن کا نکاح آپ کی پھوپی زاد بہن (زینب) سے ہو جائے جو حسب و نسب میں مرتبۂ بلند رکھنے کے ساتھ حسن و جمال میں بھی ممتاز تھیں۔ حضرت زینب نے حضرت رسالتمآب کے رجحانِ طبع کا احترام کرتے ہوئے زید سے نکاح کرنا منظور تو کر لیا، لیکن یہ ظاہر ہے میاں بیوی کے تعلقات، اگر دونوں کے مزاج میں موافقت نہ ہو اس طرح کے ظاہری رکھ رکھاؤ سے نبھ نہیں سکتے۔ چنانچہ یہی ہوا، دونوں میں آئے دن نا اتفاقی رہنے لگی۔ حضرت زید بارگاہِ رسالت پناہ میں بیوی کی تیز زبانی اور عدم موافقت کا شکوہ کرتے تھے، اور چاہتے تھے کہ طلاق دے دیں۔ آپ نے اُن کو ایسا کرنے سے منع فرمایا، اور ارشاد ہوا :-

امسك عليك زوجك اتق الله تم اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور خدا سے ڈرو۔

حضورؐ پر نور کو خیال یہ ہوتا تھا کہ میں نے بہت کچھ کوشش کر کے تو زینب کو نکاح پر آمادہ کیا تھا۔ اب اُن کو طلاق مل گئی تو انہیں طبعی طور پر اس کا بڑا رنج و ملال ہوگا۔ اور چونکہ اس نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا دخل تھا۔ اس لیے حضرت زینب کی طلاق کا خیال کر کے آپ خود بھی یک گونہ انفعال و اثر محسوس کرتے تھے، جیسا کہ آپ کا جملۂ بالا ظاہر کرتا ہے۔

دونوں میں نا اتفاقی بڑھتی گئی یہاں تک کہ بحکم وان خفتم الا يقيما حدود الله الآية نوبت طلاق کی آ گئی۔ حضور پُر نور رحمۃ للعالمین تھے، آپ کو طبعاً اس کا ملال ہوا۔ اور خصوصاً حضرت زینب کی دل شکستگی و خانہ ویرانی کا خیال آپ کو اور بھی تکلیف پہنچاتا تھا۔ اب آپ نے چاہا کہ کسی طرح اس کی مکافات کر دیں، اور نکاح و طلاق سے جو زخم حضرت زینب کے

دل پر لگا تھا۔ اُس کی کوئی تدبیر چارہ گری کریں۔ مکافات کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا تدبیر ہوسکتی تھی کہ آپ نے خود اُن کو شرفِ زوجیت بخشنا چاہا۔ حضرت زینب کے نکاح میں بہت کچھ حکمتیں ہونگی۔ بادی النظر میں تین فائدے تو بالکل عیاں ہیں۔

(۱) اسلام میں غلام رہنے سے کسی کی ذات پر بٹہ نہیں لگ جاتا۔ حضرت زید غلام تھے مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی پھوپی زاد بہن سے کردیا۔

(۲) پھر پھوپی زاد بہن جو ایک غلام کی مطلقہ بیوی تھیں، آپ نے اُن سے نکاح کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی، بلکہ پوری بشاشت طبع کے ساتھ نکاح کیا۔

(۳) تیسرا اہم فائدہ جو اس سے حاصل ہوا وہ یہ بتانا تھا کہ "لے پالک" کا حکم اپنے بیٹے کا سا نہیں ہے، اُس کی بیوی اگر مطلقہ ہوجائے تو اُس سے نکاح ہوسکتا ہے۔

پھر اس واقعے سے جہاں یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں سرکارِ دوجہاںؐ کی مروت، رحمت و رافت، اور وضع و پاسداری بھی نمایاں ہوتی ہے کہ محض حضرتِ زینب کی دل شکستگی کو دور کرنے کے لیے آپ نے اُن سے نکاح کیا۔

چنانچہ انقضاءِ عدت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کی معرفت خود اپنے نکاح کا پیام حضرت زینب کے پاس بھیجا، وہ خود عاقلہ و فہیمہ تھیں جانتی تھیں کہ میرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے کہ قرآن کی کوئی آیت اُس کے متعلق نازل نہ ہو۔ بولیں "دیکھیے خدا کی طرف سے کیا حکم آتا ہے" اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا — جب زید نے حاجت پوری کرلی تو ہم نے اُن کا نکاح آپ سے کردیا

اسی واقعہ کے سلسلہ میں منافقوں نے جو ناگوار شہرت پیدا کر دی تھی۔ قرآن حکیم نے اس کے رد میں فرمایا :۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۔
محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا :۔

ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ [1]
لوگوں کو اُن کے باپوں کی نسبت سے پکارو اللہ کے نزدیک یہ زیادہ قرین انصاف ہے۔

---

[1] اس واقعہ کے سلسلہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :۔

اذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسك عليك زوجك واتق الله وتخفی فی نفسك ما الله مبديه وتخشى الناس والله احق ان تخشٰه
جبکہ آپ نے اُس سے جس پر اللہ نے اور آپ نے انعام کیا تھا (یعنی زید پر) کہا کہ اپنی بیوی کو روکے رہو اور اللہ سے ڈرو، اور تم آپ اپنے نفس میں وہ چیز چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اُسے ڈرا جائے۔

متعصب عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو عجیب و غریب رنگ دے کر لکھا ہے۔ اور کسی اور کا کیا ذکر خود بعض علما تفسیر نے اپنی کتابوں میں ایسی بے سروپا روایتیں بھر دی ہیں جن کے باعث معترضین کو اسلام پر حرف گیری کا موقع ملتا ہے خاص حضرت زینب کے نکاح سے متعلق عام تفسیروں میں جو روایتیں پائی جاتی ہیں، حافظ ابن حجر اُن کی نسبت بالکل صفائی سے فرماتے ہیں :۔

ووردت آثار اخری اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیر من المفسرین لا ینبغی التشاغل بها
اس کے علاوہ وہ دوسرے آثار جن کو ابن ابی حاتم وطبری نے بیان کیا ہے اور جن کو بہتیرے مفسرین نے نقل کیا ہے۔ اُن کے ساتھ مشغول ہونا مناسب نہیں ہے۔

(بقیہ بر صفحہ ۳۲)

کارنامے | حضرت زید تیر اندازی میں یگانہ روزگار تھے۔ معرکہ بدر سے غزوۂ موتہ تک تمام اہم اور زبردست معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت عائشہؓ تو یہاں تک فرماتی ہیں کہ حضرت زید جس کسی سریہ (فوج کشی) میں شریک ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کو سردار بناتے تھے۔ اور اگر حضرت زید آپ کی وفات کے بعد بھی زندہ ہوتے تو حضور پُر نور ان کو ہی اپنا خلیفہ مقرر کرتے۔ چنانچہ سریہ قردہ، سریہ جموم، سریہ عیص، سریۂ طرف و حسمی ان سب مہمات میں اسلامی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) نہایت افسوس کی بات ہے، ارباب تفسیر روایتوں کی نقل میں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ آیتوں کو ایسے ایسے معانی پہنائے جاتے ہیں جو ہر ایک روایت پر منطبق ہو جائیں ورنہ یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی آیات بالا میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت میں کسی قسم کی گستاخی کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو بھی پیدا ہو سکے۔

تخفی فی نفسك ما اللّٰه مبدیه — آپ اپنے نفس میں وہ چھپاتے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا

اس اخفا سے مُراد صرف یہ ہے کہ حضور سرور کائنات حضرت زینب کی دل شکستگی کو رفع کرنے کے لیے جو خود اُن سے نکاح کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ آپ اس کو لوگوں پر اس اندیشہ سے ظاہر نہیں کرتے تھے کہ قرآن مجید میں اب تک متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے کے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا ہے۔ منافقین اب اس خبر کو سُنینگے تو عہد جاہلیت کے خیال کی بنا پر طعن شروع کر دینگے۔ کوتاہ نظر غیر مسلم مصنفین نے اس واقعہ کو ایک افسانہ کا رنگ دے رکھا ہے۔ حالانکہ اگر وہ ذرا تعصب اور بے جا ضد سے ہٹ کر دیکھیں تو اُنہیں یہ واضح ہو جائے کہ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تردد اور پھر آیت کے نزول کے بعد اُس کا صاف و صریح اعلان کر دینا خود سرورِ عالم کے نبی برحق اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔ غور کیجیے ایک طرف تو آپ حضرت زید سے یہ فرماتے ہیں کہ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اللہ سے ڈرو۔ اور دوسری طرف آپ کا عمل یہ ہے کہ حضرت زید بغایت مجبوری طلاق دے دیتے ہیں تو آپ خود نکاح کا پیام اُن کے پاس بھیجتے ہیں۔ ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھیے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب سے نکاح کسی تعلق خاطر کی بنا پر تھا یا محض اس لیے کہ آپ اُن کی تشفی و تسلی کرنی چاہتے تھے، اور یہ بتانا منظور تھا کہ متبنیٰ کا حکم بالکل فرزند کا سا نہیں ہے۔

ل اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۶۔

لشکر کی قیادت حضرتِ زید ہی کے سپرد تھی جس کو آپ نے بخوبی سرانجام دیا۔ اور کامیاب بامراد ہو کر واپس آئے۔

فضائل | حضرت زید کی فضیلت و بزرگی کے لیے یہی بات کیا کچھ کم ہے کہ تمام صحابہ کرام میں صرف حضرت زید کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے بہت زیادہ محبت تھی آپ خانوادۂ نبوت میں بالکل ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص زید کی شان میں گستاخی کا کوئی کلمہ کہہ دیتا تو آپ کو اس کا بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے "ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سی فوج کسی مہم پر روانہ کی اور حضرت اسامہ بن زید کو اس کا سردار بنا دیا۔ اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا، تو آنحضرت نے فرمایا "اگر تم اسامہ کی امارت پر اعتراض کرتے ہو (تو کوئی مضائقہ نہیں) اس سے پہلے اس کے باپ زید بن حارثہ کی سرداری پر بھی تم لوگ اسی قسم کا اعتراض کر چکے ہو قسم خدا کی وہ یقیناً امارت کا سزاوار تھا، اور لوگوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا اور اس کے بعد یہ (اسامہ) سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہے"[1]۔

حضرت زید روئی کی طرح سپید تھے، اور حضرت اسامہ کا رنگ سیاہ تھا۔ بعض مفسدہ پرداز اس اختلاف رنگ کی بنا پر حضرت اسامہ کے نسب میں طعن کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے تھے تو ملول ہوتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو مسکراتے ہوئے اور اس قدر خوش کہ آپ کا چہرۂ اقدس جگمگا اٹھا تھا۔ اور آتے ہی فرمایا۔ "عائشہ! تمہیں خبر نہیں، ابھی

[1] بخاری باب مناقب زید بن حارثہ

ایک قیافہ شناس آیا تھا جس کا نام مجزز تھا۔ اس وقت زید بن حارثہ اور اسامہ دونوں ایک چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے اور ان کے پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ اس شخص نے دونوں کے پاؤں دیکھتے ہی کہا کہ یہ پاؤں بالکل ایک دوسرے کی مانند ہیں (یعنی ان دونوں میں باپ بیٹے کا رشتہ ہے)[۱]

اس واقعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت زید و اسامہ کے ساتھ غایت محبت کا ثبوت ملتا ہے کہ اگرچہ قیافہ شناس کی بات اسلام میں حجت نہیں ہے تاہم سرور عالم ﷺ نے اس کی زبان سے ایک ایسی بات سنی جس سے حق کی تصدیق و توثیق ہوتی تھی تو آپ ﷺ اس سے خوش ہوئے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں "ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ حضرت زید کہیں باہر سے مدینہ میں آئے۔ اور میرے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ سرور کائنات یہ سنتے ہی بیتابانہ اٹھے، یہاں تک کہ آپ نے لباس کا بھی اہتمام نہیں کیا، آپ کی چادر مبارک زمین پر گھسٹ رہی تھی اور جاتے ہی حضرت زید سے معانقہ کیا، اور ان کو بوسہ دیا۔[۲]

حضرت زید کے ساتھ اس درجہ تعلق خاطر رکھنے کی وجہ سے آپ حضرت زید کی اولاد کے ساتھ بھی بیحد شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر نے مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کے کسی گوشہ میں اپنے کپڑے گھسیٹ رہا ہے۔ عبداللہ بن

[۱] بخاری کتاب الفرائض باب القائف [۲] رواہ الترمذی مشکوٰۃ المصابیح باب المصافحہ والمعانقہ

دینار پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن سے آپ نے فرمایا "دیکھو یہ کون ہے؟ اے کاش یہ میرے پاس آئے" ایک شخص بولا "کیا آپ اسے نہیں جانتے؟ یہ تو محمد اُسامہ کا فرزند ہے" حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ سنتے ہی سر جھکا لیا، اور ہاتھوں سے زمین کریدنے لگے۔ پھر فرمایا "اگر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرماتے تو ضرور پسند کرتے"۔[1]

حضرت اُسامہ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو اور حضرت حسنؓ کو پکڑتے اور دونوں کے لیے دعا فرماتے۔

اَللّٰھُمَّ اَحِبَّھُمَا فَاِنِّیْ اُحِبُّھُمَا[2] اے اللہ تو ان دونوں سے محبت کر، کیونکہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں

حضرت اُسامہ تو پھر بھی بیٹے تھے۔ حرملہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ حجاج بن ایمن جن کے باپ یعنی ایمن حضرت اسامہ بن زید کے علاتی بھائی تھے۔ اور جو ابھی کمسن ہی تھے، مسجد میں آئے، اور بچوں کی طرح ادھ کچری نماز پڑھنی شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا "نماز لوٹاؤ" پھر جب وہ واپس چلے گئے تو آپ نے پوچھا "یہ کون تھے؟" حرملہ نے کہا "یہ حجاج بن ایمن بن اُم ایمن ہیں" حضرت ابن عمرؓ بولے "اگر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو ضرور ان سے محبت کرتے"[3]

حضرت ابن عمر فرماتے تھے "بخدا حضرتِ زید افسری کے لائق تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے محبوب تھے۔ پھر یہی ابن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت اُسامہ کا

[1] بخاری باب مناقب زید بن حارثہ [2] ایضاً [3] ایضاً۔

وظیفہ میرے وظیفہ سے زیادہ مقرر کیا تھا میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا "اے بیٹے اُسامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ، اور اسی طرح اُس کے باپ (زید) تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھے"[1]

غزوۂ موتہ اور شہادت جمادی الاولیٰ ۸ھ میں موتہ کا جو شام کا ایک مقام ہے، غزوہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کے نام ایک خط تحریر فرمایا، اور حضرت حارث بن عمر کو نامہ بری کے لیے مقرر کیا۔ یہ خط لیجا رہے تھے کہ علاقۂ بلقار کا ایک رئیس حکمراں جس کا نام شرجیل بن عمرو اور عیسائی مذہب کا پیرو تھا، اُس نے حارث کو قتل کر دیا۔ قاصد کو قتل کرنے کا رواج کہیں بھی نہیں تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدعہدی پر بڑا غصہ آیا، اور آپ نے تین ہزار مجاہدین اسلام کی ایک فوج حضرت حارث کا انتقام لینے کے لیے روانہ کی۔ اس لشکر میں حضرت جعفر طیار حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی، اور عبداللہ بن رواحہ جو ایک معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے، شریک تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے لشکر کی قیادت کا شرف حضرت زید بن حارثہ کو ہی بخشا۔ لوگوں نے اور خود عبداللہ بن رواحہ نے شکایت کی۔ مگر آپ نے فرمایا "تم جاؤ تمھیں معلوم نہیں کہ خیر کس میں ہے"[2] اور ارشاد ہوا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب، اور اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ لشکر کے امیر ہوں۔ حضرت زید نے حسب دستور اس غزوہ میں بھی خوب دادِ شجاعت دی لیکن آخر امر برچھیاں

---

[1] اصابہ ج ۳ ص ۲۶۔ [2] ابن جریر طبری ج ۳ ص ۱۰۹

لڑکر شہید ہوگئے۔ آپ کے بعد علم حضرت جعفرؓ کے دست مبارک میں آیا۔ اُنہوں نے بھی جوانمردی وبہادری کے حیرت انگیز جوہر دکھائے۔ انجام کار وہ بھی شہادت کبریٰ کا جام نوش کر کے خاموش ہوگئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بزرگوں کی شہادت کا حال سُنا تو بڑا رنج ہوا اور فرمایا۔

اخوائی وموئسائی ومحدثائی[1] یہ دونوں میرے بھائی، میرے مونس اور مجھ سے بات چیت کرنیوالے تھے۔

عمر اور حلیہ | شہادت کے وقت حضرت زید کی عمر پچپن برس کی تھی[2]۔ ان کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا اور پست قامت تھے[3]۔

ازواج | شادیاں مختلف اوقات میں متعدد کی تھیں بیویوں کے نام یہ ہیں:۔

اُم ایمن، اُم کلثوم بنتِ عقبہ۔ درۃ بنت لہب، ہند بنت العوام، زینب بنتِ جحش۔

اولاد | دو لڑکے اُسامہ بن زید، اور زید بن زید تھے، اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام رُقیہ تھا، حضرت اسامہ کے علاوہ دونوں بچے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے[4]۔

عمار بن یاسر

نام ونسب | عمار نام ابو الیقظان کنیت والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیّہ تھا سلسلۂ نسب یہ ہے "عمار بن یاسر بن عامر بن مالک بن کنانہ بن قیس بن الحصین بن الوذیم بن ثعلبہ بن عوف بن حارثہ

---

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۲۲۷ [2] اصابہ ج ۳ ص ۲۶ [3] اسد الغابہ ذکر زید بن حارثہ
[4] طبقات ابن سعد قسم اول ج ۳ ص ۳۰۔

ابن عامر الاکبر بن یام بن عنس بن مالک بن اود بن زید بن یشجب المذحجی ثم العنسی[1]۔

ان کے والد یاسر قحطانی النسل تھے۔ یمن ان کا اصل وطن تھا۔ اپنے دو بھائی حارث اور مالک کے ساتھ ایک گم شدہ بھائی کی جستجو میں مکہ پہنچے، وہ دونوں واپس لوٹ گئے حضرت یاسر یہیں مقیم ہو گئے۔ اور بنو مخزوم کے حلیف ہو کر اس قبیلہ کے ایک شخص ابوحذیفہ بن المغیرہ کی جاریہ سمیہ سے شادی کر لی۔ انہیں کے بطن سے حضرت عمار پیدا ہوئے۔ ماں کی وجہ سے یہ بھی غلام سمجھے جاتے تھے۔ ابوحذیفہ نے ان کو بچپن ہی میں آزاد کر دیا تھا[2]۔ اس بنا پر یہ بنو مخزوم کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے۔

اسلام حضرت عمار بن یاسر اسلام قبول کرنے کی سعادت و شرف کے اعتبار سے السابقون الاولون میں سے ہیں۔ یہ اور حضرت صہیب دونوں ساتھ ایمان لائے تھے وہ خود فرماتے ہیں "کہ میں نے صہیب کو ارقم بن ابی ارقم کے دروازۂ مکان پر دیکھا تو پوچھا۔ "آپ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں؟ بولے "پہلے تم اپنا مقصد ظاہر کرو" میں نے کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل کر ان کی کچھ باتیں سننی چاہتا ہوں" کہنے لگے "میرا مقصد بھی یہی ہے" اس کے بعد دونوں ساتھ چلے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ عمار جس وقت اسلام لائے تھے اُس وقت تک حضرت ابوبکر صدیق کے علاوہ صرف پانچ غلاموں اور دو عورتوں نے اسلام قبول کیا تھا[3]۔ حضرتِ مجاہد کی روایت ہے کہ اس وقت تک صرف

---

[1] اُسد الغابہ ج ۴ ص ۴۳۔ [2] اُسد الغابہ ج ۴ ص ۴۳۔۴۴ [3] اُسد الغابہ

سات اصحاب نے ہی اسلام قبول کیا تھا، مگر صحیح یہ ہے کہ کچھ اوپر تیس لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے[1]۔

تکالیف و مصائب

اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ خود دنیوی وجاہت و ثروت نہیں رکھتے تھے، اور اس وقت تک اُن کی والدہ سمیہ بھی بنو مخزوم کی غلامی سے آزاد نہیں ہوئی تھیں۔ اور اسلام کا جلوۂ جہاں فروز کچھ اس طرح اس خاندان کو منور کر چکا تھا کہ حضرت عمار کے علاوہ اُن کی والدہ اور والد بھی مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اس بنا پر کفار اُن پر سخت سے سخت مظالم کرتے تھے۔ جلتے ہوئے ریت پر لٹا دیتے اور بُری طرح زدوکوب کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان تینوں کو ستایا جا رہا تھا کہ حضرت سرورِ عالم کا اُدھر سے گذر ہوا۔ اپنے شیدائیوں کو اس حالت میں دیکھ کر آپ کا دل بھر آیا اور فرمایا "اے آلِ یاسر تم صبر کرو۔ تمہارا ٹھکانہ جنت ہے[2]۔

حضرت سمیہ کی شہادت

آپ کی والدہ سمیہ کے ساتھ بدبخت ابوجہل نے انتہا درجہ کا وحشیانہ معاملہ کیا جس کی وہ تاب نہ لا سکیں اور جاں بحق ہو گئیں۔ ان کو اسلام کی راہ میں اس طرح شہید ہو جانے میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ابوجہل غزوۂ بدر میں مارا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار سے فرمایا "اللہ نے تمہاری ماں کے قاتل کو قتل کر دیا"۔ ابنِ قتیبہ کو دھوکا ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ حضرت یاسر کے بعد سمیہ کا نکاح ایک شخص ازرق نامی سے ہو گیا تھا۔ یہ سمیہ حضرت عمار کی نہیں بلکہ زیاد کی والدہ ہے[3]۔

---

[1] اُسد الغابہ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۳ [3] اصابہ ج ۸ ص ۱۱۴۔

ایک مرتبہ مشرکین نے حضرتِ عمارؓ کو پانی میں اس قدر غوطے دیے کہ وہ بالکل بدحواس ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان ظالموں نے ان کی زبان سے ایک ناشائستہ کلمہ بھی کہلوا لیا، اس وقت تو انہیں مصیبت سے نجات مل گئی، مگر بعد میں ہوش آیا تو غایت ندامت و خجالت کے ساتھ بارگاہِ رسالت پناہ میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے" انہوں نے پورا واقعہ اول سے آخر تک کہہ سنایا، آپ نے فرمایا "تم اپنا دل کیسا پاتے ہو" کہا "میرا دل ایمان پر مطمئن ہے"۔ سرکارِ دوجہاںؐ نے غایت شفقت کے ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے، اور فرمایا "کوئی مضائقہ نہیں" اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ	جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اُس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (اُس سے بازپرس نہ ہوگی)

سعید بن جبیر کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا "کیا مشرکین مسلمانوں کو اس قدر اذیتیں پہنچاتے تھے کہ اگر وہ اُن کی تاب نہ لا کر دین چھوڑ دیتے تو انہیں معذور سمجھا جاتا" فرمایا "ہاں! بخدا یہ لوگ ان غریبوں کو مارتے تھے ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ درد و کرب کے مارے اُٹھنے بیٹھنے سے بھی عاجز ہو جاتے تھے۔ اور بعض تو مجبور ہو کر مشرکین کے منشا کے مطابق نادرست باتوں کا

---

[1] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت عمار و اُسد الغابہ۔

اظہار اپنی زبان سے کر بیٹھے تھے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباس نے جو کچھ فرمایا بعینہٖ حضرت عمار پر صادق آتا ہے۔ انہوں نے اسلام کی راہ میں طرح طرح کی سخت اور ناقابل برداشت مصائب اٹھائیں لیکن زبان سے لغزش ہو جانے کے باوجود ان کا دل برابر صبر و استقامت کے ساتھ ایمان پر مطمئن رہا یہاں تک کہ ان کی تسلی اور معاملہ کی صفائی کے لیے قرآن مجید کی ایک آیت نازل ہوئی۔

ہجرت | بعضوں کا خیال ہے کہ حضرت عمار ان لوگوں میں سے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ مگر بعض اس سے مختلف ہیں۔ مدینہ کی ہجرت کا حکم ہوا تو حضرتِ عمار بھی روانہ ہوئے اور اس سرزمین قدس میں پہنچ کر حضرت بشر بن عبدالمنذر کے مہمان ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ان کی مواخات حضرت حذیفہ بن الیمان انصاری سے کرا دی، اور مستقل سکونت کے لیے ایک قطعۂ زمین مرحمت فرمایا۔[2]

تعمیر مسجد قبا | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو حضرت عمار نے خیال کیا کہ سید عالم کے لیے ایک مکان سے چارہ نہیں ہے کہ جب آپ اپنے قیلولہ سے فارغ ہو کر اٹھیں تو اس کے سایہ میں تشریف فرما ہوں، اور وہاں نماز پڑھیں، چنانچہ آپ نے پتھر جمع کیے، اور مسجد قبا کی تعمیر کی یہ مدینہ کی سب سے پہلی مسجد تھی جو حضرت عمار کے ہاتھ سے انجام کو پہنچی۔[3]

تعمیر مسجد نبوی | ہجرت کے چھ سات ماہ بعد مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی گئی تو حضرت عمار نے اس میں

---

[1] اسد الغابہ جلد ۴ ص ۴۴ و ۴۵ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۷۹۔ [3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۵

بھی حصہ لیا. آپ اینٹ گارا لا لا کر دیتے تھے اور زبان پر یہ رجز جاری تھا۔

نحن المسلمون نبتنی المساجد ہم مسلمان ہیں، ہم مسجد بناتے ہیں۔

سب لوگ ایک ایک اینٹ اُٹھاتے تھے، اور حضرت عمارؓ دو دو اینٹ لاتے تھے۔ ایک دفعہ اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذرے تو آپ نے اُن سے ازراہِ شفقت فرمایا "اے عمار، سنو تم کو باغی فرقہ قتل کریگا، اور تم اہل جنت میں سے ہو"[1]

ایک مرتبہ کسی نے اُن پر اتنا بوجھ لاد دیا کہ لوگوں کو خیال ہوا آج عمارؓ نہ بچینگے۔ وہ اس سے پہلے بھی تکلیف شاقہ کی شکایت کر چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر کچھ اینٹیں اُتار کر پھینک دیں اور ارشاد ہوا۔ افسوس! ابن سمیہ تمہیں گروہ باغی قتل کریگا۔

غزوات کی شرکت | حضرت عمارؓ شروع سے بڑے پُر جوش اور بہادر مسلمان تھے۔ غزوۂ بدر سے غزوۂ تبوک تک جتنے معرکے پیش آئے، پوری بہادری اور دلیری کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جو جنگیں ہوئیں اُن میں سے اکثر میں شریک رہے۔ یمامہ کی جنگ میں اُن کا ایک کان شہید ہو گیا جو پاس ہی زمین پر پھڑک رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس زور سے پے بہ پے حملے کرتے رہے کہ جس کسی طرف کا رُخ کیا صفیں کی صفیں اُلٹ گئیں۔ ایک دفعہ کچھ لوگ دل شکستہ ہو کر اقدام سے جی چرانے لگے۔ اُنھوں نے ایک چٹان پر کھڑے ہو کر زور سے کہا "اے مسلمانوں کے گروہ! کیا تم جنت سے بھاگتے ہو، میں عمار بن یاسر ہوں کیا تم جنت سے گریز کرتے ہو۔ دیکھو!

---

[1] مستدرک ج ۳ ص ۳۸۷۔

میں عمار بن یاسر ہوں۔ آؤ میری طرف۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں "عمار یہ کہتے جاتے تھے۔ اور میں اُن کے کان کو دیکھ رہا تھا کہ لٹکا ہوا تھا" اور وہ بڑے زور سے حملے کرتے تھے[1]۔

کوفہ کی گورنری | حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اُن کو حضرت عبداللہ ابن مسعود کے ہمراہ کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس موقعہ پر آپ نے جو فرمان اہلِ کوفہ کے نام ارسال کیا تھا، ہم اس کو ذیل میں بعینہٖ نقل کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ اجلۂ صحابہ صاحبِ علم و فضل آزاد کردہ غلاموں کی کتنی توقیر کرتے تھے، تحریر فرماتے ہیں۔

اما بعد فانی بعثتُ الیکم عمار بن	اما بعد میں عمار بن یاسر کو امیر اور عبداللہ بن مسعود
یاسر امیرًا و عبداللہ بن مسعود معلمًا	کو وزیر و معلم بنا کر تمہارے پاس بھیجتا ہوں ابن مسعود
و وزیرًا و قد جعلت ابن مسعود علی	تمہارے بیت المال کے منتظم ہونگے۔ یہ دونوں محمد
بیتِ مالکم و انهما لمن النجباءِ من	صلی اللہ علیہ وسلم کے شریف ساتھیوں میں سے
اصحابِ محمدٍ من اهلِ بدرٍ فاسمعوا	ہیں اور غزوۂ بدر میں شرکت کی سعادت رکھنے والے
لهما و اطیعوا و اقتدوا بهما و قد اٰثرتکم	ہیں، تم سب ان کا کہا مانو، اطاعت کرو اور ان
بابن ام عبد علی نفسی و بعثت عثمان	دونوں کی پیروی کرو۔ میں نے ام عبد کے بیٹے (عبداللہ
ابن حنیف علی السواد و رزقهم کل	بن مسعود) کو تمہارے پاس بھیج کر تم کو خود اپنے نفس
یوم شاۃ فاجعل شطرها و بطنها	پر ترجیح دی ہے، اور عثمان بن حنیف کو ارضِ سواد
لعمارٍ و الشطرَ الباقی بین هؤلاء	کی پیمائش کے لیے بھیجتا ہوں۔ انکی خوراک کیلیے ایک بکری

[1] مستدرک ج ۳ ص ۳۸۷۔

الثلاثۃ[1] یومیہ مقرر کی جاتی ہے جس کا ایک حصہ اور پیٹ عمار کو ملیگا اور بقیہ حصے ان تینوں کے درمیان تقسیم کردیے جائینگے۔

حضرت عمار نے ایک سال نو ماہ تک فرائض امارت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے لیکن کوفہ کے لوگ انتہا درجہ کے تند مزاج اور متلون واقع ہوئے تھے کسی ایک امیر کی اطاعت پر قائم رہتے ہی نہ تھے۔ عمار سے قبل یہاں کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ ان کی اہلیت وقابلیت میں کیا کلام ہو سکتا ہے مگر کوفہ والوں نے حسب عادت ان کی اتنی شکایتیں دربار خلافت تک پہنچائیں کہ آخر کار انہیں معزول کرنا پڑا حضرت سعد کے بعد جب عمار گورنر ہو کر آئے، تو ان کے ساتھ بھی ان لوگوں نے یہی معاملہ کیا، اور حضرت عمر فاروق کے پاس بار بار لکھ کر بھیجا کہ "عمار کمزور ہیں، انہیں سیاست نہیں آتی" خلیفۂ دوم کو اہل کوفہ کی اس تلون مزاجی پر بڑا افسوس ہوا، اور آپ نے فرمایا:۔

من عذیری من اھل الکوفۃ ان استعملت علیھم القوی فجّروہ وان ولّیتُ علیھم الضعیف حقّروہ[2]	اہل کوفہ کی طرف سے مجھ کو معذور رکھنے والا کون ہے اگر میں ان پر قوی کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اس سے انحراف کرتے ہیں، اور اگر ضعیف کو ان پر حاکم مقرر کرتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر کرتے ہیں۔

بہر حال حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کر کے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ کا گورنر مقرر

---

[1] یہ فرمان اختصار کے ساتھ "اسد الغابہ" میں بھی ہے، مگر اس تفصیل کے ساتھ طبقات ابن سعد جزء ۳ ص ۱۸۲ میں مذکور ہے۔ [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷۸۔

کر دیا۔

معزولی کے بعد حضرت عمرؓ نے اُن سے پوچھا "تم معزولی کے حکم سے ناراض تو نہیں ہوئے؟ بولے "میں نہ اس امارت سے خوش تھا اور نہ اب عزل سے خوش ہوں"[1]

خلیفہ ثالث کے عہد میں حضرتِ عمار خوش نہیں رہے۔ ایک تحقیقات کے سلسلہ میں مصر بھیجے گئے تھے، ایک عرصہ کے بعد وہاں سے واپس آئے، تو اُن پر اہل مصر کے خیالات کا گہرا اثر تھا۔

خلیفہ چہارم کے عہد میں حضرتِ عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو اُنہوں نے حضرتِ عمارؓ کو تمام اہم امور میں اپنا مشیر کار مقرر کر لیا۔ حضرت عائشہؓ حضرتِ زبیرؓ اور حضرتِ طلحہؓ وغیرہ نے حضرتِ عثمانؓ کے قصاص کے سلسلہ میں جنگی تیاریوں کے لیے بصرہ کا رُخ کیا تو حضرتِ علیؓ کے حکم سے آپ حضرت امام حسن کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے کہ اہل کوفہ کو خلافت کے تحفظ و حمایت پر آمادہ کریں۔

جنگ جمل ماہ جمادی الاُخریٰ ۳۶ھ میں جمل کی ناگوار جنگ پیش آئی تو حضرت عمار حضرت علی کے ساتھی تھے۔ اور فوج کے میسرہ کی قیادت کرتے تھے۔ اس جنگ میں بھی حسب معمول حضرت عمار نے غیر معمولی جرأت و دلیری اور شجاعت و مردانگی کا ثبوت دیا۔

جنگِ صفین اس کے بعد امیر معاویہ سے صفین کا معرکہ پیش آیا۔ اس وقت حضرت عمار کی عمر اکیانوے برس کی تھی، مگر حوصلہ اور ہمت جوانوں سے بڑھ کر تھی۔ نہایت جوش و خروش سے

[1] اُسد الغابہ تذکرۂ حضرت عمار۔

حضرت علیؓ کی جانب سے لڑرہے تھے۔ اثنائے جنگ میں ان کی نظر حضرت عمرو بن العاص پر پڑگئی جو حضرت امیر معاویہ کے بڑے سرگرم علمبردار تھے۔ حضرت عمار نے ان کو دیکھ کر فرمایا:۔

"میں اس علمبردار سے تین دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں لڑچکا ہوں۔ اب یہ چوتھی مرتبہ ہے۔ بخدا اگر وہ ہم کو شکست دیتے ہوئے مقام ہجر تک بھی پسپا کرتے چلے آئیں میں تب بھی یہی سمجھونگا کہ ہم لوگ حق پر ہیں اور وہ غلطی پر[1]

شہادت | اسی جنگ میں ایک دن حضرت عمار نے ایک گھونٹ مانگا، تھوڑا سا دودھ حاضر کیا گیا۔ آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا آخری گھونٹ جو تم پیو گے وہ دودھ کا ہوگا۔ یہ کہہ کر میدانِ جنگ میں جا گھسے اور اس بے جگری سے لڑے کہ آخر کار قتل کر دیے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۹۴ سال کی اور بعض کے نزدیک ترانوے ۹۳ برس کی تھی۔

فضائل | حضرت عمار کی کتابِ فضائل کا سب سے زیادہ روشن باب یہ ہے کہ وہ حق کی تائید میں کسی شخص کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ جنگ جمل کا معاملہ نہایت سخت تھا۔ ایک طرف ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ تھیں، اور دوسری طرف حیدر کرار حضرت علی مرتضیٰ تھے۔ دونوں نہایت درجہ محترم و مکرم اور خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھنے والے۔ حضرت عمار غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس جنگ میں حضرت علی کی حمایت کرنی چاہیے۔ چنانچہ آپ مردانہ وار مقابلہ کے لیے بڑھے، اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ معرکہ آرائی کی۔

---

[1] طبقات ابن سعد جزو ۳ ص ۱۰۵۔

اِس موقع پر حضرت ابوموسیٰ اشعری ایسے بزرگان مرنج و مرنجاں نے لوگوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین کی۔ مگر حضرت عمارؓ نے ایک پرجوش تقریر میں فرمایا "لوگو! میں جانتا ہوں عائشہ دنیا اور آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں لیکن اس وقت خدا تم سب کا امتحان لے رہا ہے کہ تم اُس کی فرمانبری کرتے ہو یا حضرت عائشہؓ کی؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی وصف خاص کی بنا پر حضرت عمارؓ سے محبت کرتے اور اُن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں "ایک دفعہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضرت عمارؓ آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مرحبا بالطیب المطیب — خوش آمدید! پاکیزہ و مصفا بزرگ

ایک دفعہ حضرت خالد اور حضرت عمار دونوں میں کسی بات پر نزاع ہو گیا جس میں اوّل الذکر نے اپنے حریف کی شان میں کوئی نامناسب کلمہ کہدیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو حضرت خالد پر ناراض ہوئے اور فرمایا:۔

یا خالد لا تسب عمارا فانہ من یسبّ	اے خالد عمار کو برا نہ کہو جو اُس کو برا کہتا ہے اللہ اُس کو
عمارا یسبہ اللہ ومن یبغض عمارا	سب کرتا ہے جو عمار کو مبغوض رکھتا ہو وہ اللہ کے نزدیک
یبغضہ اللہ ومن یسفہ عمارا یسفہہ اللہ	مبغوض ہوتا ہے اور جو عمار کی تحمیق کرتا ہے اللہ اُسکی تحمیق کرتا ہے۔

حضرت خالد فرماتے ہیں "یہ دن میرے لیے بڑا ہی سخت تھا، اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ

ل الاخبار الطوال دینوری ص ۱۴۷۔

علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لیے استغفار کیجیے۔ اور خود بھی حضرت عمار سے عفو کے طلبگار ہوئے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "اگر عمار کو دو باتوں کے درمیان اختیار دیا جائے تو وہ اسی بات کو اختیار کرینگے جو بہتر ہوگی"۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا "لوگو! میرے بعد ابوبکرو عمر کی اقتداء کرو اور عمار کی روش سیکھو۔ چنانچہ لوگ عام طور پر یہی سمجھتے تھے کہ حضرت عمار جدھر ہونگے حق اسی طرف ہوگا۔ خزیمہ بن ثابت جنگ جمل و صفین میں موجود تھے لیکن انہوں نے اپنی تلوار میان سے نہیں نکالی۔ لوگوں نے پوچھا تو کہا "میں اپنی تلوار اس وقت تک نہیں کھینچونگا جب تک کہ میں یہ نہ دیکھ لوں کہ عمار کو کون قتل کرتا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے حضرت عمار سے فرمایا "تم کو باغیوں کا گروہ قتل کریگا" پھر جب صفین میں عمار قتل کردیے گئے تو خزیمہ نے کہا کہ "قاتل عمار کے لیے گمراہی یقینی ہے"۔

عمرو بن العاص صفین میں حضرت معاویہ کی فوج کے علمبردار تھے لیکن وہ بھی حضرت عمار کی جلالت شان کے اس درجہ معترف تھے کہ عمار کے شہید ہوجانے کے بعد ان کے دو قاتل لڑتے جھگڑتے حضرت عمرو بن العاص کے پاس آئے اور ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ میں نے عمار کو قتل کیا ہے۔ تو حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا "قسم اللہ کی یہ دونوں دوزخ کے لیے جھگڑ رہے ہیں قسم اللہ کی میں پسند کرتا ہوں کہ اب سے بیس برس پہلے مرگیا ہوتا[2]۔

ذہبیت | ایک زبردست مجاہد و سرفروش ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمار بیحد نمازی اور

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۹۱ و ۳۹۲ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۶۔

اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں "یہ آیت ـــــ

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۭ کیا وہ شخص جو رات کو سجدہ کرکر کے اور قیام کرکے عبادت کرتا ہے، آخرت کے ڈر سے اور اپنے رب کی رحمت کی اُمید کرتا ہے (گنہگار بندوں کی برابر نہیں ہو سکتا)

حضرتِ عمار کی شان میں ہی نازل ہوئی ہے۔ جمعہ کے دن خطبہ سے قبل منبر پر بیٹھ کر عموماً سورۂ یٰسٓ تلاوت فرماتے تھے۔ خطبہ فصیح و بلیغ اور مختصر ہوتا تھا۔ ایک بار کسی نے اس اختصار پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے" نماز کو طول دینا اور خطبہ مختصر کرنا انسان کے سمجھ کی نشانی ہے"

حلیہ ـــ قد دراز، آنکھیں نرگسی، سینہ چوڑا، رنگ سیاہ، بدن بھرا اور گٹھا ہوا، سر کے بال بہت کم۔ اکیانوے یا کچھ اس سے زائد برس کی عمر میں شہادت پائی[1]، مگر آخر تک جوانوں کی طرح باہمت و باحوصلہ رہے، کبھی خضاب استعمال نہیں کیا۔

حضرتِ سالم

نام و نسب ابو عبداللہ کنیت، سالم نام، والد کا نام بعض کے نزدیک عبید بن ربیعہ اور بعض کے نزدیک معقل ہے۔ ایرانی الاصل ہیں۔ اصطخران کا آبائی وطن تھا۔ مولیٰ ابی حذیفہ بن عتبہ کے لقب سے

---

[1] اُسد الغابہ ج ۴ ص ۴۷۔

مشہور ہیں۔ دراصل حضرت ابو حذیفہ کی بیوی ثبیتہ بنت یعار انصاریہ کے غلام تھے۔ انہوں نے آزاد کر دیا تو حضرت ابو حذیفہ نے اُن کو اپنا بیٹا بنا لیا[۱] اور اپنی بھتیجی فاطمہ بنتِ ولید سے اُن کا نکاح کر دیا۔ چنانچہ لوگ انہیں سالم بن حذیفہ کہنے لگے۔ مگر جب قرآن مجید میں "اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ" (اُن کو اُن کے باپ کی نسبت سے بلایا کرو) کا حکم نازل ہوا تو لوگ انہیں سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کہنے لگے۔[۲]

اسلام | مکہ میں اسلام کا غلغلہ بلند ہوا تو حضرت سالم حضرت ابو حذیفہ کے ساتھ یہیں مقیم تھے توحید کی دعوت ربانی نے اپنا اثر کیا اور فوراً حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبیدۃ بن الجراح سے بھائی چارہ کرا دیا[۳]۔ مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم ہوا تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے مدینہ پہنچ گئے۔ سرورِ کونین نے مدینہ پہنچ کر معاذ بن ماعص سے مواخات کرا دی[۴]۔

غزوات وشہادت | حضرت سالم نہایت پُرجوش اور بہادر مجاہد تھے، غزوۂ بدر، اُحد، اور تمام اہم معرکوں میں شریک رہے۔ حضرت ابو بکر کے عہدِ خلافت میں مرتدین سے یمامہ میں جنگ کی نوبت آئی، تو حضرت سالم اس میں شریک تھے۔ آپ کے ہاتھ میں جھنڈا تھا کسی نے کہا "آپ یہ جھنڈا کسی اور کو دیدیجیے، آپ کی جان کا خطرہ ہے" بولے "تو پھر میں بُرا حاملِ قرآن ہونگا"۔ نہ مانے اور جھنڈا لے کر میدانِ جنگ میں درانہ گھستے چلے گئے، داہنا ہاتھ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ سے علم تھام لیا، بایاں ہاتھ بھی قلم ہو گیا تو لوا، کو گردن میں ڈال لیا کہ وہ خم نہ ہونے پائے۔ آپ

---

[۱] اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۴۵۔ [۲] اصابہ ج ۳ ص ۵۶۔ [۳] طبقات ابن سعد جزء ۳ ص ۱۶۔ [۴] اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۴۶

جھنڈے کو سینہ سے چمٹائے اور گردن سے لگائے ہوئے تھے اور زبانِ مبارک پر یہ فقرہ جاری تھا:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ — محمد صرف ایک رسول ہیں اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والے قتل کیے گئے۔

اس حالت میں کب تک مقاومت کرتے؟ زخموں سے چور ہو کر گرے تو پوچھا "ابو حذیفہ کا کیا حال ہے؟" کسی نے کہا "وہ تو قتل کر دیے گئے" پھر کسی شخص کا نام لے کر دریافت کیا اُس کا کیا حال ہے؟" لوگوں نے کہا "وہ بھی قتل کر دیے گیے" فرمایا "مجھ کو ان دونوں کے درمیان لٹا دو"

ابن سعد فرماتے ہیں "جنگ یمامہ میں مسلمانوں کے پاؤں پیچھے پڑنے لگے۔ تو حضرت سالم نے فرمایا "حیف! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو ہمارا حال ایسا نہ تھا" یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنے لیے ایک گڑھا کھود لیا اور اُس میں کھڑے ہو کر علم لیے ہوئے آخر لمحۂ حیات تک لڑتے رہے۔ جنگ کے ختم پر لوگوں نے دیکھا کہ ان کا سر اپنے مُنہ بولے باپ حضرت ابو حذیفہ کے پاؤں پر تھا۔[۱]

شہید ہونے کے بعد دیکھا گیا تو اُن کا ترکہ صرف ایک ہتھیار اور ایک گھوڑا تھا۔

حضرتِ عمر نے اس کو ثبینہ بنت یعار انصاریہ کے پاس بھیجدیا۔ اُنھوں نے اُس کو قبول نہیں کیا، اور کہا کہ حضرت سالم کو آزاد کرنے والی تو سائبہ ہیں۔ حضرت سائبہ کے پاس یہ ترکہ بھیجا

---

[۱] طبقات ابن سعد قسم اول جزء ۳ ص ۶۱۔

گیا تو انہوں نے فرمایا "میں نے سالم کو محض اللہ کے لیے آزاد کیا تھا۔ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔" حضرتِ عمرؓ نے اس کے بعد اس تمام ترکہ کو بیت المال میں داخل کر دیا[۱]۔

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سالم کی شہادت کی خبر پھیلی تو لوگوں نے کہا "آج ایک ربع قرآن جاتا رہا[۲]۔"

فضائل | حضرتِ سالم صحابۂ کرام کے طبقۂ سابقون الاولون میں سے سمجھے جاتے تھے قرأت اور حُسن صوت کے امام تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "قرأت چار شخصوں سے حاصل کرو، عبد اللہ بن مسعود، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "جب سے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے میں حضرتِ سالم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں[۳]۔ خوش الحانی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرتِ عائشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے پاس تشریف لا رہی تھیں راستہ میں رُک گئیں سرورِ کونین نے وجہ دریافت کی۔ فرمایا: ایک شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، میں اس کو سننے لگی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سُن کر اتنا اشتیاق ہوا کہ فوراً ردائے مبارک سنبھالتے ہوئے باہر تشریف لائے اور جب دیکھا کہ یہ قاری حضرت سالم تھے تو زبانِ قدس یوں زمزمہ پیرا ہوئی

الحمدُ لِلّٰہِ الّذی جَعَلَ فِی اُمّتِی مِثلَک[۴]	جمیع حمد ثابت ہے اُس خدا کے لیے جس نے میری اُمت میں تمہارے جیسے لوگوں کو پیدا کیا۔

حضرتِ سالم کے لیے اس سے بڑھ کر فضیلت و بزرگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود نبوت کی

[۱] و [۲] مستدرکِ حاکم ج ۳ ص ۲۲۶ [۳] بخاری باب مناقب سالم مولیٰ ابو حذیفہ [۴] اُسد الغابہ تذکرۂ سالم۔

زبانِ حق ترجمان اُس پر فخر و ناز کرے۔

مدینہ میں امامت | اِسی خوش الحانی اور فنِ قرأت میں مہارت و امامت کے باعث آپ مسجد قبا میں نماز پڑھاتے تھے۔ اور اجلۂ صحابہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ آپ کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے[1]۔ حضرتِ سالم کے اس فضل و کمال کی وجہ سے تمام صحابہ آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ حضرتِ عمرؓ نے وفات کے وقت فرمایا "اگر آج سالم زندہ ہوتے تو میں خلافت کی سفارش اُن کے لیے کرتا[2]۔"

حضرت اسلم فرماتے ہیں "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا "تم لوگ تمنا کرو" کسی نے کہا "میں اس بات کی تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر سونے سے بھرا ہوتا، اور میں اُس سب کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتا، اور صدقہ دے ڈالتا، ایک دوسرے شخص نے کہا "اے کاش یہ گھر پکھراج اور جواہرات سے پُر ہوتا اور میں فی سبیل اللہ وہ سب لٹا بیٹھتا" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اور کوئی تمنا ظاہر کرو" لوگوں نے کہا "ہم نہیں جانتے اے امیر المومنین کیا کہیں پھر آپ نے فرمایا" میں تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر ابوعبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، اور حذیفہ بن الیمان ایسے بزرگوں سے بھرا ہوتا[3]۔

اخلاق | حضرت سالم اخلاق کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ بزرگ تھے۔ گذشتہ واقعات زندگی سے ان کی استقامت اور استقلال و پامردی کا ثبوت ملتا ہے۔ دنیا و اہل دنیا سے بے تعلق رہتے تھے، جو کچھ کماتے تھے مختلف اسلامی ضرورتوں اور غلاموں کی ضرورتوں پر صرف

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب امامۃ العبد [2] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۲۴۶ و ۲۴۷ [3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۲۶

کردیتے تھے۔ وفات کے وقت صرف ایک ہتھیار۔ اور ایک گھوڑا چھوڑا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہٗ

حضرت عامرِ بن فہیرہ

نام ونسب | عامر نام، ابوعمرو کنیت، والد کا نام فہیرہ تھا، طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے جو حضرت عائشہ کے اخیافی بھائی تھے، اور قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام | مکہ مکرمہ میں اسلام کا غلغلہ اوّل اوّل بلند ہوا تو اُس کی صدائے پُرتاثیر نے جن حق آگاہ دلوں کو متأثر کیا، اُن میں ایک حضرت عامر بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دارِ ارقم میں تشریف فرما نہیں ہوئے تھے کہ حضرتِ عامر بحالت غلامی ہی اسلام لے آئے۔ حضرتِ بلال، مصعب بن عمیر اور حضرت عمارؓ کی طرح ان پر بھی سخت سے سخت مصیبتوں کی انتہا کردی گئی، مگر اُنھوں نے بڑی پامردی اور استقلال وثابت قدمی کے ساتھ ان سب کا مقابلہ کیا، اور اسلام کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ حضرت ابوبکر جو غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرنے میں مشہور ہیں، انھوں نے حضرت عامر کی یہ حالت دیکھی تو خرید کر آزاد کر دیا[1]۔

ہجرت | پھر جب سرکارِ دوعالم یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کی ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور غارِ ثور میں قیام کیا، تو حضرت ابوبکر نے حضرت عامر کو یہ خدمت سپرد

[1] اُسد الغابہ ج ۳۔ ص ۹۰۔

کی کہ وہ دن بھر اُن کی بکریاں چراتے تھے اور شام کو غار کے پاس لے آتے۔ یہاں دُودہ کر اُن کا دودھ نکالا جاتا اور کام میں لایا جاتا۔ صبح کے وقت حضرت عبداللہ بن ابی کر واپس جاتے تو بکریوں کو اُن کے نشانِ قدم پر لے چلتے کہ مشرکین کو کچھ شبہ نہ ہو۔ پھر جب یہ قافلہ غار ثور سے روانہ ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کو اپنے پیچھے بٹھالیا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت سعد بن خیثمہ کے مہمان ہوئے اور حضرت حارث بن اوس کے ساتھ مواخات کرادی گئی[۱]۔

مدینہ کی آب و ہوا شروع میں جن حضرات کو موافق نہیں آئی اُن میں ایک حضرت عامر بھی تھے۔ مرض کا اس قدر غلبہ ہوا کہ زندگی سے مایوس ہو گئے، بحران کی شدت کے وقت یہ اشعار پڑھتے تھے۔

انی وجدت الموت قبل ذوقہ ان الجبان حتفہ من فوقہ

کل امرء مجاھد بطوقہ کالثور یحمی انفہ بروقہ

ترجمہ: میں نے موت سے پہلے ہی موت کا ذائقہ چکھ لیا۔ بے شبہ بزدل کی موت اُس کے اوپر سے ہے۔

ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا ہے، بیل کی طرح جو اپنے سینگ سے اپنی ناک کی حفاظت کرتا ہے[۲]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین کرامؓ کی اس ناسازیٔ طبائع کی خبر ہوئی تو آپ نے دعا کی "اے خدا! تو مکہ کی طرح مدینہ کو بھی ہمارے لیے خوشگوار بنا دے۔ اور اُس کو بیماریوں سے پاک د

---

[۱] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۹۰۔ [۲] اصابہ تذکرہ حضرت عامر

صاف کر دے" دعا قبول ہوئی، اور حضرت عامر بن فہیرہ تندرست ہو گئے۔

غزوات | غزوۂ بدر و اُحد میں شریک تھے۔ صفر ۴ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو براء کلابی جو قبیلہ کلاب کا سردار تھا، اُس کی درخواست پر ستر قاریوں کی ایک جماعت کو جن میں سے اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے تبلیغ و ارشاد کے لیے اس قبیلہ کی طرف روانہ کیا۔ ان میں حضرتِ عامر بن فہیرہ بھی تھے اس جماعت مبلغین نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا۔ عامر بن طفیل[1] نے رعل و ذکوان قبائل کے پاس آدمی دوڑا دیے، ان لوگوں نے غداری کر کے ان تمام اصحاب کو مع حضرت عامر بن فہیرہ کے شہید کر دیا۔ صرف حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری زندہ گرفتار ہوئے۔ حضرت عامر کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی۔ اس کے بعد عامر بن طفیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو کہا کہ میں نے عامر بن فہیرہ کی لاش کو قتل ہونے کے بعد دیکھا کہ آسمان کی طرف اُٹھا لیے گئے یہاں تک کہ آسمان و زمین کے درمیان بالکل معلق نظر آئے پھر زمین پر رکھ دیے گئے۔[2]

حضرت عروہ سے مروی ہے کہ ان شہدائے کرام میں حضرتِ عامر کی نعش تلاش کی گئی تو نہیں ملی۔ اس پر لوگوں کو خیال ہوا کہ فرشتے اُس کو اُٹھا کر لے گئے یا انہوں نے تدفین کر دی سرورِ کائنات ﷺ کو اس واقعہ معونہ کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور آپ چالیس روز تک صبح کی نماز کے بعد ان غداروں کے حق میں بد دعا فرماتے رہے، یہاں تک کہ آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (آپ کو اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے) نازل ہوئی۔[3]

---

[1] عربی کا مشہور شاعر ہے۔ اس کا دیوان عبید بن ابرص کے دیوان کے ساتھ یورپ سے شائع ہو چکا ہے۔
[2] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الرجیع [3] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۹۱۔

اخلاق وشمائل | حضرت عامر صورت ظاہری کے لحاظ سے سیاہ فام حبشی تھے۔ مگر اُن کا دل اور سینہ انوارِ نبوت کی عکس ریزیوں سے شمع جہاں فروز کی مانند روشن تھے۔ حضرتِ عامر کی فضیلت وبزرگی کے لیے یہ شرف ہی کیا کم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غار ثور جیسے نازک موقع پر اپنا معتمد بنایا۔ استقلال وپامردی کا عالم یہ تھا کہ غزوۂ بیر معونہ میں ان کے قاتل جبار بن سلمی کا نیزہ سینہ سے پار ہوا تو اضطراب وتشویش کی بجائے بے ساختہ زبانِ مبارک سے نکلا: "فزتُ واللہِ" میں اللہ کی قسم کامیاب ہوگیا۔[1]

حضرتِ ابورافع

نام ونسب | نام میں بہت اختلاف ہے، زیادہ مشہور اسلم ہے، امام بخاری نے بھی اس کا ہی جزم کیا ہے۔ کنیت ابورافع تھی۔

غلامی | ابتدا میں حضرت عباس کے غلام تھے۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور ہبہ دے دیا۔ آنحضرت نے حضرتِ عباس کے اسلام قبول کرنے کی خوشی میں آزاد کر دیا۔[2]

اسلام | اپنے اسلام کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش نے مجھ کو کسی کام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ کو دیکھتے ہی میرا دل اسلام کی طرف مائل ہوگیا اور میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب میں قریش کے پاس واپس نہ جاؤنگا۔ سرکار کونین نے

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۲۳۰ [2] ابن سعد قسم اول جز ۴ ص ۵۱

فرمایا "میں عہد شکنی نہیں کرتا اور قاصد کو نہیں روکتا۔ اب تو تم واپس چلے جاؤ۔ اگر پھر بھی تم اسلام کی طرف میلان کا جذبہ اپنے اندر پاؤ تو واپس آجانا" چنانچہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق یہ واپس چلے گئے اور پھر بارگاہِ نبوت پناہ میں حاضر ہو کر دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے[1]۔

اخفاءِ اسلام | بدر تک قریش کے خوف سے اسلام کا اعلان نہیں کیا، ایک دن چاہِ زمزم پر بیٹھے تیر درست کر رہے تھے۔ حضرتِ عباسؓ کی بیوی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں، اتنے میں ابولہب آیا، اور حجرہ کی طناب کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر ابوسفیانؓ آئے۔ ابوسفیانؓ نے ابولہب سے بدر کے حالات پوچھنے شروع کیے۔ بولا "کیا بتاؤں؟ مسلمانوں نے ہماری تمام قوت تباہ کر کے رکھ دی کتنے ہی ہیں جن کو تہ تیغ کیا، کچھ گرفتار ہوئے۔ اسی سلسلہ میں ایک یہ عجیب و غریب واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں زمین سے آسمان تک سفید پوش سوار بھرے پڑے تھے۔ ابورافع بولے "وہ فرشتے تھے"! یہ سن کر ابولہب نے ان کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ یہ سنبھل کر گتھم گتھا ہو گئے۔ مگر کمزور تھے غالب نہ آسکے۔ ابولہب نے زمین پر پٹک دیا اور جتنا مار سکتا تھا مارا۔ حضرتِ عباسؓ کی بیوی جو پاس ہی موجود تھیں، اس ظلم کو برداشت نہ کر سکیں۔ ایک ستون اٹھا کر اس زور سے رسید کیا کہ ابولہب کا سر کھل گیا۔ اور بولیں "اس کا آقا موجود نہیں ہے، کمزور سمجھ کر مارتا ہے"[2]۔

ہجرت | بدر کے بعد ہجرت کر کے مدینہ گئے، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام پذیر ہو گئے۔

غزوات | اُحد اور خندق وغیرہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ حضرت علیؓ کی زیرِ سرکردگی جو یمن کی طرف بھیجا تھا؛ اس میں حضرت ابورافع بھی تھے۔ وہ خود

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۹۸۔ [2] ابن سعد قسم اول جزء ۴ ص ۵۱۔

فرماتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "اے ابو رافع! تم علی سے جا کر مل جاؤ، اور اُن کو پیچھے سے آواز نہ دینا۔ اُن کو چاہیے کہ کھڑے ہو جائیں اور ادھر اُدھر نہ دیکھیں یہاں تک کہ میں آجاؤں" چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور حضرت علی کو چند باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا "اے علی تمہارے ذریعہ اللہ کسی ایک شخص کو ہدایت دے۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اُن تمام چیزوں سے جن پر آفتاب طلوع کرتا ہے"[1]

فضل و کمال | حضرت ابو رافع فضل و کمال میں نمایاں مقام رکھتے تھے، ان سے اڑسٹھ ۶۸ روایتیں مروی ہیں۔ جن میں سے ایک میں بخاری اور تین میں امام مسلم منفرد ہیں۔ جن حضرات نے ان سے روایتیں نقل کیں اور علمی استفادہ کیا اُن کے نام یہ ہیں: صاحبزادوں میں حسن، رافع، عبید اللہ، معتمر۔ پوتوں میں: حسن، صالح۔ عام اصحاب میں عطاء بن یسار۔ ابو غطفان بن طریف ابو سعید مقبری۔ اور سلیمان بن یسار۔

حضرت ابو رافع ایک خادم کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر و حضر میں رہتے تھے۔ اس لیے سرور کائناتؐ کی زندگی کی معمولی معمولی جزئیات سے متعلق ان کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ واقفیت تھی۔ اسی بنا پر اجلۂ صحابہؓ ان سے استفادہ کرتے تھے حضرت ابو رافع کے پوتے عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس میرے دادا کے پاس ایک کاتب کو لے کر آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کرتے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۹۸۔

کہ آپ نے فلاں دن کیا کیا کام کیے تھے۔ وہ بتاتے جاتے اور کاتب تحریر کرتا جاتا تھا[1]۔

حضرت ابورافع کے شرف ومجد کے لیے یہی کیا کم ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ نے آزاد کر کے اُن کو اپنے خاندان میں شامل کرلیا تو فرمایا مولی القوم من انفسہم اس کے بعد شرافت ونجابت اور فضیلت وبزرگی کا کونسا مرتبہ باقی رہتا ہے[2]۔

حضرت ابورافع کو اس نسبت پر بڑا فخر وناز تھا۔ اور وہ اس کو کسی قیمت پر بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے متعلق صاحب تہذیب التہذیب نے ایک روایت لکھی ہے کہ عمرو بن سعید بن عاص نے مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں ان سے پوچھا "تم کس کے مولیٰ ہو؟" اُنھوں نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا" عمرو بن سعید نے کہا "نہیں! تم ہمارے غلام ہو" اُنھوں نے انکار کیا، یہاں تک کہ عمرو نے ان کو پانسو دُرّے لگائے اور بالآخر اُنھوں نے اقرار کرلیا" ہمارے خیال میں اول تو یہ روایت درست ہی نہیں۔ جیسا کہ خود صاحب تہذیب التہذیب نے اس کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

ولا تبین لی ذالك بل عندی انه غیرہ[3] — میرے نزدیک یہ درست نہیں ہے بلکہ یہ کوئی اور ابورافع ہیں۔

اور اگر ان سے ہی متعلق ہو، تو صحیح یہ ہے کہ آخر دم تک یہ اپنے تئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام کہتے رہے، اور عمرو کی غلامی کو تسلیم نہیں کیا، جیسا کہ بعض اور روایتوں سے ثابت ہوتا ہے۔

شادی اور اولاد | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی آزاد کردہ جاریہ سلمیٰ سے کردیا تھا، جو صاحبزادہ ابراہیم کی آیا تھیں۔ ان سے عبداللہ تولد ہوئے[4]۔ ان کے علاوہ حضرت ابورافع کی

---

[1] اصابہ ج ۴ تذکرہ حضرت ابن عباس [2] سنن ابوداؤد [3] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۹۳ [4] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۷۷

اولاد کے نام حسب ذیل ہیں :۔

حسن، رافع، معتمر، مغیرہ، سلمٰی [1]

وفات | وفات کے متعلق اختلاف ہے، کوئی حضرت عثمان کے آخر عہدِ خلافت میں بتاتا ہے، مگر غالباً صحیح یہ ہے کہ حضرت علی کے ابتدائی عہدِ خلافت میں انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہٗ۔ اصل یہ ہے کہ ابو رافع نام کا ایک شخص ابو احیحہ سعید بن العاص کا غلام تھا۔ ان دونوں کے واقعات ایک دوسرے سے ملتبس ہو گئے ہیں [2]۔

حضرتِ شقران صالح

نام ونسب | صالح نام، شقران لقب، اور والد کا نام عدی تھا حبشی نژاد تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے غلام تھے، بعد میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کر دیا۔ آپ نے اُن کو خلعتِ آزادی سے مشرف فرمایا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات نے قیمتاً خریدا تھا لیکن یہ قول بہت ضعیف ہے، خود ارباب سیر نے قِیْلَ کے ساتھ لکھا ہے [3]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک صحیح روایت بھی ایسی نہیں ہے جس سے آپ کا کسی غلام کو قیمت کے بدلہ میں خریدنا ثابت ہو۔

خدمات | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو غزوۂ مُریسیع میں اموالِ غنیمت کے جمع کرنے اور بدر میں قیدیوں کی دیکھ بھال پر متعین کیا تھا [4]۔ انہوں نے قیدیوں کی نگرانی اس نرمی اور ملاطفت سے کی کہ ان سب نے اُن کو اس قدر معاوضہ دیا کہ مالِ غنیمت میں سے جن کو حصہ ملا تھا حضرتِ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۹۲ [2] ایضاً ص ۹۳ [3] اسد الغابہ ج ۳ ص ۹ [4] اصابہ ج ۳ ص ۲۰۹

شقران اُن سب سے اچھے رہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت شقران کی حسن خدمات سے بہت خوش تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے وفات کے وقت خاص طور سے ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی وصیت فرمائی۔ حضرت شقران بھی اپنے آقا کے ایسے جاں نثار غلام ثابت ہوئے کہ جس دامنِ کرم سے ایک مرتبہ وابستہ ہو گئے تھے آخر تک اُس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُن کی وفاکوشی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سید کونین کے جسم مطہر کی امانت زمین کے سپرد کی گئی تو اس موقع پر حضرت شقران بھی آل بیت اطہار کے ساتھ موجود تھے۔ جو چادر اس وقت رحمۃ للعالمین کے زیبِ بدن تھی حضرت شقران اُس کو ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ملأ قدس کی یہ امانت با عظمت سپرد زمین ہو کر چشم ظاہر سے قیامت تک کے لیے مستور ہو گئی[2] صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم

حضرت شقران سے بعض احادیث بھی مروی ہیں۔ عبید اللہ بن ابی رافع نے اُن سے روایت کی ہے۔[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت شقران کہاں رہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بغوی فرماتے ہیں کہ مدینہ میں قیام رہا، اور بعضوں کا خیال ہے کہ بصرہ چلے گئے۔ ٹھیک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی جائے وفات و وقت وفات بھی معلوم نہیں ہے۔

حضرت خبّاب بن اَرَت

نام ونسب: خبّاب نام، ابو عبد اللہ کنیت، والد کا نام ارت تھا۔ ان کے نسب میں اختلاف ہے بعض

[1] طبقات ابن سعد قسم اول جزء ۳ ص ۳۴ [2] اصابہ ج ۳ ص ۲۰۹ [3] ایضاً

کہتے ہیں خزاعی تھے۔ مگر صحیح یہ ہے بنوتمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ عہد جاہلیت میں غلام بنا کر مکہ میں فروخت کیے گئے۔ ان کے آقا کے نام میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان کے آقا عتبہ بن غزوان تھے۔ اور کسی نے ان کو ام انمار بنت سباع الخزاعیہ کا غلام کہا ہے[۱]۔

اسلام | حضرت خباب اُن سعادتمند بزرگوں میں سے ہیں جن کی کلاہِ فخر کا طرۂ امتیاز السابقون الاولون ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی حضرت ارقم کے گھر میں قیام پذیر نہیں ہوئے تھے کہ حضرت خباب اسلام کی نعمت بے زوال سے مشرف ہو گئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا نمبر چھٹا تھا۔ اسی بنا پر آپ کو سادس الاسلام کہتے تھے[۲]۔

یہ وقت اُن چند مسلمانوں کے لیے انتہائی سخت اور صبر آزما تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کی وجہ سے محفوظ تھے، اور حضرت ابوبکر اپنی قوم میں ممتاز تھے۔ اس لیے وہ بھی کفار مکہ کے شر سے امن میں تھے حضرت خبّاب غلام تھے کوئی ان کا یار و مددگار نہیں تھا۔ انہوں نے اسلام کا اعلان کیا تو کافروں کا غیظ و غضب ان کے خلاف اُبل پڑا۔ یہ اُن مصیبت زدہ لوگوں میں سے تھے جن کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں لٹا دیتے تاکہ لوہے کی گرمی سے اُن کا جسم تپنے لگے۔ کبھی ننگی پیٹھ دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیے جاتے اور سینہ پر ایک بھاری پتھر رکھ کر ایک آدمی مسلتا۔ حضرت خباب یہ انسانیت سوز مظالم برداشت کرتے۔ انگاروں پر لوٹتے لوٹتے گوشت کباب کی طرح بھننے لگتا لیکن ان تمام سختیوں کے باوجود جو زبان بادۂ توحید کے ذائقہ کام نواز سے ایک مرتبہ آشنا ہو چکی تھی وہ کس طرح اس ظلم و جبر سے مرعوب ہو کر کلمۂ حق سے انحراف کر سکتی تھی۔ رحمت دو عالم حضرت خبّاب کی ان مصیبتوں کا حال سُن کر انتہا درجہ ملول ہوتے اور تالیف قلب فرماتے تھے۔ ام انمار کو سرور عالم کی ان دلجوئیوں کا علم ہوتا تو اپنے ظلم میں اور شدت

[۱] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۶ [۲] اصابہ ج ۲ ص ۱۰۱ [۳] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۶۔

پیدا کر دیتی، اور لوہا آگ میں تپا کر اُن کا سر داغتی تھی۔[1] ایک مرتبہ جب ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی تو حضرت خباب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی "میرے لیے بارگاہِ خداوندی میں دعا فرمائیے کہ وہ مجھ کو اس عذاب سے نجات عطا فرمائے، آپ نے دعا فرمائی" خدایا خباب کی مدد کر۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ اُم انمار کے سر میں ایسی تکلیف شروع ہوئی کہ وہ کتوں کی طرح بھونکتی تھی۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ سر کو داغ لگوانا چاہیے۔ چنانچہ حضرت خباب گرم کیا ہوا لوہا اُم انمار کے سر پر رکھ کر داغ دیتے تھے۔[3]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اُن سے فرمائش کی کہ تم نے مکہ میں جو مصیبتیں برداشت کی ہیں اُنہیں بیان کرو، حضرتِ خباب نے اپنی پشت دکھائی تو حضرت عمر بولے "آج تک میں نے کسی شخص کی پشت ایسی نہیں دیکھی ہے۔ حضرت خباب نے فرمایا "آگ جلائی جاتی تھی اور اُس پر میرے جسم کو تپایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میری پشت کی چربی اُس کو بجھا دیتی تھی (اُسد الغابہ)

جسمانی سزا کے علاوہ ان لوگوں نے مالی نقصان پہنچانے میں بھی کمی نہیں کی۔ حضرتِ خباب لوہار کا کام کرتے تھے اس سلسلہ میں اُن کا عاص بن وائل پر کچھ قرضہ تھا۔ یہ جب کبھی تقاضہ کرنے جاتے، وہ کہتا کہ میں اس وقت تک ادا نہیں کرونگا جب تک کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دامن نہیں چھوڑو گے۔ حضرت خباب فرماتے "جب تک تو دوبارہ زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آئیگا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن نہیں چھوڑونگا۔" اس پر وہ بولتا "اچھا میں مر کر دوبارہ زندہ ہونگا، اور اپنے مال واولاد کی طرف لوٹ کر آؤنگا، تب تمہارا قرضہ ادا کرونگا۔" (عاص بن وائل کا یہ کہنا عقیدۂ قیامت پر ایک طرح کی تعریض تھی) اس واقعہ پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔[4]

---

[1] ابن سعد ج ۳ تذکرہ حضرت خباب [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔
[3] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۶ [4] بخاری کتاب التفسیر باب قولہ ونرثہ ما یقول۔

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا اطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا

اے محمدؐ! کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے جس نے ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا ہے اور اُس نے کہا کہ مجھ کو مال اور اولاد ہی ملیگی یہ شخص کیا غیب سے باخبر ہوگیا ہے یا اُس نے خدا سے عہد لے لیا ہے ہرگز نہیں۔ یہ جو کچھ کہتا ہے ہم اُس کے وارث ہونگے اور یہ تنہا ہمارے سامنے لایا جائیگا۔

ہجرت ایک عرصہ تک مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم ہوا، تو ہجرت کرکے مدینہ پہنچے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اور فراش بن صمہ کے غلام تمیم میں اور بعض کے نزدیک جبیر بن عتیک میں مواخات کرادی تھی[1]۔

غزوات حضرت خباب بدر، احد، خندق اور تمام غزوات میں شریک رہے۔

فضائل حضرت خباب ایمان وعمل کے اعتبار سے نہایت پختہ اور مضبوط تھے۔ اس بناء پر تمام صحابہ میں آپ کو ہر دلعزیزی حاصل تھی، حضرت عمرؓ بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرتِ خباب حضرت عمرؓ سے ملنے آئے تو آپ نے اُن کو اپنے گدے پر بٹھایا، اور لوگوں کو خطاب کرکے فرمایا "ان کے علاوہ صرف ایک شخص اور ہے جو اس گدے پر بیٹھنے کا مستحق ہے"۔ خبابؓ نے پوچھا۔ "امیر المومنین! وہ کون ہے؟" فرمایا "بلالؓ!" بولے "وہ میرے برابر کس طرح مستحق ہوسکتے ہیں۔ مشرکین میں اُن کے بہت سے مددگار تھے، مگر میرا پوچھنے والا سوائے خدا اور کون تھا!" پھر اپنا استحقاق بتاتے ہوئے اپنے مصائب کی داستان سنائی۔

حضرت خبابؓ علم کی بڑی جستجو رکھتے تھے، کبھی کبھی رات رات بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ عبادت کو دیکھتے رہتے اور صبح کو اُس کے متعلق استفسار کرتے ایک مرتبہ

---

[1] اُسد الغابہ ومستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔

اُنھوں نے پوچھا "یا رسول اللہ آپ نے رات جیسی نماز پڑھی ایسی کبھی نہیں پڑھی۔ فرمایا " رات کی نماز خوف و رجا کی نماز تھی۔ میں نے خدا سے اپنی اُمت کے لیے تین چیزوں کی دعا مانگی تھی جن میں سے دو چیزیں منظور کر لی گئی ہیں تیسری منظور نہیں ہوئی[1]

حضرتِ خباب کی مرویات کی تعداد تینتیس ۳۳ ہے، ان میں سے دو متفق علیہ ہیں اور دو میں امام بخاری اور ایک میں امام مسلم منفرد ہیں۔ جن بزرگوں نے اُن سے روایت کی ہے اُن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

آپ کے صاحبزادے عبداللہ اور ابوامامۃ باہلی۔ ابومعمر عبداللہ بن سخبرہ، قیس بن ابی حازم، مسروق بن اجدع، علقمہ بن قیس، عمرو بن شرحبیل شعبی، حارثہ بن مضرب[2]۔

روایت میں احتیاط احتیاط وانکسار نفس کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ مسجد میں چند اصحاب بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں حضرت خباب تشریف لے آئے، اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے، لوگوں نے کہا کہ ہم سب اس وقت آپ کے پاس اس لیے جمع ہیں کہ آپ ہم سے کوئی بات کہیں یا کسی چیز کا حکم کریں۔ آپ نے فرمایا "میں کس بات کا حکم کروں، ممکن ہے میں آپ لوگوں کو کسی امر کا حکم کروں اور خود اُسے نہ کرتا ہوں"[3]۔

ذریعہ معاش زمانہ جاہلیت میں اور اُس کے بعد بھی عرصہ تک آہنگری کا پیشہ کرتے رہے اسلام کا ابتدائی زمانہ بڑی تنگی میں بسر ہوا۔ مگر کچھ دنوں بعد خدا نے مرفہ الحالی دی اور اتنی دولت ملی کہ پھر کسی پیشہ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہی۔ وفات کے وقت چالیس ہزار درہم چھوڑے[4]۔

علالت و وفات ۳۷ھ میں کوفہ میں بیمار ہوئے، اور چند روز کے بعد وہیں وفات ہوگئی۔ وفات سے کچھ دیر قبل اپنے صاحبزادے عبداللہ کو وصیت کی کہ مجھ کو کوفہ کے باہر میدان میں دفن کرنا اس

---

[1] اُسد الغابہ ج ۲ ص ۱۰۷، [2] ایضاً [3] اُسد الغابہ [4] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔

سے قبل کوفہ کے لوگ اپنے مُردوں کو گھروں کے سامنے یا شہر کے اندر ہی دفن کرتے تھے۔
حضرت خبابؓ اپنی وصیت کے مطابق شہر کے باہر میدان میں دفن کیے گئے تو ایک جلیل القدر صحابی کے قرب سے شرف اندوز ہونے کے لیے اہل کوفہ نے بھی اپنے مردے وہیں دفن کرنے شروع کر دیے۔[1]

مرض للموت میں کچھ لوگ عیادت کرنے آئے، اور کہنے لگے "ابو عبداللہ آپ خوش ہو جیے کہ کل آپ حوضِ کوثر پر اپنے بھائیوں سے ملاقات کرینگے" یہ سُنتے ہی حضرتِ خبابؓ پر رقت طاری ہوگئی اور فرمایا "تم نے ایسے بھائیوں کا ذکر کیا ہے جو گذر گئے اور اُنھوں نے اپنا کوئی اجر دنیا میں نہیں پایا، ہم اُن کے بعد رہے اور دنیا سے اس قدر حصہ پایا کہ ڈر ہے کہیں وہ ہی ہمارے اُن اعمال کا ثواب نہ ہو"۔

حضرتِ خبابؓ نے مرض الموت میں اس قدر تکلیف اُٹھائی کہ وہ خود فرماتے ہیں، "اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی دعا سے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنے لیے موت کی دعا مانگتا" آخر اسی حالت میں تہتر برس کی عمر میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اور اپنے پیشرو احباب و رفقا سے جا ملے۔ رضی اللہ عنہٗ۔

حضرت علیؓ صفین کی جنگ سے واپس آرہے تھے کہ کوفہ کے باہر میدان میں اُنہیں سات قبریں نظر آئیں۔ لوگوں سے پوچھا "کس کی ہیں؟" عرض کیا "سب سے پہلے حضرت خبابؓ اپنی وصیت کے مطابق یہاں دفن کیے گئے تھے، پھر اُن کے اتباع میں لوگوں نے اپنے مُردے بھی یہاں دفن کرنے شروع کر دیے ہیں" حضرت علیؓ نے فرمایا "اللہ خبابؓ پر رحم کرے، وہ اپنی رغبت سے مسلمان ہوئے، اپنی خوشی سے ہجرت کی، مجاہدانہ زندگی بسر کی، اُن کے جسم کو تکلیفیں پہنچائی گئیں

---

[1] مستدرکِ حاکم ج ۳ ص ۳۸۲۔

اللہ تعالیٰ نیک عمل لوگوں کے اعمال ضائع نہیں کرتا۔ اس کے بعد آپ نے اور قریب ہو کر تمام اہل قبور کے لیے دعا پڑھی[1]

حضرت خباب مولائے عتبہ بن غزوان

حضرت عتبہ بن غزوان کے غلام تھے۔ غزوۂ بدر اور دیگر تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک رہے۔ مدینہ میں ۱۹ھ میں پچاس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور حضرت عمرؓ نے جو اُس وقت سریرآرائے خلافت تھے نماز جنازہ پڑھی بعض لوگوں کو ان میں اور حضرت خباب بن ارت میں اشتباہ ہوگیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں بالکل الگ الگ ہیں۔ عتبہ بن نوفل بن عبد مناف کے حلیف تھے خباب کی کنیت ابو یحییٰ تھی، اور ان سے کوئی روایت منقول نہیں ہے[2]

حضرت ابوکبشہ

سلیم نام، ابوکبشہ کنیت، وطن و نسب کے اعتبار سے کوئی ان کو فارسی بعض دوسی اور بعض مکی بتاتے ہیں۔ غلام تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔

اسلام | اسلام کا زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف غلامی سے قیاس ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلام کے شروع زمانہ میں ہی اسلام قبول کر لیا ہوگا۔ ہجرت کی اجازت ہوئی تو مدینہ پہنچے اور کلثوم بن ہدم کے یہاں مقیم ہوئے۔

---

[1] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۱۰۸۔ [2] اُسد الغابہ تذکرہ حضرت خباب۔

غزوات | بدر کے معرکہ میں شریک تھے۔ اس کے بعد اُحد اور دوسرے غزوات میں بھی شریک ہوئے۔

وفات ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ یوم سہ شنبہ جس دن حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے وفات پائی[1]۔

زید بن بولیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابویسار کنیت تھی۔ ابن شاہین کہتے ہیں کہ آپ نے ان کو غزوۂ بنی ثعلبہ میں پایا تھا اور آزاد کر دیا تھا۔ ان کے پوتے بلال بن یسار کی وساطت سے امام ابوداؤد و ترمذی نے ان سے روایت کی ہے۔ یہ حبشی تھے[2]۔

---

[1] ابن سعد ج ۳ قسم اول ص ۳۳۔ [2] اصابہ ج ۳ ص ۲۲۔

حضرت عکرمہ

نام ونسب | عکرمہ نام، ابوعبداللہ کنیت اہل مغرب کے بربر سے تعلق رکھتے تھے حصین بن الحر العنبری کے غلام تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کی طرف سے بصرہ کے گورنر ہوکر گئے تو حصین نے حضرت عکرمہ کو حضرت ابن عباس کی غلامی میں ہبۃً منتقل کردیا۔[1] حضرت عکرمہ کی عمر اس وقت بہت تھوڑی تھی، اس لیے اُن کی تمام تعلیم وتربیت حضرت ابن عباس کے ہی دامانِ فضل وکرم میں ہوئی جس کے باعث وہ غلام ہونے کے باوجود علم وکمال کے آسمان پر مہر جہانتاب بن کر چمکے۔

تعلیم | حضرت عکرمہ میں تحصیل علم کا شوق خداداد تھا، اور پھر اُنہیں حضرت ابن عباس ایسا حبر اُمت، ترجمان القرآن بزرگ مل گیا۔ حضرت ابن عباس نے اُن کو تعلیم دینے میں بڑی کوشش اور جد وجہد سے کام لیا۔ سفر حضر میں ساتھ رکھتے تھے اور قرآن وسُنن کی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت عکرمہ نے مسلسل چالیس برس تک اپنے شفیق آقا کی خدمت میں علم کی تحصیل کی۔

فضل وکمال | شاگرد کے ذوق اور اُستاد کی توجہ بے غایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتِ عکرمہ علم کے دریائے بے پایاں بن گئے۔ ابن سعد لکھتے ہیں۔

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۹۔

كان كثير العلم بحرًا من البحور ۔ بہت علم رکھتے تھے اور ایک سمندر تھے۔

امام بخاری نے فرمایا "کوئی ایسا نہیں ہے جو عکرمہ سے احتجاج نہ کرتا اور سند نہ پکڑتا ہو" یحییٰ بن معین فرماتے تھے "عکرمہ معتبر ہیں اور تم جس کسی کو دیکھو کہ اُن کی شان میں بے اعتباری کا اظہار کرتا ہے اُس کے اسلام میں شک ہے"۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں "مجھ کو حضرت ابوالشعثاء نے چند مسائل دیے اور کہا "ان کی بابت حضرت عکرمہ سے پوچھ لو کہ وہ سمندر ہیں۔ تم اُن سے مسائل دریافت کیا کرو" احمد بن عبداللہ العجلی نے فرمایا "عکرمہ معتبر ہیں اور لوگ اُنہیں جس چیز سے متہم کرتے ہیں اُس سے بری ہیں" حضرت عکرمہ خود فرماتے ہیں "بازار جاتا ہوں اور وہاں کسی شخص سے کوئی کلمہ سُنتا ہوں تو اُس سے علم کے پچاس دروازے میرے اوپر کھل جاتے ہیں۔"

ابوالشعثاء ان کو "اعلم الناس" کہتے تھے۔ اور حافظ ذہبی نے ان کو "البحر العالم" لکھا ہے[۲]۔

تفسیر میں کمال

حضرت ابن عباس تفسیر قرآن کے امام ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کے لیے تفسیر و تاویل کے علم کے حاصل ہونے کی دعا فرمائی تھی۔ اس بنا پر حضرت عکرمہ بھی اُن کے فیض صحبت و توجہ سے تفسیر کے امام ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباس کو خود کسی آیت میں شبہ ہوتا تو اس کے لیے حضرت عکرمہ سے ہی رجوع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے یہ آیت پڑھی:-

لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۔ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا اُن کو شدید عذاب دینے والا ہے۔

اور حضرت عکرمہ سے پوچھا "مجھے نہیں معلوم ان لوگوں نے نجات پائی یا ہلاک ہو گئے"۔ عکرمہ نے پورے وضاحت کے ساتھ ثابت کر دیا کہ یہ لوگ ناجی ہو گئے۔ حضرت ابن عباس نے خوش

---

[۱] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ صفحہ ۳۴۱۔ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰۔

ہو کر ان کو ایک حلہ عطا فرمایا۔[1]

عثمان بن حکیم کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ابوامامہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں عکرمہ آئے اور فرمانے لگے "اے ابوامامہ! تم کو خدا کا واسطہ، تم نے کبھی حضرت ابن عباسؓ سے سنا ہے کہ عکرمہ تم سے جو کچھ کہے اس کی تصدیق کرو۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے؟" ابوامامہ نے فرمایا "ہاں"[2]

حضرت سعید بن جبیر تابعین میں تفسیر کے امام ہیں ان سے کسی نے پوچھا "آپ اپنے سے کسی اعلم کو جانتے ہیں" فرمایا "ہاں! وہ عکرمہ ہیں" امام شعبی فرماتے تھے "اب اللہ کی کتاب کو جاننے والا عکرمہ سے زیادہ کوئی نہیں ہے" حضرت قتادہ فرماتے تھے "تابعین میں سب سے بڑے عالم چار ہیں عطا، سعید بن جبیر، عکرمہ، اور حسن۔ انہی حضرت قتادہ سے دوسرا قول منقول ہے "عکرمہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں تم ان کے پاس بیٹھا کرو۔"

ایک مرتبہ حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر نے حضرت عکرمہ سے بعض آیات کی تفسیر سے متعلق چند سوالات کیے۔ حضرت عکرمہ نے ان سب کے جوابات نہایت تسلی بخش دیے جب یہ دونوں حضرات خاموش ہو گئے تو حضرت عکرمہ نے فرمایا "فلاں آیت کا نزول فلاں واقعہ سے متعلق ہے، اور فلاں آیت کا شانِ نزول یہ ہے"۔

ایوب کہتے ہیں "جب سے عکرمہ بصرہ میں داخل ہوئے ہیں حضرت حسنؒ نے تفسیر بیان کرنی بہت کم کر دی ہے" انہی ایوب المصری سے ابن جریج نے پوچھا "کیا تم نے عکرمہ کی تقریریں قلمبند کی ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا "تم سے دو تہائی علم فوت ہو گیا۔"

حضرت عکرمہ جرجان تشریف لے گئے تو وہاں لوگوں نے شہر بن حوشب سے دریافت

---

[1] تہذیب التہذیب ج۷، ص ۲۶۵ [2] تہذیب التہذیب ج۷، ص ۲۶۵۔

کیا، "کیا ہم عکرمہ کے پاس نہ جائیں؟" فرمایا "تم اُن کے پاس ضرور جاؤ، کیونکہ کوئی امت ایسی نہیں ہے جس کا کوئی حبر نہ ہو۔ ہماری اُمت کا حبر ابن عباس کا غلام ہے"[۱]۔

فقہ تفسیر کے ساتھ فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ خود حضرت ابن عباسؓ نے اُن سے فرمایا "تم جاؤ اور لوگوں کو فتاویٰ دو، میں تمہارا مددگار ہوں" عکرمہؒ بولے "اگر لوگ جتنے اب ہیں اس سے دُگنے بھی ہو جائیں میں اُن کو اُس وقت بھی فتویٰ دونگا" حضرت ابن عباس نے پھر فرمایا "جاؤ اور فتویٰ دو، اگر کوئی تم سے کام کی بات دریافت کرے تو اُسے فتویٰ دینا ورنہ چُپ رہنا"۔ حضرت عکرمہ اپنے عہد میں مرجع خلائق تھے۔ ایوب البصری کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ ارادہ کر رہا تھا کہ حضرت عکرمہ کے پاس جاؤں، ابھی بصرہ کے بازار میں تھا کہ کسی نے کہا "یہ عکرمہ جا رہے ہیں" میں اُن کی سواری کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لوگ آتے تھے اور پوچھ پوچھ کر چلے جاتے تھے، میں اس کو یاد کرتا جاتا تھا[۲]۔ انہی ایوب کا بیان ہے "ایک مرتبہ عکرمہ ہمارے یہاں آئے ان کے پاس لوگوں کا اتنا ہجوم ہوا کہ وہ مجبور ہو کر چھت پر چڑھ گئے"[۳]۔

حدیث تفسیر و فقہ کے علاوہ حدیث اُن کا خاص فن تھا۔ تفسیر کی طرح انہیں اس میں بھی بڑا کمال تھا حضرت ابن عباسؓ ان کے اُستاد شفیق تھے ہی۔ ان کے سوا انہوں نے صحابہ میں حضرت علیؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عمرؓ، ابن عمرو بن العاصؓ، ابو سعید خدریؓ، عقبہ بن عامرؓ، حجاج بن عمروؓ بن غزیہ، معاویہ بن ابی سفیان، صفوان بن اُمیہ، یعلی بن اُمیہ، جابرؓ، ابو قتادہؓ، اُم المومنین عائشہؓ اور حمنہ بنت جحش سے بھی استفادہ کیا تھا[۴]۔

حدیث میں ان کی وسعتِ علم کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت ابن عباس کی مرویات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اُن میں اکثر روایتیں عکرمہ کے واسطہ سے ہی منقول ہیں

---

[۱] یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب سے منقول ہیں۔ [۲] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۶۶ [۳] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۳ [۴] تہذیب التہذیب

ابن سعد ان کو کثیر الحدیث بتلاتے ہیں۔

جس طرح حضرتِ عکرمہ کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے، اُن کے تلامذہ بھی کثیر التعداد ہیں۔ صاحب تہذیب التہذیب نے ایک صفحہ میں اُن کے نام درج کئے ہیں ہم مشاہیر تلامذہ کے اسمارِ گرامی ذیل میں لکھتے ہیں، جس سے حضرت عکرمہ کی جلالتِ شان و اتبحت علم و فضل کا اندازہ ہوگا۔

ابراہیم نخعی، امام شعبی، قتادہ، سماک بن حرب، عاصم الاحول، ابواسحٰق سبیعی، ابوالزبیر حصین بن عبدالرحمٰن، ایوب خالد، داؤد بن ہند، عاصم بن بہدلہ، موسیٰ بن عقبہ، عمرو بن دینار عطاء بن سائب، یحییٰ بن سعید انصاری، یزید بن ابی حبیب، ابواسحٰق شیبانی، ہشام بن حسان یحییٰ بن کثیر، حکم بن عیینہ، داؤد بن الحصین، محمد بن سیرین، ابوالشعثاء وغیرہ۔

حضرتِ عکرمہ پر بعض لوگوں نے جرح کی ہے اور اُن کے متعلق بُری رائے ظاہر کی ہے۔ ان حضرات میں زیادہ نمایاں شخصیت امام مالک اور امام مسلم کی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عکرمہ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ خوارج کے ایک فرقہ صفریہ کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک اُن کی روایت کا تعلق ہے، اکثر ائمۂ مذہب نے اُنہیں ثقہ اور معتبر مانا ہے۔ امام بخاری تو یہاں تک فرماتے تھے کہ "مجھے کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جس نے حضرتِ عکرمہ سے احتجاج نہ کیا ہو" حاکم ابواحمد فرماتے ہیں "اُن کی حدیث سے ائمۂ قدماء نے سند لی ہے"۔

ابوعبداللہ محمد بن نصر المروزی فرماتے ہیں "عام علماءِ حدیث نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت عکرمہ کی حدیث سے حجت پکڑنی چاہئے" امام مسلم ان کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، تاہم اُنہوں نے اُن کی روایت کو قبول کیا ہے، اور جرح کے بعد تعدیل کی ہے

امام مسلم کے ماسوا امام بخاری، ابوداؤد، نسائی ان سب نے اپنی صحاح میں حضرت عکرمہ کی مرویات درج کی ہیں[1]۔

قوت تقریر ان فضائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تقریر کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ جو بات بیان کرتے تھے، اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ابن عیینہ فرماتے ہیں "عکرمہ جب مغازی پر کلام کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اُسے سُنے تو یہ محسوس ہو کہ گویا وہ خود ارباب مغازی کو دیکھ رہا ہے۔ اور تمام واقعات اُس کے سامنے سے ہی گزر رہے ہیں۔

غلامی سے آزادی یہ عجیب بات ہے کہ ارباب سیر لکھتے ہیں "حضرت ابن عباسؓ کی وفات کے وقت حضرت عکرمہ غلام ہی تھے۔ ابن عباسؓ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادہ علی نے عکرمہ کو چار ہزار دینار کے بدلہ میں فروخت کر دیا۔ اس پر عکرمہ نے کہا افسوس! تم نے اپنے باپ کا علم چار ہزار دینار کے عوض بیچ ڈالا" علی کو اس سے بڑا تأثر ہوا، اور بیع کا اقالہ کر لیا۔ پھر حسبۃً للہ آزاد کر دیے گئے[2]۔

لطافت طبع مزاج لطافت پسند پایا تھا کسی اچھی آواز کو بھی سُنتے تو اُس سے متاثر ہو جاتے تھے۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں "ایک مرتبہ عکرمہ بصرہ آئے ہوئے تھے چند لوگ اُن سے ملنے آئے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کہیں سے عمدہ گانے کی آواز آنے لگی حضرت عکرمہ بولے "چپ رہو" اور گانا سُننا شروع کر دیا، وہ ختم ہو گیا تو فرمایا "کمبخت کس قدر عمدہ گا رہا تھا[3]۔

سیر و سیاحت کا شوق حضرت عکرمہ کو سیر و سفر کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے یمن، مصر، افریقہ اور اصفہان و خراسان و سمرقند ان سب کی سیاحت کی تھی[4]۔

---

[1] یہ سب معلومات تہذیب التہذیب جلد ۷ از صفحہ ۲۶۷ تا ۲۷۳ ماخوذ ہیں۔ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۰ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۰ [4] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۷۰۔

وفات | ۱۰۵ھ یا ۱۰۶ھ میں اسی یا چوراسی برس کی عمر میں مدینہ میں وفات پائی۔ اتفاق سے اسی دن عرب کے مشہور غزل گو شاعر کثیر عزہ نے انتقال کیا تھا، لوگوں نے کہا "افسوس آج افقہ الناس (عکرمہ) اور اشعر الناس (کثیر) دونوں کا انتقال ہوگیا" دونوں پر بعد ظہر ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ قیروان (شمالی افریقہ) میں وفات ہوئی تھی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔[1]

اولاد | شادی اور اولاد کے متعلق تفصیل سے معلوم نہیں۔ البتہ علامہ ابن خلکان نے عمارہ بن حمزہ کو خطیب بغدادی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ کا پوتا بتایا ہے۔[2]

حضرت نافع بن کاؤس

نام ونسب | نافع نام ابوعبداللہ کنیت والد کا نام کاؤس یا ہرمز تھا، دیلم کے رہنے والے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کو کسی جنگ میں ملے تھے، اور ان کے غلام تھے۔[3]

جس طرح حضرت عکرمہ کو خوش قسمتی سے حضرت ابن عباسؓ کی غلامی میسر آگئی تھی جن کے فیض تعلیم وتربیت سے وہ تابعین کے ائمۂ کبار میں سمجھے جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح بخت کی ارجمندی نے حضرتِ نافع کو حضرت عبداللہ بن عمر کی غلامی میں دیدیا۔ ابن عمرؓ نے نافع کی تعلیم وتربیت بہترین طریقہ پر کی جس کے باعث وہ علم حدیث وتفسیر کے امام بلند مقام ہوگئے

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۰۔ [2] ایضاً [3] تاریخ ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۵۱

اور اُن کا آستانۂ افادہ و درس بڑے بڑے احرار و نجبار کے لیے بوسہ گاہِ عقیدت ہو گیا۔

آزادی | نافع میں جو جوہر قابل قسام ازل کی طرف سے ودیعت رکھا گیا تھا حضرت ابن عمرؓ اُس کے صحیح جوہر شناس تھے۔ وہ جانتے تھے۔ اُن کے زیر سایہ غلامی کی گدڑی میں کیسا لعل بے بہا پرورش پا رہا ہے جو ایک دن اپنی روشنی سے ارشاد و ہدایت کی محفل کو بقعۂ نور بنا دیگا۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن جعفر نے بارہ ہزار درہم کے عوض اُن کو حضرت ابن عمرؓ سے خریدنا چاہا تو اُنہوں نے صاف انکار کر دیا ایک دفعہ ابن عامر نے نافع کی قیمت کے سلسلہ میں تیس ہزار درہم پیش کیے حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا "میں ڈرتا ہوں کہ ابن عامر کے درہم کہیں مجھ کو فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں" اس کے بعد آپ نے فرمایا: اذھب فانت حرٌ (جاؤ تم آزاد ہو)۱

تعلیم | حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر کی خدمت میں تیس سال تک رہے۔ اس عرصہ میں حضرت ابن عمر نے ایسی توجہ خاص سے نافعؒ کی تربیت کی کہ وہ آسمان علم و فضل پر مہر تاباں بن کر نمودار ہوئے۔

علم و فضل | اُن کی علمی جلالت شان کو تمام ائمۂ حدیث نے تسلیم کیا ہے۔ حضرتِ عکرمہ کے احوال میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تفسیر و حدیث اور فقہ میں امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ اہل مدینہ میں حضرت نافع حضرتِ عکرمہ سے بھی افضل سمجھے جاتے تھے۲

حضرت ابنِ عمرؓ کے فرزند ارجمند حضرت سالم بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ امام احمد بن

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲۔ ۲ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۳۔

حنبل فرماتے ہیں "اگر نافع و سالم میں اختلاف ہو جائے تو نہیں جانتا کس کو ترجیح دوں"[1] امام نووی نے فرمایا "وہ جلیل المرتبت تابعی تھے اُن کی ثقاہت وجلالت پر سب کا اتفاق ہے"[2] خود حضرت ابن عمرؓ نے کہا "اللہ نے نافع کو عطا فرما کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے"[3] خلیلی کا بیان ہے کہ نافع مدینہ کے ائمۂ تابعین ہیں سے تھے اور امام العلم مانے جاتے تھے[4]۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام العلم" لکھتے ہیں[5]۔

حدیث حضرت ابن عمرؓ حدیث کے بحر بیکراں تھے، نافع تیس سال تک اس بحر سے سیراب ہوتے رہے تھے، اور پھر انہوں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ اور دوسرے سرچشمہائے حدیث سے بھی فیضیاب ہوتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے صحابہ میں حضرت ابن عمرؓ کے علاوہ ابو ہریرہؓ، ابو سعید الخدری، ابولبابہ، رافع بن خدیج، عائشہ، ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہم سے اور تابعین میں قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، یزید بن عبداللہ، اسلم مولیٰ عمر، ابراہیم بن عبداللہ، عبداللہ بن محمد بن ابی بکر الصدیق رحمہم اللہ سے حدیث کا سماع کیا[1]۔ حدیث میں جلالتِ شان کا یہ عالم ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں :۔

اصح الاسانید مالك عن نافع عن ابن عمر۔	سب سے زیادہ صحیح سند وہ ہے جس میں مالک نافع سے اور نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں۔

امام مالک فرماتے تھے "جب میں نافع سے ابن عمر کی کوئی حدیث سن لیتا ہوں تو

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴
[4] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۳ -

پھر کسی دوسرے سے اُس کو سُننے کی پروا نہیں کرتا۔ ابن عینہ کا بیان ہے "نافع کی حدیث سے زیادہ معتبر کس کی حدیث ہے؟"[1] ابن سعد فرماتے ہیں "نافع ثقہ کثیر الحدیث تھے"[2] ابن فراش نے اُن کو "ثقہ نبیل، شریف معتبر کہا ہے"[3] امام بخاری نے جس سلسلۂ اسناد کو اصح الاسانید کہا ہے۔ علمائے حدیث اُس کو "سلسلۃ الذہب" زنجیر طلائی کہتے ہیں[4]۔

تلامذہ: حضرت نافع کا بابِ افادہ و درس بہت وسیع تھا اور اُس سے بڑے بڑے ائمۂ دین واکابرِ امت نے استفادہ کیا۔ چند خاص تلامذہ کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

ابو اسحٰق سبیعی، زہری، حکیم بن عینہ، محمد بن عجلان، صالح بن کیسان، عبد ربہ و یحییٰ ابنا سعید، یونس بن عبید، یزید بن ابی حبیب، موسیٰ بن عقبہ، میمون بن مہران، جریر بن حازم، حکم بن عتیبہ، سعد بن ابراہیم، ابن جریج، اوزاعی، مالک بن انس، اسامۃ بن زید اللیثی، عطار الخراسانی، اعمش، ابن ابی لیلیٰ، ضحاک بن عثمان[4]۔

امام مالک حضرت نافع کے خاص تلمیذ تھے بچپن سے ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک ملازم کو لے کر نو عمری کے زمانہ میں ہی حضرتِ نافع کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، وہ تشریف لاتے اور مجھ کو احادیث سُنایا کرتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے تھے۔ اُس وقت اُن کے پاس کوئی نہیں آسکتا تھا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد مسجد سے تشریف لاتے تھے[5]۔

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۳ [3] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱
[4] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۲ - [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴ -

نافع حضرت ابن عمرؓ کی مرویات کے اتنے بڑے عالم تھے کہ خود انہیں اس پر ناز تھا۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے امام زہری کی اس بات کی شکایت کی کہ وہ میرے پاس آتے ہیں میں ان کو حضرت ابن عمرؓ کی روایتیں سُنا دیتا ہوں۔ پھر وہ حضرتِ سالمؒ (حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادہ) کے پاس جا کر اُسی روایت کے متعلق پوچھتے ہیں "کیا اس کی نسبت آپ نے اپنے والد سے کوئی روایت سُنی ہے؟" سالم فرماتے "ہاں" اس کے بعد زہریؒ اُس روایت کو سالم کے حوالہ سے بیان کرتے اور میرا کہیں ذکر نہ کرتے، حالانکہ حدیث کا اصل سیاق میرے پاس ہوتا تھا۔[۱]

فقہ حضرت ابنِ عمرؓ کثیر الحدیث ہونے کے ساتھ اجلۂ فقہاءِ صحابہ میں سے بھی تھے۔ نافع اُن کے شاگردِ رشید تھے۔ اس لیے فن حدیث میں امامت کی نعمت کے ساتھ فقاہت کی دولت بے پایاں بھی اُن کے حصہ میں آئی تھی۔ حافظ ابن حجر ان کو نافع الفقیہ لکھتے ہیں[۲]۔ لیکن اپنے آقازادہ حضرت سالم کا احترام اس درجہ مرعی رکھتے تھے کہ اُن کی موجودگی میں فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ ایک سیاہ چادر اوڑھتے، مُنہ لپیٹے رہتے، اور کسی سے کلام نہیں کرتے تھے[۳]۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اُن کے علم و فضل کی قدر کرتے ہوئے اُنہیں سُنن کی تعلیم کے لیے مصر بھیج دیا تھا۔[۴]

وفات ۱۱۷ھ یا ۱۲۰ھ میں وفات پائی[۵]۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴ [۲] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۱ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴
[۴] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۲۴ [۵] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۵۱۔

سعید بن جُبیرؒ

نام ونسب | سعید نام، ابو عبداللہ یا ابو محمد کنیت۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ بنی والبۃ بن الحارث بن ثعلبہ بن دودان کے غلام تھے[1] والبۃ اسد بن خزیمۃ کی ایک شاخ تھا۔ اس نسبت سے وہ الوالبی الاسدی کہلاتے ہیں[2]۔

تعلیم | اسلام نے غلاموں کو اکتساب علم وفضل کی جو آزادی عطا فرمائی ہے سعید بن جُبیرؒ اس کی ایک مثال تاباں تھے۔ اُنہوں نے اُس زمانہ میں ہوش سنبھالا جبکہ اکابر صحابہ کی بڑی تعداد اُٹھ چکی تھی، تاہم جو باقی تھے سعیدؒ نے ان سے تحصیل علم وکمال میں کوتاہی نہیں کی چنانچہ صحابہ میں ان کے اساتذہ کے نام یہ ہیں۔

عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن زبیر، ابوسعید خدری، ابوہریرہ۔ اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ، انس بن مالک، عبداللہ بن مغفل۔ ان صحابہ کرام میں سعید بن جُبیر نے حضرت ابن عباس سے خاص طور پر استفادہ کیا حضرت ابن عباس جس طرح قرآن کے بہترین ترجمان اور فن حدیث کے بحر بیکراں تھے فقہ، فرائض اور ادب وانشاء، شعر وشاعری اور انساب جاہلیت کی معرفت میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ اس بنا پر ان کا درس ان تمام چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا حضرت سعید بن جبیر اس حلقۂ درس میں پوری پابندی سے شریک ہوتے تھے

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶ [2] لب الالباب

ان کا تعلیم حاصل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ باہر کے سائلین جو سوالات کرتے، اور مسائل پوچھتے تھے اور حضرت ابن عباس اُن کے جو جوابات دیتے تھے، سعید خموشی کے ساتھ اُن سب کو سُنتے اور یاد کرتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خود بھی کوئی سوال کر لیتے، ورنہ عموماً چپ بیٹھے رہتے تھے شروع میں حضرت ابن عباس نے تقریر قلمبند کرنے کی ممانعت فرما دی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے بعد میں لکھنے کی اجازت مل گئی تھی چنانچہ بعض دن اس کثرت سے مسائل پیش آتے تھے کہ لکھتے لکھتے ابن جبیر کی بیاض پُر ہو جاتی تھی اور اُنہیں کپڑوں اور ہتھیلیوں پر لکھنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی[1]۔

حضرت ابن عباس کے بعد اُنہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے فائدہ اٹھایا۔ ابن جبیر قیام کوفہ کے زمانہ تک جب کہ وہ خود صاحب افتار ہو گئے تھے حضرت ابن عمرؓ سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں "جب کسی مسئلہ میں علمار کوفہ باہم مختلف ہوتے تھے تو میں اُس مسئلہ کو لکھ لیتا اور پھر حضرت ابن عمرؓ سے ملاقات ہوتی تو اُسے دریافت کر لیتا تھا[2]۔"

علم و فضل | ان اساتذۂ کرام کے فیض خاص اور سعید بن جبیر کی محنت و توجہ، اور ذوق و شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعید تفسیر، حدیث، فقہ، اور فرائض میں امام و شیخ بن گئے، اور اقلیم شہرت و عظمت کے تاجدار بن کر نمودار ہوئے۔ امام نووی فرماتے ہیں "سعید بن جبیر تابعین کے ائمہ کبار میں سے تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ اور عبادت اور دوسری صفات خیر میں ان کے مشہور بزرگوں میں سے تھے[3]۔" میمون بن مہران کہتے ہیں "سعید بن جبیر کا انتقال ہو گیا اور آج زمین پر کوئی ایک شخص ایسا نہیں ہے جو اُن کے علم کا محتاج نہ ہو[4]۔" اشعث بن قیس کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر کو جہبذ العلماء (رئیس العلماء) کہا جاتا تھا[5]۔

[1] ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۹۔ [2] ایضاً [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲۔

تفسیر حضرت سعید کو ابن عباسؓ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا جو قرآن مجید کے بہترین ترجمان تھے اس بنا پر ان کو بھی تفسیر و تاویل اور شانِ نزول کے علم میں بڑا کمال حاصل تھا جب اُن کے سامنے کوئی آیت پڑھی جاتی تھی تو وہ اُس کا مصداق فوراً بتا دیا کرتے تھے۔ ابو یونس قزی کہتے ہیں "میں نے ایک دفعہ سعید بن جبیر کے سامنے یہ آیت پڑھی:۔

الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان مگر کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے۔

اُنھوں نے کہا " اس میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ مکہ کے چند ستم رسیدہ تھے"میں نے کہا" میں ایسے ہی لوگوں (حجاج کے ستم رسیدہ) کے پاس سے آ رہا ہوں" سعید بولے " بھتیجے! ہم لوگوں نے اس کے خلاف بڑی کوشش کی، لیکن کیا کیا جائے، خدا کی مرضی یہی تھی"۔ اعمش فرماتے ہیں " سعید بن جبیرؒ سے کسی نے ان ارضی واسعۃ کی تفسیر دریافت کی تو فرمایا" اس سے مراد یہ ہے کہ جب اُس میں گناہ کیا جائے تو اُس سے نکل جاؤ[1]"۔

تفسیر میں احتیاط تفسیر کا درس زبانی دیتے تھے، اور یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص اُس کو قلمبند کرے۔ ایک شخص اُن کے پاس آیا، اور تقریر قلمبند کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا" میرے ایک پہلو پر فالج گر پڑے، یہ بہتر ہے اس سے کہ میں تقریر لکھنے کی اجازت دیدوں[2]"مگر خاص خاص اہل ذوق کو لکھنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ چنانچہ وقار بن ایاس بیان کرتے ہیں" عزرہ تفسیر کی کتاب اور دوات لے کر حضرت ابنِ جبیر کے پاس آتے تھے[3]"

قرأت تفسیر کے ساتھ قرأت میں بھی کمال رکھتے تھے۔ رمضان میں امامت خود ہی کرتے تھے۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۳، ۲؎ ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳ ۳؎ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ ۴؎ ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳

مشہور قرأتوں کا علم حاصل تھا۔ ایک رات حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت اور دوسری شب حضرت زید بن ثابت کی قرأت پڑھتے تھے[1]۔

حدیث | حدیث کے اکابر حفاظ میں سے تھے، اجلۂ صحابہ سے حدیث کا سماع کیا تھا حضرت ابن عباس کے تلمیذ خاص تھے جو اُن پر خاص شفقت کی نگاہ رکھتے تھے۔

مجاہد فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس نے سعید سے کہا "حدیثیں سُناؤ" انہوں نے عرض کیا "میں آپ کی موجودگی میں حدیث کس طرح سُنا سکتا ہوں؟" ابن عباسؓ نے فرمایا "کیا یہ خدا کی نعمت نہیں ہے کہ تم میرے سامنے حدیثیں بیان کرو، اگر صحیح بیان کروگے تو فبہا، ورنہ میں اس کی تصحیح کردوں گا"[2] بنی دواعہ کے موذن کا بیان ہے "میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا وہ ایک گدے پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اور سعید اُن کے پیروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس اُن سے فرما رہے تھے "تم نے مجھ سے بہتیری حدیثیں یاد کی ہیں۔ اب دیکھوں ان کو کیسے روایت کرتے ہو"[3]

روایت حدیث میں احتیاط | مگر کبار حفاظ حدیث میں ہونے کے باوجود روایت کے معاملہ میں محتاط تھے۔ موقع دیکھ کر روایت کرتے تھے۔ محمد بن حبیب کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر اصفہان میں تھے تو لوگوں نے روایت حدیث کی درخواست کی، مگر انہوں نے اُسے منظور نہیں کیا۔ پھر جب کوفہ میں آئے تو احادیث بیان کرنے لگے کسی نے اُن سے پوچھا "اے ابو محمد! آپ اصفہان میں تو حدیث بیان کرتے نہیں تھے کوفہ میں آکر حدیثیں کس طرح بیان

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۸، [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۴، [3] ابن سعد ج ۶ ص ۱۷۹، [4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵

کرنے لگے، فرمایا "انشر بزّک حیث یعرف" تم اپنے تھان وہاں کھولو جہاں اُس کو پہچاننے والے موجود ہوں[1]۔

فقہ قرآن و حدیث میں بصیرت تامہ رکھنے کی وجہ سے اُنھیں فقہ میں بھی امامت کا درجہ حاصل تھا۔ حضرت ابن عباس کے سامنے اُنھیں فتویٰ دینے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، مگر جب وہ نابینا ہو گئے تو حضرت سعید بن جبیر لکھنے لگے[2]۔ خود حضرت ابن عباس کو اتنا اعتماد تھا کہ اہل کوفہ حج کرنے آتے، اور مکہ میں حضرت ابن عباس سے مسائل دریافت کرتے تو وہ فرماتے "کیا تم میں سعید بن جبیر نہیں ہیں"؟[3] امام نووی نے ان کو جہاں تفسیر و حدیث میں کبار ائمۃ التابعین میں شمار کیا ہے، فقہ میں بھی کیا ہے۔

خصیب کا بیان ہے کہ مسائل طلاق کے سب سے بڑے عالم سعید بن المسیب تھے۔ حج کے عطاء، حرام و حلال کے طاؤس، تفسیر کے مجاہد اور ان سب کے جامع سعید بن جبیر تھے[4]۔

فرائض فرائض میں خاص ملکہ تھا، جلیل القدر صحابہ فرائض کے سائلوں کو ان کے پاس بھیجتے تھے، ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس اسی قسم کا سائل آیا۔ آپ نے اُس کو سعید بن جبیرؓ کے پاس بھیج دیا، اور فرمایا "فرائض کا علم جتنا مجھ کو ہے اُن کو بھی ہے، مگر وہ حساب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں"۔ جب کبھی مدینہ تشریف لیجاتے، علماء مدینہ اُن سے فرائض سیکھتے تھے۔ امام زین العابدین کا بیان ہے کہ ابن جبیر ہمارے یہاں سے گذرتے تو ہم اُن سے فرائض اور وہ باتیں دریافت

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۴ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۰۵۔
[4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ [5] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶۔

کرتے تھے جن سے خدا نے ہم کو فائدہ پہنچایا۔[1]

اشاعت علم کا شوق حضرت سعید ابن جبیر کے سینہ میں علم وفضل کا جو خزانہ ودیعت تھا اُنہوں نے حسب موقع ومصلحت اُس کو شائع کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا بعض لوگ آپ کو حدیث بیان کرنے پر ملامت کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا "میں تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے حدیث بیان کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ میں اُسے قبر میں ساتھ لیجاؤں"[2]

تلامذہ شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں بعض اکابر اُمت ہوئے ہیں۔ چند بزرگوں کے نام یہ ہیں: عبدالملک، عبداللہ، یعلی بن حکیم، یعلی بن مسلم، ابواسحٰق سبیعی، ابوالزبیر مکی، آدم بن سلیمان، اشعث بن ابی الشعثاء، ذر بن عبداللہ، سالم الافطس، سلمہ بن کہیل، طلحہ بن مصرف، عطا بن السائب، عبدالملک بن سلیمان، مغیرہ بن النعمان وغیرہ[3]

شیکاری قضاء کوفہ میں کچھ دنوں تک عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے اور پھر اُن کے بعد ابو بردہ ابن ابی موسیٰ اشعری کے پیش کار رہے۔[4]

تقویٰ ان تمام علمی کمالات کے ساتھ زہد واتقاء میں بھی درجۂ امتیاز رکھتے تھے خشیتِ ربانی حد سے بڑھا ہوا تھا سوز وگداز قلب جو تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ قاسم ابن ابی ایوب کہتے ہیں "سعید بن جبیر رات رات بھر روتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی آنکھوں میں چندھیاہٹ پیدا ہوگئی تھی"[5] مزید فرماتے ہیں کہ میں نے اُن کو ایک

[1] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۰ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲ [4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵
[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲۔

مرتبہ دیکھا کہ آیت:

واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ — تم ڈرو اُس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پڑھ رہے تھے اور روتے جاتے تھے[1]

غیبت کرنا اور سُننا دونوں سے سخت احتراز کرتے تھے۔ مسلم البطین کہتے ہیں "سعید اپنے روبرو کسی کو غیبت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ اُس سے فرماتے "جو کچھ تم کو کہنا ہے اُس کے سامنے کہو۔

نماز میں خشوع | نماز نہایت خشوع سے ادا کرتے تھے کبھی اُس میں اس قدر انہماک ہوتا کہ ایک رکعت میں ہی تمام قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ عبدالملک بن سلیمان بیان کرتے ہیں کہ دو رکعتوں میں قرآن مجید ختم کر دیا کرتے تھے[2]

ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے کہ یہ آیت:

اذ الاغلال فی اعناقھم و — جبکہ طوق اُن کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں

السلاسل یسحبون فی الحمیم۔ — اور وہ گرم پانی پینے کے لیے گھسیٹے جاتے ہونگے۔

آگئی، اتنی رقت طاری ہوئی کہ اس کو بار بار دہراتے رہے[3]

دعا میں اثر | اُن کے اِن اعمالِ نیک کا ہی ثمرہ تھا کہ اُن کی دعا میں بڑی تاثیر تھی۔ اُن کے ہاں ایک مُرغ تھا جو رات کو بانگ دے کر اُنہیں بیدار کر دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک رات اُس نے بانگ نہیں دی، حضرت سعید بن جبیر کی آنکھ نہیں کُھلی اور وہ صبح تک پڑے سوتے رہے، صبح

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰، [2] ایضاً [3] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۱۔

کو اُٹھے تو اُنہیں شب کا بیدار نہ ہونا بہت بُرا معلوم ہوا غصّہ میں فرمانے لگے "اس مُرغ کو کیا ہو گیا تھا، اللہ اس کی آواز کو ختم کر دے"! اُن کا یہ کہنا تیر بہدف ہوا اور اُس مُرغ نے پھر دوبارہ کبھی بانگ نہیں دی۔ اُن کی والدہ نے فرمایا "اب آئندہ سے کبھی کسی کے حق میں بددُعا نہ کرنا"[1]

علماءِ سُوء سے اجتناب علماءِ سوء کو نہایت بُرا جانتے تھے اور اُنہیں مسلمانوں کے لیے خطرۂ عظیم سمجھتے تھے ہلال بن خباب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا "لوگوں کی ہلاکت کس وجہ سے ہوگی؟" فرمایا: اُن کے علماء کے ہاتھوں[2]!"

سیر و سیاحت اور قضاءِ کوفہ ابن جبیر کو سیر و سیاحت کا شوق تھا، ایک عرصہ تک مدینہ رہے، یہاں سے اصفہان چلے گئے اور وہاں ایک مدت تک قیام کرنے کے بعد عراق آ گئے۔ مختلف شہروں میں پھرنے کے بعد ایک گاؤں سنبلان میں اقامت اختیار کر لی[3]۔ حجاج بن یوسف ان کے علم و فضل کی قدر کرتا تھا، چنانچہ اُس نے کوفہ کا امام اور قاضی مقرر کر دیا۔ لیکن کوفہ کے لوگ نہایت شورہ پشت تھے کسی کی گورنری سے خوش ہی نہیں ہوتے تھے حسبِ عادت ابن جبیر کے خلاف بھی شور و غل مچایا اور کہا "ہمارا حاکم تو کوئی عربی ہی ہونا چاہیے" مجبوراً حجاج کو اُنہیں عہدۂ قضا سے برطرف کرنا پڑا۔ ان کی بجائے ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعری کوفہ کے قاضی مقرر کر دیے گئے۔ مگر حجاج نے تاکید کر دی تھی کہ ابن جبیر سے امورِ قضا میں مشورے لیتے رہنا[4]۔

حجاج کی مخالفت حجاج حضرت ابن جبیر کی ہر طرح عزت افزائی کرتا تھا لیکن وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے تھے اور اُس کی بے پناہ سفاکیوں کو انتہائی نفرت و غصہ کی نگاہ سے دیکھتے۔ چنانچہ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۔ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۳۔ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵ [4] ایضاً

جب ۸۱ھ میں عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث نے حجاج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ابن جبیر اُس کے ساتھ ہو کر حجاج سے لڑے۔

تاریخ میں حجاج و ابن اشعث کی مخالفت کا واقعہ مشہور ہے، اُس کی تفصیل یہ ہے کہ عبدالملک کے عہد میں سجستان کے فرمانروا رتبیل نے باغیانہ روش اختیار کر لی تھی۔ حجاج نے عبید اللہ ابن ابو بکرہ کو ایک لشکر کے ساتھ اُس کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا، اُنہوں نے سیستان پہنچ کر فوج کشی کی۔ شروع شروع میں اُنہیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی مگر بعد میں شکست ہو گئی جس کے باعث مسلمانوں کو شدید جانی و مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ حجاج کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اُس نے ابن اشعث کی زیر سرکردگی چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار بڑے ساز و سامان کے ساتھ روانہ کیا۔ اس لشکر میں بیس ہزار سپاہی کوفہ کے تھے اور بیس ہزار بصرہ کے۔ حضرت سعید ابن جبیر بھی اس فوج میں شریک تھے۔ ان کے سپرد تنخواہ تقسیم کرنے کی خدمت تھی[1]۔

ابن اشعث اس فوج گراں کو لیے بڑھتے رہے۔ رتبیل کو اس کی اطلاع ہوئی، تو اُس نے نامہ و پیام کے ذریعہ مصالحت کرنی چاہی اور پہلی دفعہ مسلمانوں کو اُس کے ہاتھ سے جو نقصان پہنچا تھا اُس کی معذرت کی، مگر ابن اشعث نے ایک نہیں سُنی۔ اُنہوں نے حدود سیستان میں داخل ہو کر کئی علاقے فتح کر لیے مگر بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر مزید پیش قدمی ایک سال کے لیے ملتوی کر دی اور حجاج کو خط کے ذریعہ اس کی اطلاع بھی دیدی۔ حجاج خط پڑھ کر برافروختہ ہو گیا، اور اُس نے جواب میں لکھا "تمہارا خط اُس شخص کا سا خط ہے جو اغماض و صلح کو پسند کرتا ہے اور دشمن سے سمجھوتہ کر کے

---

[1] ابن جریر طبری ج ۸ ص ۹۲۔

آرام کرنے کا خواہشمند ہے بیں یہ تو نہیں کہتا کہ تم نے یہ خط کسی مکاری کی بنا پر لکھا ہے" البتہ ہاں یہ ضرور ہے کہ تم نے یہ رائے اپنے ضعف اور سہل انگاری کی بنا پر قائم کی ہے"۔ اس خط کے بعد ایک اور خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ اگر تم خود پیشقدمی نہیں کر سکتے تو اپنے بھائی اسحٰق بن محمد کو لشکر کی قیادت سپرد کردو، اور تم الگ ہو جاؤ۔ ابن اشعث اور حجاج میں پہلے سے مخالفت تھی اور دونوں ایک دوسرے کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس خط نے دل میں چھپی ہوئی بدگمانی کو بے نقاب کر دیا۔ ابن اشعث اس کو پڑھتے ہی بگڑ گیا اور اس نے وہیں ایک مجمع کر کے لوگوں کو حجاج کی مخالفت پر اُبھارا، اہل فوج حجاج کے مظالم سے پہلے سے ہی نالاں تھے بڑے بڑے سردار اُس کے حامی ہو گئے۔ شروع میں یہ مخالفت صرف حجاج کے ساتھ تھی لیکن بعد میں اُس نے عبدالملک کی مخالفت کی صورت اختیار کر لی۔ ابن اشعث اپنے حامیوں کی جماعت لیے ہوئے عراق پہنچا، ادھر حجاج نے ایک فوج گراں کے ساتھ ابن اشعث کے مقابلہ کے لیے عراق سے کوچ کیا، دو ماہ تک جنگ ہوتی رہی، ابن اشعث کے ساتھ بہت سے علماء اور قراء تھے جن کے سرگروہ سعید بن جبیر تھے۔

ابن اشعث کی شکست

ابتداءً ابن اشعث کی قوت مضبوط تھی، مگر جب مقابلہ کی زد پر حکومت بھی آگئی تو اس کا زور گھٹ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دیر جماجم میں شکست فاش کھانی پڑی۔ ابن اشعث تو بھاگ کر سیستان چلا گیا، ابن جبیر پھرتے پھراتے مکہ چلے آئے۔ یہاں کے والی خالد بن عبداللہ قشری نے گرفتار کر کے اُنہیں حجاج کے پاس بھجوا دیا۔ وہ ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا[1]۔ انہیں دیکھتے ہی

---

[1] ابن جریر طبری ج ۸ ص ۱۰۰۷، ملخصاً۔

غیظ و غضب سے بے قابو ہو گیا، پھر دونوں میں حسب ذیل مکالمہ ہوا۔

حجاج :۔ تمہارا نام کیا ہے ؟

سعید :۔ سعید بن جبیر۔

حَجّاج :۔ نہیں! بلکہ شقی بن کُسَیر

ابن جُبیر :۔ میری ماں بہ نسبت تمہارے میرے نام سے زیادہ واقف تھیں۔

حجاج :۔ وہ بھی بدبخت اور تم بھی بدبخت ہو۔

ابن جبیر :۔ غیب کا علم کسی دوسری ہی ذات کو ہے۔

حجاج :۔ میں تمہاری دنیا کو دہکتی ہوئی آگ سے بدل دونگا۔

ابن جبیر :۔ اگر مجھ کو یقین ہوتا کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے تو میں تم کو معبود بنا لیتا۔

حجاج :۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟

ابن جبیر :۔ وہ امام ہدیٰ اور نبی رحمت تھے۔

حجاج :۔ علی اور عثمان کے بارہ میں کیا رائے ہے؟

ابن جبیر :۔ اگر میں وہاں گیا ہوتا اور وہاں کے رہنے والوں کو دیکھا ہوتا تو بتا سکتا تھا۔

حجاج :۔ خلفا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

ابن جبیر :۔ میں اُن کا اجارہ دار نہیں ہوں۔

حجاج :۔ اُن میں تم کو سب سے زیادہ پسند کون ہے؟

ابن جبیر :۔ جو میرے خالق کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

حجاج :- خالق کے نزدیک کون سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟

ابن جبیر:- اس کا علم اُس ذات کو ہے جو اُن کے بھیدوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے۔

حجاج :- میں چاہتا ہوں کہ تم میری تصدیق کرو۔

ابن جبیر:- اگر میں تم کو محبوب رکھتا تو ہرگز تمہاری تکذیب نہ کرتا۔

حجاج :- تمہیں کیا ہوگیا کہ ہنستے نہیں ہو۔

ابن جبیر:- وہ مخلوق کس طرح ہنسے جو مٹی سے پیدا کی گئی ہے، حالانکہ مٹی کو آگ کھا جاتی ہو۔

حجاج :- پھر ہم کیوں ہنستے ہیں؟

ابن جبیر:- سب دل برابر نہیں ہیں!

اِس کے بعد حجاج نے موتی، زبرجد اور یاقوت منگوائے اور ان سب کو اپنے سامنے جمع کیا۔ حضرت ابن جبیر بولے "اگر تم نے ان چیزوں کو اس لیے جمع کیا ہے کہ ان کے ذریعہ روزِ قیامت کے خوف سے بچ جاؤ تو درست ہے، ورنہ یاد رکھو قیامت کا ایک جھٹکا دودھ پلانے والی عورتوں کو اُن کے شیر خوار بچوں سے غافل کردیگا اور جو چیزیں دنیا کے لیے جمع کی جائیں اُن میں صرف وہی عمدہ اور پسندیدہ چیزیں ہیں جو پاکیزہ اور طیب ہوں"۔ اس کے بعد حجاج نے عود اور بانسری بجانے کا حکم دیا۔ ابن جبیر بانسری کی آواز سن کر رو پڑے۔ حجاج بولا "اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ یہ تو ایک تفریحی چیز ہے"۔ ابن جُبیر نے کہا "نہیں! یہ تو ایک صدائے غم ہے، بانسری کے بجنے نے مجھ کو وہ بڑا دن یاد دلا دیا جبکہ صور پھونکا جائیگا، اور عود ایک ناحق کاٹے ہوئے درخت کی لکڑی ہے اور اس کے تار اُن بکریوں کے پٹھوں کے ہیں جو اُن کے ساتھ قیامت کے دن

اٹھائی جائینگی۔ اس گفتگو کے بعد حجاج بولا "سعید! تمہاری حالت قابلِ افسوس ہے" ابن جبیر نے جواب دیا "وہ شخص افسوس کے قابل نہیں ہے جو آگ سے نجات پا گیا ہو اور جنت میں داخل کر دیا گیا ہو" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

حجاج:۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم کوفہ میں آئے جبکہ وہاں ایک شخص بھی غیر عربی نہیں تھا۔ اور میں نے تم کو وہاں کا امام و قاضی بنایا؟ سعید:۔ کیوں نہیں!

حجاج:۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ تمہارے عہدۂ قضا پر مامور ہونے کی وجہ سے اہل کوفہ نے شور و غل مچایا اور مطالبہ کیا کہ ہمارا قاضی عربی النسل ہونا چاہیے۔ تو میں نے تمہاری بجائے ابوبردہ ابن ابی موسیٰ اشعری کو قاضی بنا دیا، مگر ساتھ ہی ہدایت کر دی کہ وہ تمہارے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں؟

ابن جبیر:۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے۔

حجاج:۔ کیا میں نے تم کو اپنا ندیم خاص نہیں بنایا، حالانکہ میرے خاص اہل مجلس سب عرب کے بڑے بڑے سردار تھے؟ ابن جبیر:۔ یہ بھی درست ہے۔

حجاج:۔ کیا میں نے پہلی ہی ملاقات میں تم کو ایک لاکھ کی بیش قرار رقم نہیں دی کہ تم اس کو اربابِ ضرورت پر خرچ کرو۔ پھر میں نے تم سے اس کا کوئی حساب بھی نہیں مانگا؟

ابن جبیر:۔ بیشک یہ بھی بجا ہے۔

حجاج:۔ پھر ان احسانات کے باوجود تم کو میری مخالفت پر کس چیز نے آمادہ کیا؟

ابن جبیر:۔ عبدالرحمٰن بن اشعث کی بیعت نے جس کا طوق میری گردن میں تھا۔

حجاج یہ سن کر قابو سے باہر ہو گیا، اور کہنے لگا "کیا پہلے سے امیر المومنین عبدالملک کی

بیعت کا طوق تمہاری گردن میں نہیں تھا، بخدا! اب میں تم کو قتل کیے بغیر نہیں رہونگا۔

ابن جبیر:۔ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے جو وقت مقرر کر دیا ہے، میں اُس پر ضرور اسکے پاس پہنچونگا۔

حجاج نے جلادوں کو حکم دیا کہ ان کو لیجاؤ اور قتل کر دو۔ اس پر ابن جبیر نے کلمۂ تشہد پڑھا اور کہا "اے حجاج اس کو میری طرف سے یاد کر لو، تا آنکہ حشر میں میری اور تمہاری پھر ملاقات ہو"۔ جلاد ابن جبیر کو لے کر چلنے لگے تو انہیں ہنسی آگئی۔ حجاج کو اس کی اطلاع ہوئی تو پوچھا "تمہیں ہنسی کیوں آئی؟" بولے "اللہ کے خلاف تیری جرأت اور تیرے متعلق اللہ کی شانِ بردباری دیکھ کر!" انھوں نے یہ کہہ کر قبلہ کی طرف رُخ کیا اور پڑھا اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

حجاج ابن جبیر کا قبلہ رو ہونا بھی برداشت نہیں کر سکا۔ حکم دیا "قبلہ سے ان کا رُخ پھیر دو" فرمایا:۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ — تم جس طرف بھی اپنا رُخ کروگے اللہ اُدھر ہی ہوگا، بیشک اللہ وسیع اور علیم ہے۔

حجاج نے حکم دیا "انہیں زمین کے بل لٹا دو" ابن جبیر نے پڑھا:۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی۔ — ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹا دینگے، اور پھر دوسری مرتبہ اسی سے نکالینگے۔

غیر معمولی استقامت

آخر کار حجاج نے حکم دیا کہ "قتل کر دیے جائیں"۔ یہ حکم سُن کر ایک شخص رونے لگا۔ ابن جبیر نے پوچھا "کیوں روتے ہو؟" وہ بولا "آپ کے قتل پر" فرمایا "اس پر رونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ کو یہ واقعہ پہلے سے معلوم ہے، پھر یہ آیت پڑھی:۔

ــــــــــــــ

ؔیہ واقعہ طبری ج ۸، ابن اثیر ج ۴ اور ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۵-۲۰۶ میں اسی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ ہم نے موقع و محل گفتگو کے پیش نظر کسی قدر تفصیل بدل دی ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ — زمین میں یا تمہارے نفسوں پر جو مصیبتیں نازل
وَلَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ — ہوتی ہیں، وہ سب کتاب میں اُن کے پیدا
قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا — کرنے سے پہلے لکھ دی گئی تھیں۔

عمرو بن سعید کہتے ہیں کہ ابن جبیرؒ نے مقتل میں جانے سے پہلے اپنے صاحبزادے کو بلایا، وہ آئے تو باپ کو دیکھ کر رونے لگے حضرت ابن جبیر نے فرمایا "بیٹے! روتے کیوں ہو؟ تمہارے باپ کی عمر ستاون سال کی تو ہوگئی، اب اس کے بعد زندہ رہنا کیا ضروری تھا"۔

قتل ہونے کا وقت قریب آیا تو حجاج نے پھر پوچھا "بولیے آپ کس کروٹ قتل ہونا چاہتے ہیں" فرمایا "قصاص تیرے سامنے ہے، جیسا کریگا ویسا پائیگا۔ اب جس طرح تو پسند کرے کر" جلاد شمشیر برہنہ لیے ہوئے پہلے سے موجود تھا۔ حجاج کی زبان سے قتل کا حکم نکلنا تھا کہ جلاد کی تلوار دفعۃً ابن جبیرؒ کے سر پر چمکی اور عشقِ الٰہی کے سودا سے بھرا ہوا سر کلمۂ لا اِلٰہ اِلّا اللہ پڑھتا ہوا زمین پر آگرا۔

شہادت کے بعد کے حالات

قتل ہونے سے پہلے حضرت ابن جبیر نے دعا کی تھی "اے اللہ میرے بعد تو حجاج کو کسی پر مسلط نہ کر کہ وہ اس کو قتل کر سکے" یہ دعا مقبول ہوئی، چنانچہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ابن جبیر کی شہادت کے چھ ماہ بعد حجاج بھی مرگیا، اور ان چھ مہینوں میں کسی اور کو قتل نہ کر سکا، شہادت کے وقت ایک عجیب واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حضرت ابن جبیر کے جسم سے عام مقتولوں کے برخلاف خون زیادہ نکلا، یہاں تک کہ بہہ کر حجاج کے جائے نشست کے نیچے آگیا۔ حجاج کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اس نے فوراً اطباء کو بلا کر وجہ دریافت کی انہوں نے

کہا "خون، روح کے تابع ہوتا ہے، تم نے اس سے پہلے جن لوگوں کو قتل کیا ہے خوف و دہشت کی وجہ سے اُن کی روح پہلے ہی پرواز کر چکی تھی، پھر اُن میں خون کہاں سے آتا؛ لیکن ابن جبیر کا معاملہ ان کے برعکس تھا، اُن پر خوف و دہشت طاری نہیں ہوئی اور قتل کے وقت روح اُن کے اندر موجود تھی[1]۔

یہ واقعہ شہادت شعبان ۹۴ھ میں پیش آیا۔ سمعانی کے نزدیک اُس وقت اُنکی عمر ترپّن سال کی، اور ابن قتیبہ کی رائے میں اُنچاس ۴۹ سال کی تھی[2]۔

حجاج پر اثر

حضرت ابن جبیر کا خونِ ناحق رنگ لایا، اور حجاج پر عرصۂ زیست تنگ ہو گیا۔ حجاج مرض الموت میں مبتلا تھا کہ خواب میں اُنہیں دیکھا کہ اُس کے کپڑے پکڑ کے کھینچ رہے ہیں اور کہتے ہیں "اے دشمنِ خدا! تو نے مجھ کو کیوں قتل کیا تھا" حجاج یہ خواب دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا، اور آنکھ کھلی تو اُس وقت بھی اُس کا بدن خوف سے کانپ رہا تھا، اُس پر بار بار سکرات الموت طاری ہوتے تھے اور جب ذرا ہوش آتا تھا تو کہتا تھا "میں اپنے اور ابن جبیرؒ کے معاملہ کو کیا کروں؟" اسی طرح کا ایک وحشت انگیز خواب عبدالملک نے بھی دیکھا تھا[3]۔

حسن بصریؒ پر اثر

حضرت ابن جبیر کے اس قتلِ ناحق نے اکابر تابعین میں غم و ماتم کی صفیں بچھا دیں حضرت حسن بصری نے فرمایا "اے خدا! ثقیف کے فاسق (حجاج) سے اس کا انتقام لے۔ خدا کی قسم اگر تمام روئے زمین کے رہنے والے ان کے قتل میں شریک ہوتے تب بھی خدا اُن کو منہ کے بل دوزخ میں جھونک دیتا[4]۔

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۱ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۶۔ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۶ [4] ایضاً۔

مزار حضرت سعید کا مزار شہر واسط میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے، جہاں اُن کا جسم مبارک سپردِ خاک کر دیا گیا تھا، لوگ اُس سے برکت حاصل کرتے ہیں[۱]۔

حلیہ حلیہ یہ تھا۔ رنگ سیاہ، سر اور داڑھی دونوں سپید، خضاب لگانا پسند نہ کرتے تھے[۲]۔ عمامہ باندھتے تھے اور پیچھے کی جانب ایک بالشت شملہ چھوڑ دیا کرتے تھے[۳]۔

اولاد اولاد میں تین لڑکے تھے۔ عبداللہ، محمد اور عبدالملک[۴]۔

سلیمان بن یسار

نام و نسب سلیمان نام، ابوایوب کنیت۔ اُم المومنین حضرت میمونہ کے غلام تھے۔ اُنھوں نے اُن کو مکاتب کر دیا تھا اس غلامی کے توسل سے اُن کو حرم نبوی میں آنے جانے کا شرف حاصل تھا۔ جب تک آزاد نہیں ہو گئے ازواجِ مطہرات نے اُن سے پردہ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں، میں نے ایک دفعہ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کی، آپ نے آواز پہچان کر فرمایا "تم نے بدلِ کتابت ادا کر دیا یا نہیں؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں! ابھی تھوڑا سا باقی ہے"۔ ارشاد ہوا "اندر چلے آؤ جب تک تمہارے ذمہ کچھ بھی باقی ہے تم غلام رہو گے"۔

فضل و کمال حضرت سلیمان خداداد ذہانت و جوہرِ قابل رکھتے تھے۔ پھر خانوادۂ نبوت میں بود و باش نے اُن کے جوہر کو اور چمکا دیا تھا۔ اس بنا پر وہ مدینہ کے ممتاز ترین علماء میں ہو گئے۔ ابن سعد فرماتے ہیں "وہ ثقہ عالم، بلند مرتبت فقیہ، کثیر الحدیث تھے"، اور لوگوں کا ان کی جلالتِ شان و کثرتِ علم پر اتفاق ہے، اُن کا شمار مدینہ کے فقہاءِ سبعہ میں ہوتا تھا۔ ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں "سلیمان

---

[۱] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۱۰ [۲] ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۶ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲ [۴] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۱۷

بن یسار مدنی ثقہ، قابل اعتماد و اعتبار اور فاضل و عابد تھے۔

قرأت حضرت سلیمانؒ کو تمام علوم دینیہ، قرآن، حدیث، فقہ میں کمال حاصل تھا، مدینہ کے مشہور قرا میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وکان من فقہاءِ المدینۃ وقرائھم[1] — حضرت سلیمان مدینہ کے فقہا اور قرا میں سے تھے

فقہ قرأت کی طرح فقہ میں بھی کمال تھا، اس میں اُن کو امامت و اجتہاد کا مرتبہ حاصل تھا۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وکان من ائمۃ الاجتہاد"[2] وہ اجتہاد کے اماموں میں سے تھے۔ سعید بن المسیبؒ عہد تابعین کے نامور فقیہ تھے، مگر اُن کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو وہ اُس کو حضرت سلیمان کے پاس بھیج دیتے تھے اور فرماتے تھے آج جو علما باقی رہ گئے ہیں سلیمان بن یسار اُن سب میں بڑے عالم ہیں۔[3] امام نسائی نے اُن کو امام تسلیم کیا ہے۔ محمد بن حنفیہؒ کے صاحبزادے حسن فرماتے تھے "سلیمان ابن یسار ابن مسیب سے زیادہ سمجھدار (افہم) ہیں"۔ ابو الزناد فرماتے تھے "سلیمان ان سات فقہا میں سے ہیں جو ارباب فقہ و صلاح اور اصحاب فضل ہیں"۔ امام مالک نے اُن کا مرتبہ حضرت ابن مسیب کے بعد تسلیم کیا ہے۔

مسائل طلاق کے بہترین عالم تھے۔ قتادہ کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ مدینہ گیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں مسائل طلاق کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے سلیمان بن یسار کا نام بتایا۔"[4]

حدیث حضرت سلیمان جس خانۂ اقدس کی غلامی کا شرف رکھتے تھے وہ حدیث کا سرچشمہ تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ اس سے زیادہ سیراب ہوئے۔ چنانچہ علامہ ابن سعد ان کو "کثیر الحدیث" لکھتے ہیں۔ ابو زرعہ بھی انہیں "ثقہ" کہتے ہیں، ان کے خاص اساتذہ حسب ذیل ہیں۔

اُم المومنین حضرت عائشہ و حضرت میمونہ، حضرت ام سلمہ، فاطمہ بنت قیس، حمزہ بن عمرو الاسلمی

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۵ [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹ [4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۲

زید بن ثابت، ابن عباس، ابن عمر، جابر، مقداد بن اسود، ابو رافع، ابو سعید، ابو ہریرہ، ربیع بنت معوذ، سلمہ بن صخر، فضل بن عباس۔

تلامذہ: تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

عمرو بن دینار، عبداللہ بن دینار، عبداللہ بن الفضل، ابو الزناد، سالم ابو النضر، صالح بن کیسان، عمرو بن میمون، محمد بن ابی حرملہ، زہری، مکحول، نافع مولیٰ ابن عمر، یحییٰ بن سعید انصاری، یعلی بن حکیم، یونس بن سیف وغیرہ[1]

زہد و اتقاء: ان علمی خوبیوں کے باوجود عمل و ورع کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام کے مالک تھے، ابو زرعہ کا مقولہ گذر چکا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ سلیمان بن یسار مدینہ کے فاضل اور زاہد و متقی تھے عجلی فرماتے تھے:۔

مَدَنی تابعی ثقۃٌ مامونٌ فاضلٌ عَابِدٌ[2]

وہ مدنی تھے، تابعی، معتمد و معتبر، مامون فاضل، اور عبادت گذار

تمام فضائلِ اخلاق کا منبع خشیت ربانی ہے، یہ اُس سے بھرپور تھے مصعب بن عثمان فرماتے ہیں کہ سلیمان بہترین خوش رو نوجوان تھے، ایک مرتبہ ان کے پاس ایک عورت آئی اور اُس نے اپنی باتوں سے اُن کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا، حضرت سلیمان نے اُس کی مقاومت کی اور گھر سے نکل کر بھاگ گئے[3]"

حضرت میمونہ نے اپنا ولاء حضرت ابن عباس کو مرحمت کر دیا تھا۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۸-۲۲۹ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۳۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۵۔

وفات زمانۂ وفات کے متعلق بڑا اختلاف ہے۔ غالب یہ ہے کہ سنہ ۱۰۷ھ میں وفات پائی جبکہ آپ کی عمر تہتر سال کی تھی[1]

حضرت مجاہد بن جبیر

نام و نسب مجاہد نام، ابو الحجاج کنیت۔ عبد اللہ بن ابی السائب المخزومی کے غلام تھے[2] حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں سنہ ۲۱ھ میں پیدا ہوئے[3]

فضل و کمال حضرت مجاہد غلام تھے مگر علم و فضل کے مہر درخشاں تھے، امام نووی لکھتے ہیں "وہ تابعی امام ہیں، اور اُن کی جلالت و امامت پر سب کا اتفاق ہے[4]۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وکان احد اوعیۃ العلم وہ علم کا ایک ظرف تھے[5]۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "کان فقیہاً عالماً ثقۃً کثیر الحدیث" وہ فقیہہ عالم معتبر اور کثیر الحدیث تھے[6]۔ تفسیر، حدیث اور فقہ ان سب میں کمال حاصل تھا۔

تفسیر انہوں نے حبرِ اُمت، ترجمان القرآن، حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر پڑھی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں "میں نے ابن عباسؓ سے تیس مرتبہ قرآن پڑھا، ایک ایک آیت پر میں رُکتا تھا اور اس کے شانِ نزول اور دوسرے امور سے متعلق سوال کرتا جاتا تھا تعلیم کا شوق اتنا تھا کہ حضرت ابن عمرؓ کی رکاب

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۳ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۔
[4] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۳۔ [5] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [6] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۶

پکڑ پکڑ کے کھڑے ہو جاتے، اور سوالات کرنے لگتے تھے[۱]۔ حضرت ابن عباسؓ و ابن عمرؓ کی توجہ خاص نے انھیں اپنے عہد کا بڑا مفسر بنا دیا۔ مصعب فرماتے ہیں۔

کان اعلمھم بالتفسیر مجاھدٌ و بالحج عطاء ۔ تابعین میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد اور مسائل حج کے بڑے عالم

قتادہ نے کہا "جو علماء باقی رہ گئے ہیں اُن میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد ہیں[۲]۔ خصیف نے بھی اُن کو اعلمھم بالتفسیر تسلیم کیا ہے۔ حافظ ذہبی اُن کو "امام مفسر" لکھتے ہیں[۳]۔ معلوم ہوتا ہے کہ امم سابقہ اور تاریخ قدیم سے متعلق اہل کتاب سے بھی سوالات کرتے رہتے تھے، چنانچہ اعمش سے کسی نے پوچھا کہ لوگ تفسیر مجاہد کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ فرمایا "اُن کا خیال ہے کہ وہ اہل کتاب سے پوچھتے تھے[۴]"

قرأت | تفسیر کے ساتھ فنِ قرأت کے بھی عالم تھے۔ علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر اُن کو مقری لکھتے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت سے واقف نہیں تھے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ "اگر میں نے ابنِ مسعود کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھا ہوتا تو مجھ کو بہت سے مواقع پر حضرت ابنِ عباسؓ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی[۵]"

حدیث | حدیث میں اُن کو حفاظ کا مرتبہ حاصل تھا۔ امام ذہبی اُن کو "حافظِ حدیث" اور امام نووی "امام حدیث" لکھتے ہیں۔ ابن سعد نے اُنھیں "کثیر الحدیث" لکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اُن کے حفظ کے اس درجہ معترف تھے کہ فرماتے تھے "کاش نافع (مولی ابن عمرؓ) کا حفظ بھی تمہاری طرح ہوتا[۶]"

مجاہد حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے تھے۔ اکابر صحابہ اس وقت موجود تھے، چنانچہ انہوں نے حضرات ذیل سے حدیث حاصل کی: حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۴۳ [۲] ایضاً [۳] تذکرۃ الحفاظ [۴] تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۴۳ [۵] ایضاً [۶] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵۔

بن عمرو بن العاصؓ، ابو سعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، سعید بن ابی وقاصؓ، رافع بن خدیجؓ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، جویریہ بنت الحارث، ام ہانیؓ۔ تابعین میں عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، طاؤس، عبداللہ بن السائب، عبداللہ بن سجزۃ، عبدالرحمن بن صفوان، عمر بن اسود، مورق العجلی وغیرہم سے تلمذ رکھتے تھے۔

تلامذہ | اُن کے خوشہ چینانِ علم کا دائرہ وسیع تھا۔ جن میں لائق ذکر حسب ذیل حضرات ہیں:۔

ایوب سختیانی، عطاء، عکرمہ، ابنِ عون، عمرو بن دینار، ابو اسحٰق سبیعی، ابو الزبیر مکی، یونس بن ابی اسحاق، قتادہ، عبید اللہ بن ابی یزید، ابان بن صالح، سلیمان الاعمش، سلیمان الاحول، مسلم البطین، طلحہ بن مصرف، عبداللہ بن کثیر القاری[1]۔

فقہ | قرآن و حدیث میں بصیرت رکھنے کے باعث فقہ میں بھی امتیازِ خاص رکھتے تھے چنانچہ ابن حبان فرماتے ہیں:

کان فقیھاً ورعاً عابداً متقناً — مجاہد فقیہ، پرہیزگار، عبادت گذار، اور پختہ علم والے تھے۔

امام نووی، حافظ ابن حجر، علامہ ذہبی تینوں اُن کے تفقہ پر متفق ہیں۔ علامہ ابن قیم نے مکہ کے مفتیانِ کرام کے جہاں نام گنائے ہیں وہاں مجاہد بن جبیر کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔

زہد و ورع | ان علمی کمالات کے ساتھ عملی فضائل و اخلاق کے بھی جامع تھے۔ ابنِ حبان کا قول اوپر گذر چکا ہے جس میں وہ مجاہد کو ورعاً عابداً کہتے ہیں۔ اُنکے ہر کام میں خلوص ہوتا تھا، سلمہ بن کہیل کہتے ہیں میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے علم خالصاً لوجہ اللہ حاصل کیا ہو، مگر عطاءؒ، طاؤس اور مجاہد کو[3]۔

دنیا سے بے تعلقی | جس کو علم کی حقیقی لذت اور عبادتِ الٰہی کا ذوق لطیف میسر آجائے دنیا سے اُسے کیا دلچسپی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہدؒ بھی بسا اوقات دنیوی علائق سے الگ تھلگ رہنے کے باعث غمگین نظر آتے تھے۔ اعمش کا بیان ہے" ان سے کسی نے غمگین رہنے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳ [2] اعلام الموقعین جز اول مطبع منیری ص ۱۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳۔

"ایک مرتبہ حضرت ابن عباس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ تھام کر فرمایا" تم دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی پردیسی یا راستہ عبور کرنے والا رہتا ہے[1]۔

فصاحت وبلاغت کلام نہایت فصیح و بلیغ اور شیریں ہوتا تھا۔ اعمش فرماتے ہیں کہ جب مجاہد بولتے تھے تو ان کے منہ سے موتی برستے تھے[2]۔

وضع میں سادگی ظاہری زیبائش اور آرائش سے نفور تھے۔ اعمش فرماتے ہیں: میں مجاہد کو دیکھتا تھا، تو ان کی ظاہری حالت کے باعث انہیں حقیر سمجھتا تھا، وہ اپنی ظاہری وضع سے ایک مالکِ خر معلوم ہوتے تھے جس کا گدھا گم ہو گیا ہو، اور وہ اس کی وجہ سے غمگین بیٹھا ہو[3]۔

عجائبِ عالم کا شوق عجائباتِ عالم کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا جس کسی عجیب چیز کا ذکر سنتے تھے اس کو دیکھنے جاتے تھے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے ان کے چاہِ بابل پر جانے اور وہاں ہاروت و ماروت کو دیکھنے کا ذکر کیا ہے، ہمارے خیال میں اس روایت میں رنگینیٔ عنوان کا بھی دخل ہے۔

وفات سنہ وفات میں روایات مختلف ہیں ۱۰۲ھ یا ۱۰۳ھ میں ٹھیک اس وقت جبکہ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز تھے، جاں جانِ آفریں کے سپرد کر دی، وفات کے وقت عمر تراسی سال کی تھی[4]۔

عطاء بن ابی رباح

نام و نسب عطا نام والد کا نام اسلم تھا اور ابو رباح کنیت۔ خود حضرت عطا کی کنیت ابو محمد تھی یمن

---

۱ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵ ۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۳ ۳ ایضاً ص ۸۶ و ۸۷ ۴ ایضاً

کے ایک مقام جند میں ۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا عہد تھا، ابتدائی تربیت مکہ معظمہ میں ہوئی۔ آل میسرہ بن ابی خثیم فہری کے غلام تھے۔

فضل و کمال فضل و کمال اور زہد و اتقاء کے لحاظ سے بڑے بلند مرتبت تابعی تھے۔ ابن سعد فرماتے ہیں:۔

کان ثقۃ فقیہاً عالماً کثیر الحدیث[۱] وہ بڑے معتبر فقیہہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے۔

حافظ ابن حجرؒ انہیں یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

وکان من سادات التابعین فقہاً وعلماً وورعاً وفضلاً۔[۲] عطاء فقہ، علم، ورع اور فضل کی وجہ سے سادات تابعین میں سے تھے۔

علامہ نووی فرماتے ہیں" وہ مکہ کے مفتی اور مشہور امام تھے، بڑے بڑے ائمہ ان کے علمی کمالات کے معترف تھے[۳]" امام احمد بن حنبل فرماتے تھے" علم کا خزانہ خدا اُسی کو دیتا ہے جسے محبوب رکھتا ہے، اگر علم کسی کے ساتھ مخصوص ہوتا تو عالی نسب اس کے زیادہ حقدار تھے۔ مگر عطا حبشی غلام تھے۔ یزید بن حبیب نوبی، حسن بصری اور ابن سیرین غلام تھے[۴]"

قرآن حضرت عطاء، ایک حبشی اور بدشکل غلام تھے، لیکن وہ جن بزرگوں کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے انہوں نے ان کو قرآن کی تفسیر، حدیث اور فقہ، غرض کہ تمام متداولہ اسلامی علوم میں ماہر بنا دیا تھا، مگر قرآن کے ساتھ شغف زیادہ تھا۔ اس کا مستقل درس دیتے تھے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں انہ' کان یُعلم الکتاب[۵]

---

[۱] ابن سعد۔ ج ۵ ص ۳۴۴ [۲] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۳ [۳] تہذیب الاسماء نووی ج ۱ ص ۳۳۳۔
[۴] مختصر صفوۃ الصفوۃ ص ۱۵۸ [۵] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴۔

حدیث | قرآن کی طرح حدیث کے بھی امام تھے، انہوں نے عبادلۂ اربعہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے اور دوسرے جلیل القدر صحابۂ کرام حضرت معاویہ، اُسامہ بن زید، جابر بن عبداللہ، زید بن ارقم، عبداللہ بن السائب مخزومی عقیل بن ابی طالب، عمرو بن ابی سلمہ، رافع بن خدیج، ابو درداء، ابوہریرہ، ابو سعید خدری، ام المومنین حضرت عائشہ، اور اُم ہانی اور ام سلمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سماع حدیث کی تھی[1]۔

تلامذہ | ان کے دامانِ تربیت سے جو حضرات فیضیاب ہو کر نکلے اُن کی فہرست بڑی طویل ہے اُن میں زیادہ مشہور یہ ہیں:۔ ابو اسحٰق السبیعی، مجاہد، زہری، اعمش، اوزاعی، ابن جریج، عمرو بن دینار، ابن اسحاق، یزید بن ابی حبیب، سلمہ بن کہیل، امام ابو حنیفہ، عبدالملک بن ابی سلیمان، قتادہ[2]۔

احترام حدیث | سماع و درس کے وقت حدیث کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے، یہاں تک کہ حدیث کی روایت کے درمیان میں اگر کوئی بولتا تھا تو سخت ناگوار گذرتا تھا، معاذ بن سعید الاعور کہتے ہیں، ایک مرتبہ ہم حضرت عطاء کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے کوئی حدیث بیان کرنی شروع کی، درمیان میں ایک شخص نے اُس کو ٹوک دیا۔ عطاء کو یہ دیکھ کر غصہ آگیا، فرمایا "یہ کیا اخلاق ہیں کیسی طبیعتیں ہیں، بخدا بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتا ہے تو اگرچہ میں اُس کا اُس سے زیادہ عالم ہوتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس نے وہ حدیث خود مجھ ہی سے سُنی ہو تاہم میں اُس کو بڑی خاموشی سے سُنتا ہوں اور اُس پر یہ ظاہر کرتا ہوں کہ گویا میں نے وہ حدیث اُس سے قبل کسی سے سُنی ہی نہیں"۔ عمرو بن العاصم کہتے ہیں میں نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مبارک سے بیان کی تو فرمایا "بخدا میں اپنا جوتہ نہیں اُتاروں گا جب تک کہ اس کو خود دھدی سے نہیں سُن لوں گا[3]"۔

[1] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۹۹ [2] ایضاً [3] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵۔

فن حدیث میں اُن کا مرتبہ

امام نووی فرماتے ہیں "لوگ اُن کی توثیق، جلالت اور امامت پر متفق ہیں۔
امام محمد الباقر فرماتے تھے "جہاں تک ہو سکے عطا کی حدیثیں لو۔" حافظ ذہبی اُن کو مفتی اہل مکہ ومحدث شہر اور ابن سعد انہیں "کثیر الحدیث" لکھتے ہیں۔

فقہ

قرآن وحدیث کی مہارت نے اُن کو فقہ کا بھی امام بنا دیا تھا، اُن کے عہد کے بڑے بڑے ائمۂ فقہ اُن کی فقاہت پر متفق ہیں۔ عمرو بن سعید کی والدۂ محترمہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر مکہ میں تشریف لاتے تو لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر متفرق مسائل دریافت کرتے تھے۔ آپ فرماتے "تم میرے لیے مسائل جمع کر رکھتے ہو، حالانکہ تمہارے پاس ابن ابی رباح موجود ہیں۔" ربیعہ خود بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، مگر وہ بھی فرماتے تھے۔ "عطا رفتوی میں تمام اہل مکہ سے سبقت لے گئے ہیں۔" ابراہیم بن کیسان کا بیان ہے کہ خلفاء بنو امیہ قافلہ حج میں اعلان کرا دیتے تھے کہ عطا کے سوا کوئی دوسرا شخص فتویٰ نہ دے۔

حضرت ابن عمرؓ کی طرح حضرت ابن عباسؓ بھی فرمایا کرتے تھے۔

یا اھل مکۃ تجتمعون علی وعندکم عطاء اے اہل مکہ تم میرے پاس جمع ہو جاتے ہو، حالانکہ تمہارے پاس عطا ہیں۔

امام ابو حنیفہ کا ارشاد ہے "میں نے عطاء سے افضل کسی کو نہیں پایا۔" محمد بن عبداللہ الدیلج کہتے تھے "میں نے عطاء سے بہتر کوئی مفتی نہیں دیکھا۔ ان کی مجلس ذکر الٰہی کی مجلس ہوتی تھی، ان سے جو بات پوچھی جاتی اُس کا جواب بہت عمدہ طریقہ پر دیتے تھے۔"

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۴۳۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۴۳ [3] ایضاً [4] ایضاً
[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲ [6] ایضاً [7] ایضاً

اپنے عہد میں فتویٰ کے مرکز تھے۔ علامہ ابن سعد فرماتے ہیں "کہ اہل مکہ کے مفتی صرف دو بزرگ تھے ایک مجاہد اور دوسرے عطا، مگر عطا مجاہد پر بھی سبقت لے گئے تھے"[۱]

مناسک حج کا علم یوں تو فقہ کی تمام جزئیات پر مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے مگر خصوصیت سے مسائل حج کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلم المنقری کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ابوجعفر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ناگاہ عطا بن ابی رباح گذرتے ہوئے نظر آئے۔ اس پر ابوجعفر بولے "اب روئے زمین پر کوئی شخص عطا، سے زیادہ مناسکِ حج کا علم رکھنے والا نہیں ہے"[۲] قتادہ فرماتے تھے "عطا ان بزرگوں میں سے ہیں جو مناسکِ حج کے بڑے عالم تھے"[۳] خلفاءِ عہد مناسک حج کی تعلیم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک خدمت اقدس میں خود حاضر ہوا، اور آپ نے اس کو مناسک حج کی تعلیم دی[۴]

حضرتِ عطا، کے فیضِ صحبت سے معمولی حیثیت کے انسان مسائلِ حج کے خاصے عالم ہو جاتے تھے اس سلسلہ میں ابن خلکان نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے، وہ یہ ہے:۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں "ایک مرتبہ حج کے ارکان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سر کا حلق کرانا چاہا، ایک حجام مل گیا، میں نے پوچھا، کیا لوگے؟ بولا "عبادات میں شرط نہیں ہوتی، تم بیٹھ کر خط بنوالو" میں ذرا قبلہ سے مڑ کر بیٹھ گیا، حجام نے یہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ رو بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر میں نے چاہا کہ حجام سر کے بائیں جانب سے آغاز کرے تو اس پر اس نے کہا، "اپنی داہنی جانب ادھر کردو" وہ برابر سر کا حلق کرتا رہا اور میں خاموش تھا۔ وہ بولا "تکبیر کہو" چنانچہ

---

[۱] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [۲] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [۳] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵ [۴] مختصر صفوۃ الصفوۃ ص ۱۵۹

پھر تکبیر کہی، حلقِ رأس سے فراغت کے بعد میں نے چاہا کہ اپنے کجاوہ کی طرف چلا جاؤں، اُس نے پوچھا "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا "جائے قیام پر" کہنے لگا "دو رکعتیں تو پڑھ لو پھر چلے جانا"

امام اعظم فرماتے ہیں اس شخص کی یہ باتیں سن کر میں نے خیال کیا کہ یہ سب معلومات ضرور اس کو کسی سے حاصل ہوئی ہیں، چنانچہ میں نے اُس سے دریافت کیا تو اُس نے کہا "میں نے عطاء بن ابی رباح کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے"[1]

بیوع کا علم مناسکِ حج کے علاوہ کتاب البیوع کے بھی عالم متبحر تھے، خود اُن کے صاحبزادہ یعقوب ابن عطاء فرماتے ہیں "میرے باپ کو خرید و فروخت کے مسائل سب مسائل سے زیادہ محفوظ تھے"[2]

افتاء میں احتیاط مگر اس کمالِ تفقہ کے باوجود جو بات اُن کو معلوم نہیں ہوتی تھی اُس میں اپنی رائے کو دخل نہیں دیتے تھے۔ عبد العزیز بن رفیع کا بیان ہے "ایک مرتبہ عطاء سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو اُنہوں نے فرمایا "میں نہیں جانتا" لوگوں نے کہا "تو پھر کیا آپ اپنی رائے نہیں بتائیں گے"۔ فرمایا "مجھ کو اللہ سے اس بات میں شرم آتی ہے کہ زمین میں میری رائے کی اطاعت کی جائے"[3]۔ تاہم جب کبھی وہ رائے سے کام لیتے تھے، اُس کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ ابن جریج کہتے ہیں "عطاء کوئی بات بیان کرتے تو میں پوچھتا "یہ علم ہے یا رائے ہے؟" اگر وہ کسی صحابی کا اثر ہوتا تو فرماتے "علم"[4] ورنہ رائے ہوتی تو صاف کہہ دیتے "یہ رائے ہے"

خلوص و للہیت علم کے لیے وجاہت طلبی یا کسی اور دنیوی غرض سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہوتا، حضرت عطاء انتہا درجہ بے لوث تھے۔ سلمہ کہتے ہیں "میں نے صرف تین بزرگ دیکھے ہیں جنہوں نے علم خالصتہً

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۹ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵ [3] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۲ [4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۵

کو جا اللہ حاصل کیا ہے۔ طاؤس، مجاہد، اور عطاء[1]۔

فراست ان میں فراست و ذکاوت بھی غیر معمولی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت حسن بصری نے اپنی مجلس میں فرمایا "منافق کی تین خاص علامتیں ہیں: کوئی بات کہے تو جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، اور وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے"۔ جناب عطاء نے یہ سنا تو فرمایا "یہ تینوں عادتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں موجود تھیں۔ انہوں نے بات جھوٹ کہی، امانت میں خیانت کی، اور وعدہ کرکے اس کی خلاف ورزی کی لیکن اس کے باوجود اللہ نے ان کی نسل میں نبی پیدا کیا"۔ حسن نے یہ سن کر فرمایا "وفوق کل ذی علم علیم"۔ ہر صاحب علم کے اوپر ایک علم والا ہے[2]۔

فصاحت و بلاغت اور پرگوئی حضرت عطاء زیادہ تر خاموش رہتے تھے، اور اگر بولتے بھی تھے تو ذکر اللہ کے سوا کوئی اور چیز مذکور نہیں ہوتی تھی، اور اس انداز میں اس کو بیان کرتے تھے کہ خدا کی طرف سے تائید معلوم ہوتی تھی۔ اسماعیل بن امیہ شہادت دیتے ہیں: کان عطاء یطیل الصمت فاذا تکلم یخیل الینا انہ یؤید[3]۔ کوئی شخص کوئی سوال کرتا تو جواب بڑی پرگوئی سے دیتے تھے۔ حافظ ذہبی ان کو "فصیح کثیر العلم" لکھتے ہیں[4]۔

ہر دلعزیزی ان اوصاف و کمالات نے ان کو لوگوں میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز بنا دیا تھا، امام اوزاعی کا بیان ہے جس دن عطاء کا انتقال ہوا وہ روئے زمین پر سب لوگوں سے زیادہ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۱ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۱
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰ [5] ایضاً۔

پسندیدہ تھے[1]

سعید بن ابی عروبہ کہتے تھے "کسی مسئلہ پر اگر حسن، سعید بن المسیب، ابراہیم، اور عطاء جو انصار کے ائمہ ہیں جمع ہو جائیں تو پھر مجھ کو کسی مخالف کا ڈر نہیں ہے[2]"

زہد و ورع | علم و فضل کے بحر بے کراں ہونے کے ساتھ اُن میں زہد و ورع بھی اسی درجہ کا تھا۔ حافظ ذہبی کا ارشاد ہے "عطاء کے زہد، خدا پرستی اور علم کے مناقب بہت ہیں[3]۔ حافظ ابن حجر کا مقولہ پہلے گذر چکا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں: "عطاء علم اور ورع کے لحاظ سے سادات تابعین میں شمار کیے جاتے تھے"۔ والدین کے انتقال کے بعد اپنی وفات تک برابر اُن کی طرف سے مساکین کو کھانا کھلاتے رہے۔ ابو نعیم کہتے ہیں یہ اُن کی طرف سے صدقۃ الفطر تھا[4]۔

قوت ایمانی | تمام نیکیوں اور اعمال صالحہ کی اصل ایمان ہے، یہ اگر نہ ہو تو عند اللہ کسی عمل کا اعتبار نہیں۔ حضرت عطاء اس میں بھی نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔ عبدالرحمن فرماتے ہیں "اللہ کی قسم میں تمام روئے زمین کے لوگوں کا ایمان حضرت ابوبکر کے ایمان کے اور تمام اہل مکہ کا ایمان حضرت عطاء کے ایمان کے برابر نہیں دیکھتا[5]"

عبادت | عبادت کا عالم یہ تھا کہ بیس[6] برس تک مسجد کا فرش اُن کا بستر رہا[7]۔ تہجد میں روزانہ دو سو یا اس سے زائد آیات پڑھتے تھے۔ ابو معاویۃ المغربی کہتے تھے میں نے سجدہ کے نشان حضرت عطاء کی دونوں آنکھوں کے درمیان دیکھے ہیں[8]۔ گویا وہ اس طرح اُن بزرگوں کی صف میں داخل تھے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۱ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲ [4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶۔ [5] ایضاً ص ۳۴۵ و ۳۴۶ [6] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۲ [7] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶۔

جن کے متعلق قرآن مجید نے "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" کی شہادت دی ہے، اُن کا کوئی وقت اللہ کے ذکر سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ محمد بن عبداللہ الدیباج کا بیان ہے۔

انما کان مجلسہ ذکر اللہ لا یفتر[1]	ان کی مجلس اللہ کا ذکر ہوتا تھا جس میں وہ کبھی تساہل نہیں کرتے تھے۔

نماز نہایت خشوع وخضوع سے ادا کرتے تھے۔ وکان من احسن الناس صلوٰۃ[2]۔

حج — مستقل قیام گاہ مکہ معظمہ ہی تھا۔ تقریباً ہر سال حج کرتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں انہوں نے ستر حج کیے تھے[3]۔

اتباعِ حدیث — اتباعِ حدیث کا بڑا اہتمام کرتے تھے، امام شافعی اُن کو اس طرح داد دیتے ہیں۔

ولیس فی التابعین احد اکثر اتباعاً للحدیث من عطاء[4]	تابعین میں عطاء سے زیادہ کوئی اتباعِ حدیث کرنے والا نہیں تھا۔

خلوت گزینی — تنہائی کو پسند کرتے تھے، بسا اوقات خاموش رہتے تھے۔ کوئی کچھ پوچھتا تو اس کو تشفی بخش جواب دیتے تھے۔

جلالت شان — اُن کے علمی وقار کے سامنے بڑے بڑے لوگ سر تسلیم واطاعت خم کرتے تھے، اور خلفاء کی مجلسوں میں اُن کا ذکر بڑے ادب واحترام سے کیا جاتا تھا۔ قتادہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھ سے سلیمان بن ہشام نے پوچھا "کیا اب مکہ میں کوئی بڑا فاضل ہے؟" میں نے جواب دیا "ہاں!

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص ۹۲ [2] تہذیب التہذیب ج۷، ص ۲۰۲ [3] ابن خلکان ج۱ ص ۳۱۹۔
[4] تہذیب الاسماء ج۱ ص ۳۳۳۔

بڑا فاضل کیا! تمام جزیرۃ العرب میں علم کے لحاظ سے کوئی اُس کی برابر نہیں ہے۔ اور وہ عطاء ابن ابی رباح ہیں[1]۔

متفردات | جس بات کو حق سمجھتے تھے کسے برملا بیان کرتے تھے۔ چنانچہ بعض مسائل کے متعلق اُن کے غرائب مشہور ہیں، مثلاً وہ فرماتے تھے کہ کوئی شخص سفر کی نیت سے چلے تو اُس کے لیے شہر سے باہر نکلنے سے قبل ہی نماز کا قصر جائز ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ ابن منذر وغیرہ کی روایت کے مطابق اُن کی رائے تھی کہ اگر عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں واقع ہو جائیں تو صرف عید کی نماز پڑھی جائے، جمعہ یا ظہر کی نہیں[2]۔

حلیہ | یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو جس طرح معنوی و باطنی محاسن و فضائل سے نوازا تھا، صورت شکل کے اعتبار سے وہ ایسے نہیں تھے، رنگ کوّے کی طرح سیاہ تھا، ناک چپٹی تھی آنکھوں میں کانا پن تھا، جسم پر رعشہ کی کیفیت طاری رہتی تھی، پاؤں میں لنگ تھا، آخر میں نابینا بھی ہو گئے تھے، بال نہ بالکل گھونگریالے تھے اور نہ بالکل صاف سپاٹ بلکہ درمیانی درجہ کے[3]۔

سبحان اللہ! ع خاک کے پردہ میں ہیرے کی کنی ہوتی ہے۔

وفات | مکہ معظمہ میں بعمر اٹھاسی برس ۱۱۵ھ میں وفات پائی۔ میمونؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "افسوس! عطاء اپنے بعد کوئی اپنا مثل چھوڑ کر نہیں گئے"[4]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج، ص ۲۰۱ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۳۴ [3] تہذیب التہذیب ج، ص ۲۰
[4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۶۔

طاؤس بن کیسانؒ

نام و نسب طاؤس نام، ابوعبدالرحمٰن کنیت، بحیر بن ریسان حمیری کے غلام تھے۔ ان کے والد اہل فارس میں سے تھے، آل ہمدان سے موالات کر کے یمن کے مشہور مردم خیز شہر جند میں سکونت اختیار کر لی تھی۔[1]

علم و فضل علم و فضل کے اعتبار سے طاؤس کبار تابعین میں سے تھے، علامہ نووی لکھتے ہیں:-

وھو من کبار التابعین والعلماء والفضلاء الصالحین[2]	وہ کبار تابعین علماء اور فضلاء صالحین میں سے تھے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں "اُن کی جلالت و فضیلت، اور وفور علم پر سب کا اتفاق ہے"[3]

عمرو بن دینار فرماتے تھے "میں نے طاؤس جیسا کوئی نہیں دیکھا" ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں "وہ امام اور تابعین میں سب سے زیادہ حلال و حرام کو جاننے والے تھے"[4]

حدیث حدیث کے جلیل القدر حافظ تھے۔ عبدالملک بن میسرہ نے خود اُن سے نقل کیا ہے کہ میں نے پچاس صحابہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔ جن صحابہ کے سرچشمہ فیض و کرم سے سیراب ہوئے اُن کے اسماءِ گرامی حسب ذیل ہیں:-

حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۵۱ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۳

زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، ام المومنین حضرت عائشہ، سراقہ بن مالک، صفوان بن امیہ، جابر رضی اللہ عنہم۔[1]

حبر امت حضرت عبداللہ بن عباس کے تلمیذ خاص تھے۔ ابن عیینہ فرماتے ہیں میں نے عبداللہ بن یزید سے پوچھا "تم کس کے ساتھ ابن عباس کے پاس جاتے تھے؟" فرمایا "عطاء اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ" میں نے کہا "اور طاؤس؟" بولے "اوہ! طاؤس تو اُن کے پاس خواص کے ساتھ جاتے تھے"۔[2]

تلامذہ تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، اُن میں جو زیادہ مشہور ہیں وہ یہ ہیں:۔

خود اُن کے صاحبزادہ عبداللہ، وہب بن منبہ، سلیمان التیمی، سلیمان الاحول، ابوالزبیر امام زہری، ابراہیم بن میسرہ، حبیب بن ابی ثابت، حکم بن عتیبہ، حسن بن مسلم، سلیمان بن موسیٰ الدمشقی، عبدالملک بن میسرہ، عمرو بن شعیب، عمرو بن دینار، مجاہد بن جبیر، لیث بن ابی سلیم، عمرو بن مسلم الجندی، قیس بن سعد المکی۔[3]

حدیث میں احتیاط حدیث روایت کرتے تھے تو بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ایک حرف کو صاف طریقہ سے ادا کرتے تھے۔ لیث بن ابی سلیم کہتے ہیں:۔

کان طاؤسٌ یعدُّ الحدیث حرفاً حرفاً طاؤس حدیث کا ایک ایک حرف شمار کرتے تھے۔

یحییٰ بن معین اور ابو زرعہ دونوں ان کو "ثقہ" قرار دیتے ہیں۔[4]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۳ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹
[4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔

فقہ: حدیث کی طرح فقہ میں بھی بڑا پایہ رکھتے تھے۔ ابن خلکان ان کو فقیہ جلیل القدر و نبیہ الذکر بتاتے ہیں[1]۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:۔

کان طاؤس شیخ اھل الیمن	طاؤس اہل یمن کے شیخ، اُن کے لیے برکت
وبرکتھم ومفتیھم لہ جلالۃ[2]	اور اُن کے مفتی تھے۔ اُن کی جلالت شان بہت
عظیمۃ[2]	بڑی ہے۔

قیس بن سعد کہتے تھے "طاؤس کی وقعت ہمارے ہاں وہی ہے جو ابن سیرینؒ کی اہل بصرہ میں ہے[3]"۔ ابن عماد الحنبلی کا قول اوپر گذر چکا ہے کہ طاؤس حلال و حرام کے مسائل تابعین میں سب سے زیادہ جانتے تھے۔

ابن معین سے کسی نے پوچھا "آپ کو طاؤس زیادہ پسند ہیں یا سعید بن جبیر فرمایا: میں ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا"[4]۔

فتویٰ میں احتیاط: باایں ہمہ علم و فضل فتویٰ دینے میں بہت محتاط تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا فرمایا "اگر میں کہوں تو ڈرتا ہوں، اور خاموش رہوں تو اُس سے بھی خوف کرتا ہوں، اور کلام و سکوت کی درمیانی راہ اختیار کروں تو اس سے بھی ڈرتا ہوں"[5]۔

جلالت شان: بیحد عابد و زاہد تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں "وہ یمن کے عبادت گزار لوگوں میں شمار ہوتے تھے[6]۔ سجدہ کا نشان اُن کی دونوں آنکھوں کے درمیان صاف نظر آتا تھا[7]۔ بستر

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۲ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴ [5] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [6] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲۔

مرگ پر بھی کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے تھے[1] چالیس حج کیے تھے[2] طواف میں کلام نہ کرتے تھے، فرماتے تھے فانما الطواف صلوٰۃ (طواف نماز ہے)[3] ان اعمالِ صالحہ کا ہی طفیل تھا کہ مستجاب الدعوات تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "میں گمان کرتا ہوں کہ طاؤسؒ جنتی آدمی ہیں[4]"

شوق ثواب ہر کام میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اُن کے صاحبزادہ عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے والد طاؤسؒ کے ہمراہ حج کرنے آتے تھے یمن سے مکہ تک کا راستہ ایک ماہ میں طے ہوتا تھا۔ مگر میرے والد واپسی میں قصداً دور دراز کے راستوں سے گذرتے تھے اور گھر دو ماہ میں پہنچتے تھے، ہم اُن سے اس کی وجہ دریافت کرتے تو فرماتے "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آدمی جب تک اپنے گھر نہیں پہنچ جاتا وہ سفر میں ہی رہتا ہے[5]"

دنیا سے استغناء حضرت عطاءؒ کے احوال میں سلمہ بن کہیل کا مقولہ گذر چکا ہے کہ "میں صرف تین بزرگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے علم خالصۃً لوجہ اللہ حاصل کیا تھا، اُن تین میں ایک حضرت طاؤسؒ بھی ہیں" چنانچہ آپ دنیا اور اہل دنیا سے مکمل استغناء رکھتے تھے اور ہمیشہ ایمان و اعمال صالحہ کی دعاء کرتے رہتے تھے۔ محمد بن سعید کا بیان ہے "طاؤسؒ کی عام دعا یہ تھی "اے اللہ تو مجھ کو مال اور اولاد سے محروم کر دے، اور ایمان و عمل سے بہرہ اندوز فرما[6]"

ارباب ثروت و حکومت سے بے نیازی جس کی آنکھوں میں کوکبۂ جلال خداوندی سمایا ہوا ہو، اور جو خود اقلیم علم و عمل کا تاجدار

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [3] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۴۔
[4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹ [5] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵ [6] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۳۔

ہو وہ کسی بادشاہ یا حاکم کو کب نظر میں لا سکتا ہے حضرت طاؤس کا بھی یہی حال تھا۔ ابن عیینہ کا بیان ہے "حکومت سے بچنے والے صرف تین بزرگ تھے۔ ابوذر غفاریؓ اپنے عہد میں، طاؤس اپنے عہد میں، اور ثوری اپنے زمانہ میں"[1] عمرو بن دینار فرماتے ہیں: "لوگوں کے قبضہ میں جو کچھ ہوتا ہے، میں نے حضرتِ طاؤس سے زیادہ اُس سے بچنے والا اور پاکدامن کوئی نہیں دیکھا"[2] خود اُن کا مقولہ تھا "میں نے ارباب شرف و دول سے زیادہ کسی کو شر انگیز نہیں دیکھا"[3]

ایک مرتبہ طاؤس اور وہب بن منبہ دونوں حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کے پاس گئے جو اُس وقت گورنر تھا، وقت صبح کا تھا اور ٹھنڈا، طاؤس جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ محمد بن یوسف نے اپنے ملازم سے کہا کہ ایک طیلسان لا کر طاؤس کو اُڑھا دو" اُس نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی حضرت طاؤس برابر اپنے کاندھوں کو حرکت دیتے رہے، یہاں تک کہ وہ طیلسان گر پڑا۔ محمد بن یوسف یہ دیکھ کر غضبناک ہو گیا۔ وہب بن منبہ نے طاؤس پر اظہار ناراضگی کیا اور فرمایا" اگر اس طیلسان سے آپ کو ایسا ہی استغنا تھا تو محمد بن یوسف کو ناراض کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ اسے لے لیتے اور پھر اس کو فروخت کر کے قیمت مساکین کو دیدیتے" طاؤس بولے" اگر مجھ کو اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میرے بعد یہ کہتے کہ طاؤس نے طیلسان قبول کر لیا، تو میں قبول کر لیتا"[4]

ارباب دولت و ثروت کے ادنیٰ سے ادنیٰ احسان کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۰ [2] ایضاً [3] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲ [4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۴

نعمان بن زبیر الصنعانی فرماتے ہیں "ایک مرتبہ یمن کے حاکم نے طاؤس کے پاس پانسو دینار بطور ہدیہ بھیجے، مگر انہوں نے ان کو قبول نہیں کیا اور وہ واپس کر دیے گئے"[1]۔

اس حد درجہ استغناء کی وجہ سے اُن کی نگاہ میں امیر و غریب سب یکساں تھے ابراہیم بن میسرہ کا بیان ہے "میں نے طاؤس کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کی نگاہ میں شریف و غیر شریف دونوں برابر ہوں"[2]۔

تحصیلداری کا عہدہ محمد بن یوسف نے کچھ دنوں کے لیے انہیں تحصیلدار بھی بنا دیا تھا، مگر انہوں نے کس شان سے تحصیلداری کی، اس کی روئداد سنیے۔ ابراہیم فرماتے ہیں "میں نے طاؤس سے دریافت کیا" آپ کس طرح تحصیلداری کرتے تھے؟ فرمایا "میں باقیدار کے پاس جا کر کہتا تھا "خدا تم پر رحم کرے، اس نے تم کو جو عطا کیا ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرو" اس کہنے پر اگر وہ زکوٰۃ دے دیتا تو ہم لے لیتے، ورنہ ہم اس سے کچھ نہ کہتے تھے"[3]۔

خلفاء کو نصیحت بے لوث و بے غرض ہونے کی وجہ سے خلفاء کو برملا نصیحت کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو لکھ کر بھیجا "اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے سب کام اچھے ہوں تو اچھے لوگوں کو عہدہ دار بنائیے" آپ نے یہ سن کر فرمایا "میری بھلائی کے لیے یہ نصیحت بہت کافی ہے"[4]۔

انہی کی فیض صحبت و تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان میں جو جرأت حق گوئی پائی جاتی تھی اس کا اثر اولاد میں بھی موجود تھا۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "ایک مرتبہ خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور نے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴۔ [2] ایضاً۔ [3] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۴۔ [4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۳۔

حضرت طاؤس کے صاحبزادہ عبداللہ اور امام مالک بن انس دونوں کو بلایا۔ یہ تشریف لے گئے تو تھوڑی دیر تک ابوجعفر منصور سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر سر اٹھا کر اس نے ابن طاؤس سے کہا "آپ اپنے والد ماجد کی کوئی روایت سنائیے" بولے "مجھ سے میرے باپ نے حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی سلطنت میں شریک کیا (بادشاہ بنایا) اور اس کے باوجود اس نے ظلم کو اپنے حکم میں جائز رکھا" منصور یہ سن کر منقبض ہوگیا۔ مالک بن انس کو اندیشہ ہوا کہ عبداللہ بن طاؤس قتل کر دیے جائیں گے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد منصور نے ابن طاؤس سے کہا کہ ذرا یہ دوات مجھ کو دینا، منصور نے تین مرتبہ دوات مانگی، مگر ابن طاؤس نے نہیں دی۔ منصور نے دوات نہ دینے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا "مجھ کو ڈر ہے کہ تم اس سے کوئی معصیت کی بات نہ لکھ دو کہ اس کی پاداش میں اعانت علی الاثم کا مرتکب ہو کر میں بھی پکڑا جاؤں" منصور یہ سن کر برہم ہوگیا اور دونوں کو چلے جانے کا حکم دیا، ابن طاؤس بولے "ہم یہی تو چاہتے تھے"، امام مالک بن انس فرماتے ہیں "میں نے دراصل طاؤس کے صاحبزادہ کا فضل اسی دن سے جانا ہے"[1]

ورع واتقاء | مباح چیزیں جن میں کسی درجہ کا کوئی شائبہ قباحت ہو، ان سے احتراز کرنا عین تقویٰ ہے۔ حضرت طاؤس اس کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک جماعت کو دیکھا کہ قرآن مجید کی تجارت کر رہی ہے، تو فرط الم سے اِنّا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا[2] لیث بیان کرتے ہیں کہ طاؤس سابوری غلام اور اون کی تجارت کو مکروہ سمجھتے تھے[3] ایک مرتبہ

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۲ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۳ [3] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲۔

اُنہوں نے قریش کے چند لوگوں کو دیکھا کہ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں، اور اُن کی وضع اسلاف کی وضع سے بدلی ہوئی ہے۔ فرمایا "لوگو! تم کو کیا ہو گیا کہ ایسے لباس پہنتے ہو جو تمہارے بزرگوں نے نہیں پہنے۔ اور ایسی رفتار سے چلتے ہو کہ ناچنے والے بھی اس طرح نہیں چلتے"[۱] جو خطوط اُن کے پاس آتے تھے وہ اکٹھے ہو جاتے تو غالباً ازراہِ احتیاط اُن کو جلا ڈالتے تھے[۲]۔ ابن طاؤس فرماتے ہیں "میرے باپ اس کو بہت بُرا جانتے تھے کہ کوئی شخص اللہ کا واسطہ دے کر کسی چیز کا سوال کرے"[۳]۔ فرماتے تھے "اگر کوئی نصرانی یا یہودی تم کو سلام کرے تو اُس کے جواب میں "علاک السلام" کہو"[۴]۔

رحمدلی | رحمدلی بھی بدرجہ غائت تھی، ایک مرتبہ ایک چور کو دیکھا کہ لوگ اُس کو پکڑ کر لیجا رہے ہیں۔ آپ نے ایک دینار اُس کا فدیہ دیا اور رہا کرا لیا[۵]۔

خود اعتمادی | اُن کو اپنے علم پر پورا بھروسہ بھی تھا، حبیب بن ابی ثابت کہتے ہیں "مجھے ایک مرتبہ حضرت طاؤس نے فرمایا "میں جب تمہارے سامنے کوئی حدیث بیان کروں اور اس کی توثیق بھی کر دوں، پھر تم اُس کے متعلق کسی سے دریافت نہ کرو"[۶]۔"

لباس | بالطبع فقر پسند تھے، لباس میں عموماً سادگی پسند کرتے تھے۔ اُن کے صاحبزادہ سے کسی نے پوچھا "آپ کے والد سفر میں کیا پہنتے تھے؟ بولے "وہ صرف دو قمیصوں پر کفایت کرتے تھے۔ اُن کے نیچے پاجامہ نہیں پہنتے تھے"[۷]۔ ابن زاذان کا بیان ہے "میں نے طاؤسؒ کو دیکھا کہ دو پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے"[۸]۔ کبھی کبھی حنا کا خضاب بھی استعمال کرتے تھے بعض

---

[۱] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵ [۲] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۲ [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] ایضاً [۷] ایضاً [۸] ایضاً

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً وہ چہرہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے، صرف رات کو اُسے اٹھاتے تھے، عمامہ باندھتے تھے اور اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ اُس کے ایک حصہ کو ٹھوڑی کے نیچے لیجا کر بطور ڈھاٹے کے باندھا جائے[1]۔

زندہ دلی مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل زاہد خشک تھے، بلکہ اسلامی تہواروں میں بڑی خوشی سے شریک ہوتے تھے اور خوشیاں مناتے تھے۔ عید کے موقع پر اپنی تمام جواری کو خواہ سیاہ فام ہوں یا غیر سیاہ فام، حکم کرتے تھے کہ اپنے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگائیں[2]۔

وفات پہلے گذر چکا ہے، حج چالیس کیے تھے۔ چنانچہ وفات بھی بسلسلہ حج ہی ہوئی۔ ذی الحجہ ۱۰۶ھ کی ساتویں تاریخ تھی، ابھی مکہ مکرمہ میں ہی مقیم تھے کہ روح قفس عنصری سے ملاءِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی[3]۔ اس وقت آپ کی عمر کچھ اوپر نوّے سال کی تھی[4]۔ جنازہ میں لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ جنازہ کا چلنا دشوار تھا، ابراہیم بن ہشام امیر مکہ نے پولیس کا انتظام کرایا۔ عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب بھی شریک جنازہ تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آپ حضرت طاؤس کے جنازہ کو کاندھا دے رہے ہیں، اور ہجوم کی وجہ سے آپ کی ٹوپی گر گئی ہے، اور چادر پیچھے سے پھٹ گئی ہے۔ خلیفۂ وقت ہشام بن عبدالملک نے نماز پڑھائی، اور پھر اُن کے جسم کی امانت مکہ کی خاک پاک کے سپرد کردی گئی[5]۔ لوگوں نے دعا کی "اللہ تعالیٰ طاؤس پر رحم کرے، انہوں نے چالیس حج کیے تھے[6]"

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۶ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۶ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴۔
[4] ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۵۔ [5] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۳ [6] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۔

سلیمان بن مہران اعمش

نام ونسب سلیمان نام، ابو محمد کنیت، اُن کے والد کا نام مہران تھا، مہران نسلاً عجمی تھے، آبائی وطن طبرستان تھا۔ پھر کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، بنو کاہل کے غلام تھے، اور اسی نسبت سے کاہلی کہلاتے تھے۔[1]

پیدائش حضرت امام حسین کی شہادت کے دن یعنی عاشورا محرم سنہ ۶۱ھ کو دنباوند میں پیدا ہوئے جو رے الجبال کا ایک علاقہ ہے۔[2]

فضل وکمال اعمش کے والد کوفہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے جو اُس زمانہ میں اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اعمش کی نشوونما یہیں ہوئی۔ ابتداءً اگرچہ غلام تھے، مگر فطری استعداد وصلاحیت اور طبعی شوقِ علم کے لیے غلامی مانع نہ ہو سکی، انہوں نے بڑی توجہ اور محنت سے علم حاصل کیا، یہاں تک کہ وہ علماء کوفہ کی صف اوّل میں نظر آتے ہیں۔ حافظ ذہبی ایسا نقاد انہیں "شیخ الاسلام اور الحافظ الثقہ" کہتا ہے۔ عیسٰی بن یونس کہتے تھے "ہم نے اور ہمارے پیشرو لوگوں نے اعمش کا مثل نہیں دیکھا۔" حافظ ابن حجر بھی انہیں "علامۃ الاسلام" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ تمام مذہبی علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ ابن عیینہ فرماتے ہیں "اعمش کتاب اللہ کے بڑے قاری احادیث کے بڑے حافظ، اور علم فرائض کے ماہر تھے۔[3] ابن مدینی کا بیان ہے: "محمد صلی اللہ

۱؎ تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۰ ۲؎ ابن سعد ج ۶ ص ۲۴۹ وتاریخ خطیب ۳؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۵

علیہ وسلم کی اُمت میں علم چھ بزرگوں سے محفوظ رکھا ہے" مکہ میں عمرو بن دینار نے۔ مدینہ میں زہری نے، ابو اسحٰق السبیعی اور اعمش نے کوفہ میں اور قتادہ اور یحییٰ بن ابی کثیر نے بصرہ میں[1]۔

قرآن مجید کا علم یوں تو حضرت اعمش تمام اسلامی علوم میں ہی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ مگر قرآن مجید کے ساتھ انہیں خاص شغف تھا حضرت شعبہ اُن کا ذکر کرتے تھے تو فرماتے تھے:

"قرآن قرآن"۔ عمرو بن علی کہتے ہیں" صدق مقال کی وجہ سے لوگ حضرت اعمش کو قرآن ہی کہنے لگے تھے"۔ حافظ ابن حجر انہیں" علوم قرآنیہ کا سردار" لکھتے ہیں[2]۔ ہشیم فرماتے ہیں۔

مارایت بالکوفۃ احداً اقرأ لکتاب اللہ منہ[3] — میں نے کوفہ میں اُن سے زیادہ قرآن کا کوئی بہتر قاری نہیں دیکھا

قرآن مجید کا درس دیتے تھے طلحہ بن مصرف نے انہی کے پاس قرآن پڑھا تھا۔ مگر آخر عمر میں کبر سن اور ضعف کے باعث درس ترک کر دیا تھا، پھر بھی ماہ شعبان میں تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھاتے تھے۔ لوگ اپنے اپنے قرآن لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اعمش کی قرأت کے مطابق اصلاح کرتے جاتے تھے آپ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے[4]۔

حدیث حدیث میں اُن کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ابن عمار فرماتے ہیں" محدثین میں اعمش سے زیادہ کوئی ثقہ نہیں ہے" عجلی کہتے ہیں" اعمش ثقہ اور ثبت فی الحدیث تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بڑے محدث اہل کوفہ تھے[5] علامہ حافظ ذہبی انہیں" الحافظ الثقہ" لکھتے ہیں، ابن عیینہ انہیں

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ابن سعد ج ۶ ص ۲۳۹ [5] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳

احفظہم للحدیث بتاتے ہیں۔[1] یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ جریر، اعمش سے کوئی روایت کرتے تھے تو اس کے بعد فرمایا کرتے تھے "یہ شاہی خلعت ہے"۔[2]

امام زہری اہل عراق کے علم کے قائل نہیں تھے۔ اسحٰق بن رشد نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ کوفہ میں بنو اسد کا ایک غلام ہے جو چار ہزار حدیثیں بیان کرتا ہے۔ امام زہری نے کہا "چار ہزار!" اسحٰق بولے "ہاں چار ہزار" اگر آپ کہیں تو میں اس کا کچھ حصہ آپ کے سامنے پیش کروں، فرمایا "ہاں لاؤ" چنانچہ انہوں نے بعض روایتیں سنائیں۔ اسحٰق کہتے ہیں زہری روایات پڑھتے جاتے تھے اور ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ پھر فرمایا "خدا کی قسم! یہ وہ علم ہے جس کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ یہ کسی کے پاس بھی نہیں ہوگا"[3] شعبہ فرماتے ہیں :۔

ماشفانی احدٌ فی الحدیث ماشفانی الاعمش[4] — مجھ کو حدیث میں کسی نے اتنی شفا نہیں دی جس قدر کہ اعمش نے شفا دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایات انہیں خصوصیت کے ساتھ زیادہ یاد تھیں۔ قاسم ابن عبدالرحمٰن کے پاس سے ایک مرتبہ حضرت اعمش گذرے تو انہوں نے فرمایا "یہ عبداللہ ابن مسعود کی روایات کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں"۔[5]

ابن معین اعمش عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ کو اجود الاسانید کہتے تھے۔[6] ابوبکر ابن عیاش فرماتے ہیں کہ ہم حضرت اعمش کو "سید المحدثین" کہتے تھے۔[7]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵۔ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۲۳۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳
[4] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۰ [5] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۵ [6] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص[illegible]

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ مرویات اعمش کی تعداد چار ہزار تھی۔ مگر ابن مدائنی کل تیرہ سو بتاتے ہیں[1]۔ اُن کی روایات کے معتبر ہونے کے لیے یہی کیا کم ہے کہ لوگ صداقت کی وجہ سے انہیں قرآن کہتے تھے۔

احادیث کی کثرت روایت کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا "تم لوگ جب حدیث سُننے کے لیے کسی کے پاس جاتے ہو تو اُسے جھوٹ بولنے پر مجبور کرتے ہو۔ خدا کی قسم یہ لوگ شر الناس ہیں[2]۔

اساتذہ: حضرت اعمش نے جن بزرگوں سے سماع حدیث کیا تھا اُن کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

عبداللہ بن ابی اوفیٰ، زید بن وہب، ابووائل، ابو عمرو الشیبانی، قیس بن ابی حازم عکرمہ، معرور بن سوید۔ ابراہیم النخعی۔

حضرت انس بن مالک سے ملاقات ثابت ہے، روایت ثابت نہیں ہے، اسی بنا پر حضرت اعمش کی جو روایتیں حضرت انس سے مروی ہیں اُن کو مرسل قرار دیا گیا ہے۔ ابن المنادی کی ایک روایت ہے کہ اعمش نے ایک مرتبہ ابوبکرہ الثقفی کو دیکھا تو حدیث سُننے کے اشتیاق میں جا کر اُن کی رکاب پکڑ لی، ابوبکرہ بولے "بیٹا اس فعل سے تم نے اپنے رب کا اکرام کیا ہے" لیکن حافظ ابن حجر اس روایت کو غلط فاحش قرار دیتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ اعمش ۵۹ھ یا ۶۱ھ میں تولد ہوئے تھے اور ابوبکرہ ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں انتقال کر چکے تھے، اس بنا پر دونوں میں کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے[3]۔

تلامذہ: تلامذہ میں جو زیادہ مشہور اور نامور ہوئے اُن کے نام یہ ہیں۔ شعبہ۔ سفیان ثوری، سفیان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۵ [2] ابن سعد جلد ۶ ص ۲۳۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۵۔

ابن عیینہ، زائدہ، وکیع، عبید اللہ بن موسیٰ، ابراہیم بن طہمان، جریر بن حازم وغیرہم۔

فقہ و فرائض

قرآن و حدیث کی طرح فقہ میں عموماً اور فرائض میں خصوصاً بڑا کمال رکھتے تھے۔ ابن عیینہ اُن کو "اعلمھم بالفرائض" فرائض کے سب سے بڑے عالم بتاتے ہیں۔

مغیرہ کا بیان ہے کہ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد فرائض میں ہم نے اعمش کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ ابن عیینہ ایک دوسرے مقولہ میں فرماتے ہیں کہ اعمش اپنے ساتھیوں سے چار چیزوں میں بڑھ گئے۔ اُن میں وہ فرائض کا بھی شمار کرتے ہیں[1]۔

استغنا و خودداری

ان علمی کمالات کے ساتھ خدا نے ان کو صد درجہ مستغنی اور فقیر منش بنایا تھا امیروں اور شاہوں کا جاہ و حشم اُن کی چشم قناعت کو خیرہ نہیں کر سکتا تھا۔ امام شعرانی لکھتے ہیں "اعمش کو روٹی تک میسر نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ان کی مجلس میں اغنیاء و سلاطین سب سے زیادہ فقیر معلوم ہوتے تھے[2]"

عیسیٰ بن یونس کا بیان ہے "فقر و حاجت کے باوجود اغنیاء و سلاطین حضرت اعمش کی نگاہ میں سب سے زیادہ حقیر تھے[3]۔"

ایک دفعہ خلیفہ ہشام نے اُن کو لکھا کہ میرے پاس حضرت عثمانؓ کے فضائل اور حضرت علیؓ کے معائب لکھ کر بھیجدو۔ انہوں نے قاصد کے سامنے ہی وہ خط ایک بکری کے منہ میں رکھ دیا اور اُس نے چبا کر اُس کو پارہ پارہ کر دیا۔ پھر قاصد سے فرمایا "جاؤ یہ تمہاری تحریر کا جواب ہے" قاصد بولا اگر میں یوں ہی واپس چلا گیا تو قتل کر دیا جاؤنگا۔ لوگوں نے یہ سُن کر حضرت اعمش سے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۳ [2] طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۳۸ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۸۔

درخواست کی کہ جواب ضرور لکھ دیجیے۔ آپ نے یہ دیکھ کر جواب لکھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اما بعد اگر حضرت عثمانؓ کی ذات میں تمام دنیا کی خوبیاں جمع ہوں

تب بھی اُن سے تمہاری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور اگر حضرت علیؓ کی

ذات میں تمام دنیا کی بُرائیاں جمع ہو جائیں تو اُن سے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا

تم کو چاہیے کہ اپنے نفس کی خبر لو"[1]

بے لاگ تنقید وہ چونکہ کسی سے کوئی غرض اور طمع نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے اپنی رائے کے

اظہار میں بھی بڑے بے باک تھے۔ کسی کی خفگی اور خوشنودی کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکر

ابن عیاش کہتے ہیں "ایک مرتبہ ہم چند محدثین کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے آخر میں اعمش

کی خدمت میں حاضر ہوئے اُنھوں نے پوچھا۔ کس کس کے پاس ہو کر آئے ہو؟ ہم نے ایک

ایک کا نام لیا اور وہ ہر ایک کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے رہے۔ کسی کو کہا: "وہ تو ایک پھٹا

ہوا طبل ہے"۔ کسی کے متعلق فرمایا "وہ اُڑنے والا پرندہ ہے"۔ اور کسی کے بارہ میں بولے "وہ دف

ہیں"[2] غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض انہیں تند مزاج کہتے تھے۔

لباس میں سادگی کمال استغنار کی وجہ سے لباس کا بھی کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ ابن عیینہ فرماتے ہیں

"ایک مرتبہ ہم نے اعمش کو دیکھا کہ پوستین اُلٹی پہن رکھی تھی اور جو قبا زیب تن تھی

بوسیدگی کی وجہ سے اُس کے تلگے اُن کے پیروں پر لٹک رہے تھے۔ پھر خود ہی فرمایا "کیا

تم سمجھتے ہو کہ اگر میں نے علم حاصل نہ کیا ہوتا تو پھر بھی میرے پاس کوئی آتا۔ اگر میں بقال ہوتا

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳ [2] تاریخ خطیب ج ۹ ص ۱۱۔

تو لوگ مجھ سے سودا خریدتے ہوئے استکراہ کرتے۔

ایک مرتبہ عیسیٰ بن موسیٰ (جو اُس زمانہ میں حاکم تھا) نے قرّاء کو عطیہ دینے کا حکم دیا، چنانچہ یہ حضرات اپنے اپنے ملبوسات کے ساتھ تشریف لائے۔ اعمش بھی آئے تو اس شان سے کہ چھوٹے چھوٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو اُن کی نصف پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔ گھر میں داخل ہوکر فرمایا "یہاں ابن ابی لیلیٰ ہیں اور یہاں ابن شبرمہ۔ تم ہم کو ان لمبی لمبی دیواروں سے نجات دو"۔ عیسیٰ یہ سُن کر بولا "آج ہمارے پاس اعمش کے سوا کوئی قاری (یعنی واقعی قاری) آیا ہی نہیں، تم جلدی جلدی ان کے صلہ کا بندوبست کردو"[۱]

زہد و عبادت | علمی و اخلاقی کمالات کے ساتھ اپنے وقت کے سب سے بڑے عابد و زاہد بھی تھے خریبی کا قول ہے "اعمش کا جس دن انتقال ہوگیا، اُنہوں نے اپنے بعد کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو اُن سے زیادہ عبادت گذار ہو۔ وہ صاحبِ سُنت تھے"[۲]

حافظ ذہبی لکھتے ہیں "وہ علم نافع اور عمل صالح دونوں میں سردار تھے"[۳] یحییٰ قطان کے سامنے کسی نے اعمش کا ذکر کیا تو فرمانے لگے "وہ بڑے عابد و زاہد تھے، نماز باجماعت کے پابند تھے، اور ہمیشہ صفِ اوّل میں رہتے تھے۔ وکیع کا بیان ہے "اعمش نے تقریباً ستر سال تک تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہونے دی"[۴]

جامعیت | ان سب علمی و عملی فضائل نے اُن کو مجموعۂ کمالات بنا دیا تھا، چنانچہ عیسیٰ بن یونس نے فرمایا "ہم نے اور ہم سے پہلے کسی قرن نے اعمش ایسا بزرگ نہیں دیکھا"[۵] یحییٰ فرماتے ہیں، "اعمش

[۱] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۶ [۲] ایضاً ص ۶ [۳] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۴ [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۶ [۵] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۰

صاحبِ فضل و قرآن تھے، اور وہ بہت بلند مرتبہ انسان تھے۔

ظرافت: اگر ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بالکل زاہد خشک مزاج تھے، بلکہ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں :-

وکان لطیف الخلق مزاحاً — وہ بڑے خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے۔

ایک مرتبہ چند لوگ اُن کے پاس سماعِ حدیث کے لیے آئے۔ اعمش باہر نکلے تو فرمایا، "اگر میرے گھر میں وہ نہ ہوتا جو مجھ کو تم سے زیادہ مبغوض ہے (یعنی بیوی) تو میں گھر سے نہ نکلتا۔"

ایک دفعہ اُن میں اور بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی۔ حضرت اعمش نے ثالثی کے لیے کسی شخص کو بلایا۔ اُس شخص نے آکر حضرت اعمش کی بیوی سے کہا "تم اپنے شوہر کی آنکھوں کے چندھے پن اور اُن کی پنڈلیوں کے بدنما ہونے کو نہ دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کتنے بڑے امام ہیں اور اُن کی کیا شان ہے"، اعمش بولے "خدا تم کو رسوا کرے، تم نے تو اور میری بیوی کو میرے عیوب بتا دیئے"۔

ایک دفعہ داؤد بن عمر نے جو خود جولاہا تھا پوچھا "جولاہے کی امامت کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟" فرمایا "اُس کے پیچھے اگر نماز بے وضو پڑھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔

ایک مرتبہ اعمش بیمار تھے۔ امام ابو حنیفہ اُن کی عیادت کو تشریف لائے، دیر تک بیٹھے رہے، چلنے لگے تو فرمایا "میں اتنی دیر تک آپ کے پاس بیٹھا رہا، اس سے تو آپ پر بڑا بار ہوا ہوگا" اعمش بولے "آپ اپنے گھر میں ہوتے ہیں تو بھی میرے لیے بھاری ہی ہوتے ہیں"[1] (اس میں امام اعظم کی جلالتِ علم کی طرف تلمیح ہے)

---

[1] یہ واقعات ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳ سے ماخوذ ہیں۔

فصاحت | گفتگو بڑی فصیح وبلیغ ہوتی تھی۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وکان فصیحاً"[۱]

تحقیر نفس | اس پایہ کے مجموعۂ کمالات ہونے کے باوجود اپنی ذات کو بالکل حقیر و ہیچ سمجھتے تھے انہوں نے وصیت کی تھی "میں مرجاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع نہ کرنا اور مجھ کو میرے رب کے پاس لیجا کر دفن کر دینا میں اس سے فروتر ہوں کہ لوگ میرے جنازہ میں شریک ہوں[۲]

وفات | باختلاف روایت ۱۴۷ھ یا ۱۴۸ھ میں وفات پائی[۳] انتقال کے بعد جریر نے خواب دیکھا۔ پوچھا "اے ابو محمد! کیا حال ہے؟" فرمایا "ہم نے مغفرت کی وجہ سے نجات پائی۔ الحمد للہ رب العالمین[۴]"

ایوب بن ابی تیمیہ سختیانی

نام و نسب | ایوب نام، ابوبکر کنیت۔ والد کا نام کیسان تھا اور کنیت ابو تمیمہ نسلاً کوئی ان کو عنبری کہتا ہے اور کوئی جہنی۔ سختیانی کے لقب سے علامہ ابن عبد البر کے قول کے مطابق اسی لیے مشہور تھے کہ بصرہ میں بکرے کی دباغت دی ہوئی کھالیں فروخت کرتے تھے[۵] حضرت ایوب قبیلہ عنزہ یا جہینہ کی غلامی میں تھے[۶]

فضل و کمال | ایوب غلام تھے لیکن کشورِ علم و عمل کے تاجدار تھے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں

[۱] تاریخ بغدادی جلد ۹ ص ۵ [۲] طبقات کبریٰ امام شعرانی ج ۱ ص ۴۸ [۳] ابن سعد ج ۶ ص ۲۴۰ [۴] خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۳ [۵] تہذیب الاسماء قسم اول ج ۱ ص ۱۳۱ [۶] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۷۔

"سب اُن کی جلالت و امامت، حفظ اور ثقاہت، وفور علم، فہم اور عبادت پر متفق ہیں[1]۔ علامہ ابن سعد تحریر فرماتے ہیں "ایوب ثقہ اور حدیث میں ثبت تھے، جامع اور عدل تھے، متقی، کثیر العلم اور حجۃ تھے[2] ابن عیینہ فرماتے ہیں۔ لم القِ مِثلَہٗ (میں اُن کے مثل سے نہیں ملا) ابن عماد الحنبلی اُن کو احد الاعلام لکھتے ہیں۔ حماد بن زید فرماتے ہیں جن لوگوں سے میں نے مجالست کی ہے، ایوب اُن سب میں افضل تھے۔ اور اتباع سنت میں سب سے زیادہ شدید تھے۔ ابن ناصر الدین کہتے ہیں "ایوب علماء کے سردار، حفاظ حدیث کے امام، ثقہ اور بیدار مغز بزرگوں میں سے تھے[3] لوگ انہیں جہبذ العلماء کہتے تھے۔ ہشام بن عروہ کہتے تھے میں نے بصرہ میں ایوب کا مثل نہیں دیکھا"۔ ابو عثمان نے حضرت حسن بصری سے سُنا کہ وہ ایوب کو بصرہ کے نوجوانوں کا سردار کہتے تھے۔ ابن عون فرماتے ہیں "محمد بن سیرینؒ کی وفات ہوگئی تو ہم نے اپنا مرجع ایوب کو بنالیا۔ ابو حاتم کہتے ہیں، ثقۃٌ لا یسأل عن مثلہ (وہ ایسے ثقہ ہیں کہ اُن کے مثل کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ محمد بن سیرینؒ نے کوئی حدیث بیان کی۔ مسلم بن کیسان نے اُن سے پوچھا "آپ سے یہ روایت کس نے نقل کی ہے؟ فرمایا "الثبت الثبت ایوب نے[4]"

حدیث

حضرت ایوب کا خاص فن حدیث تھا، حافظ ذہبی ایسا نقاد فن اُن کو "الحافظ احد الاعلام" لکھتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے عہد کے اجلۂ ائمہ سے سماع حدیث کیا تھا۔

---

[1] ابن سعد ج ۷، قسم دوم ص ۱۴۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۳۱ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۱
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔

عمرو بن سلمۃ الجرمی۔ ابو العالیہ الریاحی، سعید بن جبیر، ابو قلابہ، عبداللہ بن شقیق، ابن سیرین، حمید بن بلال، قاسم بن محمد، عبدالرحمٰن بن القاسم، نافع بن عاصم، عطاء، عکرمہ، اعرج، عمرو ابن دینار اُن کے شیوخ تھے۔

تلامذہ | اُن کے حلقۂ تلمذ میں جو لوگ شامل تھے اُن میں سے اکثر آسمان علم وفضل پر مہر جہانتاب بن کر چمکے، اُن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

اعمش، قتادہ، حماد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، شعبہ، امام مالک، ابن اسحٰق سعید بن ابی عروبہ وغیرہم[1] اُن کی مرویات کی تعداد آٹھ سو اور بعض کے نزدیک دو ہزار ہے[2]

مرویات کا پایہ | ثقاہت کے اعتبار سے اُن کی مرویات کا جو پایہ ہے اُس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ شعبہ نے اُن سے کسی ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا۔ اُنہوں نے فرمایا "مجھ کو اس میں شک ہے۔ حضرت شعبہ بولے:۔

شکک احب الیّ من یقین غیرک[3] آپ کا شک مجھ کو دوسرے کے یقین سے زیادہ محبوب ہے۔

امام نسائی اُنہیں ثقہ، ثبت بتاتے ہیں، ابو حاتم فرماتے ہیں "اُن جیسا کوئی ثقہ دیکھا ہی نہیں گیا۔ ابن خیثمہ کہتے ہیں "ایوب ابن عون سے زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں۔ امام مالک فرماتے ہیں:۔

وکان من العالمین العاملین الخاشعین[4] وہ عالم، عامل اور اللہ کو بہت زیادہ ڈرنے والے تھے[5]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۷، ۳۹۸ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۳۲ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸ - [5] ایضاً

احتیاط فی الحدیث | اس کمال ثقاہت کے باوجود وہ حدیث بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حماد بن زید فرماتے ہیں "میں نے ایوب اور یونس سے زیادہ سوال کا جواب دینے میں کوئی محتاط نہیں دیکھا۔ جواب سے پہلے وہ سائل کے حافظہ کا امتحان کر لیتے تھے کہ کہیں وہ اُسے غلط نقل نہ کر دے۔ حماد بن یزید کا بیان ہے کہ کوئی شخص حضرت ایوب سے کوئی سوال کرتا تھا تو وہ جواب سے قبل اُس سوال کا اعادہ کراتے تھے۔ اگر اس اعادہ میں وہ ذرا بھی غلط ملط اور تغیر کر دیتا تو حضرت ایوب اُس کا جواب نہیں دیتے تھے۔ پھر جوابات میں بھی صرف احادیث سُنا دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ اپنی طرف سے حکم کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے اُن سے کوئی سوال کیا۔ فرمایا "مجھے معلوم نہیں" وہ بولا "اپنی رائے ہی بتا دیجیے" ارشاد ہوا "میری رائے بھی کچھ نہیں ہے"

ایک مرتبہ اُن سے پوچھا گیا "آپ رائے سے کام نہیں لیتے؟" اس کے جواب میں فرمایا "کسی نے گدھے سے کہا تو جُگالی کیوں نہیں کرتا؟ بولا، میں باطل چیز کا چبانا بُرا جانتا ہوں" اس سے آپ کی غرض یہ تھی کہ اپنی رائے کا ظاہر کرنا بھی ایسا ہی ہے۔

فقہ | حدیث کی طرح فقہ کے بھی امام تھے۔ حضرت شعبہ انہیں "سید الفقہاء" کہتے ہیں[۲]۔ حماد کہتے ہیں "ہمارے فقہاء ایوب، ابن عون، اور یونس ہیں"[۳]

احترام حدیث | طبیعت میں خشوع و خضوع بہت تھا، اور اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سُنتے ہی رو پڑتے تھے۔ امام مالک فرماتے ہیں "ہم حضرت ایوب کی خدمت میں

---

[۱] ابن سعد ق ۲ ج ۷، ص ۱۴ [۲] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۳۱ [۳] ابن سعد ج ۷، ص ۱۴۔

حاضر ہوتے تھے، اُن کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کا ذکر آتا تھا، تو بیساختہ رونے لگتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں اُن کی حالت پر رحم آتا تھا[1]۔

امام مالک ہی ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں "میں نے جب یہ دیکھا کہ ایوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا ادب واحترام کرتے ہیں تو پھر میں نے اُن سے حدیثیں لکھنی شروع کر دیں[2]۔

انکساری و تواضع
اس پایہ کے محدث اور فقیہ ہونے کے باوصف مزاج میں انکساری حد سے زیادہ تھی۔ وہ ہمیشہ اس سے خائف رہتے تھے کہ علم کا پندار اور عجب وغرور پیدا ہو جائے۔ چنانچہ فرماتے تھے "کون شخص اس سے محفوظ ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث بیان کرے اور دیکھے کہ اس طرح اُس نے جماعت میں کوئی امتیاز پیدا کر لیا ہے، اور اس بنا پر اُس کے دل میں کوئی عُجب پیدا ہو جائے[3]"۔

علماء کے لیے بڑا ابتلا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی موقع پر کسی مسئلہ کی نسبت اپنی لاعلمی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ مگر حضرت ایوب اس سے بالکل مستثنیٰ تھے۔ ان کو کسی مسئلہ کے متعلق علم نہیں ہوتا تھا تو وہ برملا اُس کا اعتراف کر لیتے تھے۔ ابن شوذب بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایوب سے اگر کبھی ایسا مسئلہ پوچھا جاتا جس سے وہ واقف نہیں ہوتے تھے تو بے تکلف فرما دیتے تیسئل اھل العلم (اہل علم سے دریافت کرو)[4]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸۔ [3] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۴
[4] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۴۔

شہرت سے نفرت اس انکساری اور تواضع کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ شہرت سے حد درجہ نفور تھے، یہاں تک عام مجمعوں اور لوگوں کی نظروں سے بچ کر وہ ایسے راستوں سے جاتے تھے جہاں کوئی اُنہیں نہ دیکھ سکے۔ حماد بن زید کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت ایوب کے ساتھ چل رہا تھا مجھ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ ایسے ایسے راستوں سے نکلے کہ میں متحیر تھا، انہیں وہ راستے کس طرح معلوم ہوگئے۔ اور یہ محض اس لیے تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ وہ ایوب جا رہے ہیں تاہم راستہ میں اگر کوئی ملجاتا تو سلام کرنے میں سبقت کرتے۔ لوگ اُس کے جواب میں اضافے کرکے سلام کرتے۔ حضرتِ ایوب پر اس سے خشوع طاری ہوجاتا تھا اور وہ فرمانے لگتے "اے اللہ میں یہ نہیں چاہتا، اے اللہ میں یہ نہیں چاہتا"

وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی اُن کے ساتھ چلے۔ حماد بن زید بیان کرتے ہیں "ایک مرتبہ میں بازار جا رہا تھا، راستہ میں ایوب مل گئے، وہ ایک جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے حضرت ایوب کو دیکھ کر میں اُن کے ہمراہ ہوگیا تو فرمانے لگے "تم اپنے بازار جاؤ" شعبہ بیان کرتے ہیں "بسا اوقات میں اپنی ضرورت سے ان کے ساتھ جانا چاہتا تو وہ مجھے اجازت نہ دیتے۔ اور گھر سے نکل کر گلیوں میں ادھر اُدھر ہو جاتے تھے تاکہ لوگ انہیں نہ جانیں[1]

زہد و عبادت علمی کمال کے ساتھ زاہد و عابد بھی تھے۔ اُنہوں نے چالیس حج کیے تھے۔ امام مالک فرماتے تھے "کان من عباد الناس وخیارھم"[2] ایوب بڑے عبادت گذار اور بہترین بزرگ تھے، مگر اس کے باوجود فرمایا کرتے تھے "جب صلحاء کا ذکر کیا جائیگا تو میں اُن سے الگ ہونگا"[3]

[1] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۵ و ۱۶۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۹۸ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳

عبادت کا اخفاء تمام رات عبادت کرتے رہتے تھے، مگر صبح کے وقت آواز ایسی کر لیتے تھی جس سے معلوم ہو کہ ابھی اُٹھے ہیں[1]۔ اُس زمانہ کے عام عابدوں اور زاہدوں کا لباس یہ تھا کہ وہ چست قمیص پہنتے تھے۔ حضرت ایوب میں اخفا کا جذبہ اس قدر تھا کہ اُنہوں نے یہ لباس ہی ترک کر دیا تھا۔ اپنی قمیص ڈھیلی ڈھالی رکھتے تھے۔ سعید نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا "ابو عروہ! پہلے زمانہ میں دامن لٹکا کر چلنے میں شہرت تھی اور اب سمیٹ کر چلنے میں ہے[2]۔"

اُن کا مقولہ تھا کہ انسان کو خواہ کتنا ہی بڑا زاہد ہو اللہ سے ڈرتا رہنا چاہیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زہد کو لوگوں کے لیے عذاب نہ بنائے[3]۔

اہلِ حکومت سے اجتناب اربابِ حکومت کی ملاقات سے ہمیشہ مجتنب رہتے تھے یہاں تک کہ انہیں کسی خلیفہ کا اپنے مکان پر آنا بھی گوارا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا "مجھ کو میرا بیٹا بکر سب سے زیادہ محبوب ہے، مگر اس کے باوجود میں اُسے اپنے ہاتھوں سے دفن کروں۔ یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہشام یا کوئی اور خلیفہ میرے پاس آئے[4]۔"

یزید بن ولید کے ذاتی دوست تھے۔ مگر جب وہ والی خلافت ہوا تو آپ نے دعا کی "اے اللہ! میرے ذکر کو چھپا لے" یعنی اب یزید میری شہرت کی وجہ سے بار بار یاد نہ کرے[5]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴۔ [2] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۵ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔
[4] ابن سعد ج ۷، ص ۱۶۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳۔

خوش خلقی | اس قدر عابد و زاہد اور شہرت و وجاہت سے نفور ہونے کے باوجود خوش اخلاق بھی انتہا درجہ کے تھے۔ کوئی اُن کے مکان پر آتا تھا تو حتی الوسع اُس کی خاطر مدارات کرتے اور بشاشت وجہ کے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔ حماد بن زید کا بیان ہے "میں نے حضرت سے زیادہ کوئی خندہ رو نہیں دیکھا"[1] عید الفطر کے موقع پر خاص اہتمام کرتے تھے۔ اس دن اپنے تمام پڑوسیوں کے ہاں حصے بھیجتے تھے[2]۔ جو احباب ملتے تھے اُن سے بڑی گرمجوشی سے ملاقات کرتے تھے۔

ربیع بن مسلم کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت ایوب کا ہم سفر تھا۔ ابطح میں ہم قیام پذیر تھے کہ ایک فربہ اندام شخص آیا جس نے اُس وقت موٹا لباس پہن رکھا تھا، اُس نے حضرت ایوب کو دریافت کیا۔ میں نے اطلاع کی، آپ تشریف لائے تو اس شخص کو دیکھ کر اُس کے گلے سے لپٹ گئے۔ لوگوں نے پوچھا "یہ کون ہیں؟" آپ نے فرمایا "یہ سالم بن عبداللہ ہیں[3]"

عیادت و تعزیت | آپ کے پاس بہتیرے ایسے آدمی آتے تھے جن سے آپ ناآشنایانہ معاملہ کرتے تھے لیکن اگر وہ بیمار ہو جاتے تو آپ اُن کی عیادت کو تشریف لیجاتے اور اُن کا انتقال ہو جاتا تو تعزیت کے لیے اُن کے مکان پر جاتے تھے اور اس درجہ دلسوزی کا اظہار فرماتے کہ وہ شخص آپ کا بہت ہی بڑا مکرم و محترم معلوم ہوتا تھا۔ شام میں ثقیف کے ایک غلام یعلی بن حکیم کا انتقال ہو گیا، اُس نے صرف ایک ماں چھوڑی تھی حضرت ایوب کو

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۳ [2] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۶ [3] ایضاً ص ۱۵

خبر ہوئی تو تین دن تک برابر تعزیت کے لیے یعلیٰ کی ماں کے پاس اُس کے مکان پر جاتے رہے، آپ دیر تک وہاں قیام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے تلامذہ واحباب بھی آپ سے ملنے وہیں چلے جاتے تھے[1]

کرامات | بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے آپ صاحب کرامات بھی تھے۔ ابو نعیم کا بیان ہے کہ حضرت ایوب مکہ کے راستہ میں تھے۔ اہل کارواں کو پیاس لگی، مگر اُنھوں نے اس کو ظاہر نہیں کیا۔ حضرت ایوب نے باصرار دریافت کیا تو اُنھوں نے افشا کر دیا۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا "تم کسی پر ظاہر تو نہیں کرو گے؟" لوگوں نے اقرار کر لیا، تو آپ نے ایک دائرہ بنایا، اور دعا مانگی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانی اُبلنے لگا جس سے سب خوب جی بھر کر سیراب ہوئے، اور اُنھوں نے اپنے اونٹوں کو بھی پانی پلایا۔ پھر آپ نے اُس جگہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پانی اُبلنا بند ہو گیا[2]

حلیہ | سر پر بڑے بڑے بال رکھتے جس کو سال بسال (غالباً حج کے موقع پر) منڈوا دیتے تھے اور زیادہ بڑے ہو جاتے تھے تو اُن میں مانگ نکالتے تھے، توند بڑھی ہوئی تھی ازار باندھنے پر بھی ناف ظاہر رہتی تھی۔ سر اور داڑھی پر سُرخ خضاب استعمال کرتے تھے[3]

وفات | ۶۳ برس کی عمر میں بمرض طاعون بصرہ میں ۱۳۱ھ وفات پائی۔ اُنھوں نے ایک سُرخ چادر عرصہ سے کفن کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ اور اُس کو وہ احرام کی حالت میں اور رمضان کی تیسویں شب میں اوڑھتے تھے، مگر یہ اتفاقاً مکہ میں چوری چلی گئی تھی[4]۔

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۷، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴ [3] ابن سعد ج ۷ ص ۱۴ و ۱۵ [4] ایضاً ج ۷، ق ۲ ص ۱۶

حضرت مکحول الدمشقی

نام ونسب مکحول نام، ابو عبداللہ یا ابو ایوب کنیت۔ اُن کے نسب سے متعلق روایات مختلف ہیں۔ حافظ ابن حجر نے کئی روایتیں نقل کی ہیں، جن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسلاً عجمی تھے اور اُن کے والد کا نام سہراب تھا، بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ مصری تھے اور بعض سے اُن کا ہذلی یعنی عرب ہونا دریافت ہوتا ہے۔

اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق حضرت مکحول کا خود اپنا بیان یہ ہے کہ میں پہلے عمرو بن سعید بن العاص کا غلام تھا۔ انہوں نے مجھ کو مصر میں قبیلۂ ہذیل کے ایک شخص کو دیدیا۔ اس بیان سے ان دونوں روایتوں میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے، جن میں سے ایک سے اُن کا عمرو بن سعید کی غلامی میں ہونا اور دوسری سے ہذلی ہونا ثابت ہوتا ہے۔[1]

شوق علم ہذلی نے آزاد کر دیا تو آپ کو تحصیل علم کا شوق ہوا۔ اس سلسلہ میں اُنہوں نے طول طویل سفر کیے خود اُن کا اپنا بیان ہے "میں مصر میں اُس وقت تک مقیم رہا جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو گیا کہ یہاں علم نہیں ہے اور جو کچھ علم تھا وہ میں حاصل کر چکا تھا۔ یہاں سے روانہ ہو کر میں عراق آیا۔ جب یہاں کا تمام علم بھی میں نے حاصل کر لیا تو یہاں سے بھی روانہ ہوا اور سرچشمۂ علوم و معارف مدینہ میں پہنچ کر اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کا سامان کرنے لگا۔ غرض

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۶۱۔

کہ انہوں نے طلب علم میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان لیا تھا، اور جہاں سے جتنا کچھ علم ملا اُسے اپنے دامان شوق میں سمیٹ لیا، وہ خود فرماتے ہیں :-

طفت الارض فی طلب العلم — میں نے علم کی طلب میں زمین کا چکر لگایا تھا۔

مدینہ میں جس شان انہماک سے انہوں نے علم حاصل کیا اُس کو اس طرح بیان کرتے ہیں :- فلم ادع بھما علما الا حویت علیہ[1] — مدینہ اور عراق میں کوئی علم ایسا نہیں تھا جس کو میں نے حاصل نہ کیا ہو۔

فضل و کمال اُن کے اس شوق و ذوق اور محنت و جستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ "سرخیل علماءِ عصر" بن گئے امام زہری فرماتے تھے "علماء تین ہی ہیں۔ اُن میں سے ایک مکحول ہیں[2]۔ ابن یونس کہتے ہیں وہ "فقیہ و عالم تھے"۔ ابن عمار اُن کو اہل شام کا امام بتاتے ہیں۔ عجلی انہیں تابعی ثقہ کہتے ہیں۔ سلیمان بن موسیٰ کہتے تھے مکحول کا علم شام سے ہم تک پہنچا تو ہم نے اس کو قبول کر لیا[3]۔

حدیث جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے انہوں نے مدینہ، عراق، شام اور مصر میں علم حاصل کیا تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ اُن کو کن صحابہ سے لقاء حاصل ہے۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انہوں نے حضرت انس سے ملاقات کی تھی۔ خود اُن کا بیان ہے کہ میں نے دمشق کی مسجد میں حضرت انس کو دیکھا میں نے اُن کو سلام کیا اور اُن سے پوچھا کہ جنازہ اٹھانے اور اُس میں شریک ہونے کے بعد وضو کرنا چاہیے یا نہیں؟ فرمایا "ہم نمازیں تھے اور نماز

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱۔

کی طرف آئے ہیں پھر اس کے درمیان وضو کی کیا ضرورت ہے[1]؟

حضرت انس کے علاوہ اُن کے شیوخ کبار یہ ہیں:۔

شیوخ | واثلہ بن اسقع، ابوامامہ، محمود بن الربیع، عبیداللہ بن محیریز، عنبسہ بن ابی سفیان جبیر بن نفیر، سلیمان بن یسار، شرحبیل بن السمط، طاؤس بن کیسان، عراک بن مالک کثیر بن مرہ، وقاص بن ربیعہ، ام الدرداء الصغریٰ[2] مگر امام شعبی سے خصوصیت کے ساتھ استفادہ کیا تھا۔ اُن کا بیان ہے "لم ار مثلہ" (میں نے اُن جیسا نہیں دیکھا) ان کے بزرگوں کے علاوہ قاضی شریح کی مجلسوں میں بھی شریک رہے ہیں[3]۔

تلامذہ | اُن کے خوشہ چینوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، اُن میں مشہور یہ ہیں:۔ امام اوزاعی عبدالرحمن بن یزید، عکرمہ بن عمار، محمد بن الولید الزہری، محمد بن اسحٰق، حجاج بن ارطاۃ، برد بن سنان، زید بن واقد، ثور بن یزید، ایوب بن موسیٰ، محمد بن راشد، ثابت بن ثوبان وغیرہم۔

ثقاہت | حضرت مکحول کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ فرماتے تھے "جس کسی چیز کو میں اپنے سینہ میں محفوظ رکھتا تھا، اُس کی ضرورت پیش آتی تو فوراً یاد آجاتی تھی[4]" اس بناء پر ملک ملک کی خاک چھاننے کے بعد جو کچھ اُنہوں نے سُنا تھا اُن کے خزانۂ حافظہ میں جمع تھا۔ علامہ ابن سعد انہیں تابعین شام کے تیسرے طبقہ میں شمار کرتے ہیں[5]۔ ابن یونس کہتے

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۶۱ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۰ [3] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۶۰، ۱۶۱
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲ [5] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۰۔

ہیں[1] اُن کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے[2]۔ حافظ ذہبی انہیں تابعین کے تیسرے طبقہ اور کبار حفاظ میں شامل مانتے ہیں[3]

فقہ | حدیث میں امامت وکمال کے ساتھ وہ فقہ کے بھی مسلم امام تھے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں "میں نے شام میں مکحول سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا[4]۔ سعید بن عبدالعزیز کہتے تھے: مکحول زہری سے بڑے فقیہ تھے[5]۔ مروان بن محمد کا بیان ہے کہ کوئی شخص مکحول سے زیادہ فتویٰ میں بصیرت رکھنے والا نہیں تھا[6]۔ لیکن اس کمال تفقہ کے باوجود وہ فتویٰ دینے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں وہ اُس وقت تک فتویٰ نہیں دیتے تھے جب تک کہ پہلے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" نہ پڑھ لیتے تھے اور کسی مسئلہ میں حکم بیان کرنے کے بعد صاف طور سے فرما دیتے تھے "یہ میری رائے ہے اور رائے خطا بھی ہوتی ہے اور صواب بھی[7]"

خوف خدا | ان علمی کمالات کے ساتھ اخلاقی وباطنی محاسن سے بھی بحصۂ وافر بہرہ اندوز تھے خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے اپنی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ کرا رکھی تھی۔

رب اَعِذ مکحولاً من النار (ابن سعد) اے رب تو مکحول کو دوزخ سے دور رکھ

انفاق فی سبیل اللہ | حضرت مکحول اُن مجاہدین میں سے تھے جن کو خلافت کی طرف سے وظائف ملتے تھے۔ مگر حضرت مکحول اپنے وظیفہ سے خود جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کرتے تھے[8]۔

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۱۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۱ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۰۲
[4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۴۷ [5] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱ [6] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۴۶

[7] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۶۱۔ [8]

اور دوسرے مجاہدین کو بھی مدد دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کو کہیں سے دس ہزار دینار کی رقم خطیر ملی تو انھوں نے اس میں سے پچاس پچاس دینار مجاہدین کو گھوڑا خریدنے کے لیے دیے تھے۔[1]

ایک الزام اور اس کا ازالہ مکحول کی نسبت ایک عام اعتراض یہ ہے کہ وہ قدریہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے علامہ ابن سعد نے بعض ایسی روایتیں بھی نقل کی ہیں جن سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کا دامن اس الزام سے بالکل پاک تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں "تابعین میں سے صرف حسن اور مکحول دو بزرگ تھے جن کے متعلق شہرت تھی کہ قدریہ عقائد رکھتے ہیں۔ ہم نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ الزام سراسر غلط ہے"۔ ان کے علاوہ حضرت مکحول کے ایک شاگرد سعید بن عبدالعزیزؒ بھی اس عقیدہ سے ان کی برأت کی شہادت دیتے تھے۔[2] جوزجانی فرماتے ہیں :۔

ینوھو علیہ القدر وھو سعی علیہ — ان پر قدر کا شبہ کیا جاتا ہے مگر درحقیقت وہ ان پر اتہام ہے

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "یحییٰ بن معین کہتے تھے کہ مکحول قدری ہیں مگر پھر انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔"[3]

عام حالات مکحول انگوٹھی پہنتے تھے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ نماز پڑھتے وقت ایک ڈھیلا ڈھالا طیلسان زیب بدن فرماتے تھے، اور زبان میں کچھ لکنت بھی تھی۔

وفات باختلاف روایت ۱۱۲ھ، ۱۱۳ھ، ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۹۱ [3] ایضاً ص ۲۹۳۔

منصور بن زاذان

نام ونسب منصور نام، والد کا نام زاذان تھا، عراق کے مشہور شہر واسط کے باشندہ تھے بنو ثقیف کی غلامی میں ہونے کی وجہ سے ثقفی کہلاتے تھے[۱]

فضل وکمال حضرت منصور نے اپنے عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے استفادہ کیا تھا۔ اس بنا پر وہ واسط کے جلیل المرتبت علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:۔

وکان ثقۃً حجۃً صالحاً متعبداً کبیر الشان[۲] — منصور معتبر، حق کی دلیل، صالح، عبادت گذار اور بڑی شان والے تھے۔

شیوخ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ حضرت حسن بصری کے ساتھ مجالست کی تھی ان کے علاوہ آپ کے اساتذہ کرام یہ ہیں۔

انس بن مالک، ابو العالیہ الریاحی، محمد بن سیرین، عطاء بن ابی رباح، میمون بن ابی شبیب، معاویہ بن قرۃ، حمید بن ہلال، قتادہ، عمرو بن دینار، حکم بن عتیبہ، عبد الرحمن بن القاسم، محمد بن الولید بن مسلم العنزی۔

تلامذہ اُن کے بھتیجے مسلم بن سعید الواسطی، حبیب بن الشہید، جریر بن حازم، خلف بن خلیفہ، ہشیم، ابو حمزہ، ابو عوانہ وغیرہ اُن کے تلامذہ ہیں[۳]

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۶

ثقاہت | کیفیت کے اعتبار سے اُن کی روایتیں معتبر ہوتی تھیں۔ عبداللہ بن احمد اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ منصور شیخ ثقہ تھے۔ ابن معین، ابوحاتم اور امام نسائی انہیں ثقہ مانتے ہیں اور عجلی انہیں ثقہ ثبت کہتے تھے[۱]

قرآن مجید سے شغف | منصور کے صحیفۂ محاسن وکمالات کا روشن باب عبادت وریاضت تھا۔ ان کو قرآن مجید سے حد درجہ شغف تھا۔ رات کو نماز میں قرآن مجید پڑھنا شروع کرتے تو چاشت کے وقت تک ختم کر دیتے تھے۔ جب وہ سجدہائے قرآن ادا کرتے تو لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے پورا ایک قرآن ختم کرلیا ہے[۲]۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ فجر اور عصر کے درمیان ایک قرآن ختم کر دیتے تھے[۳]

قرآن مجید حتی الوسع جلد پڑھنا چاہتے تھے مگر پڑھ نہ سکتے تھے۔ ہشام بن حسان کا بیان ہے "ایک مرتبہ میں نے حضرت منصور کے ساتھ مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھی تو میں نے دیکھا کہ دوسری رکعت میں وہ سورۂ نحل تک پہنچ گئے[۴]"

رمضان میں خصوصیت کے ساتھ یہ شوق تیز تر ہو جاتا تھا، روزانہ کئی قرآن ختم کرتے تھے۔ نماز میں اس زور کا گریہ طاری ہوتا تھا کہ آنسوؤں کی وجہ سے عمامہ تر ہو جاتا تھا۔ نماز شروع کرنے سے قبل گیارہ سجدے کرتے تھے[۵]

تجرد | عبادت میں انہماک کے باعث وہ لوگوں سے الگ تھلگ اور علائق دنیویہ سے

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۶ [۲] ابن سعد ج ۶ ق ۲ ص ۶۰ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۱۴ [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴ [۵] حلیۃ الاولیاء ابونعیم ج ۳ ص ۵۸۔

زیادہ تر مجرد رہا کرتے تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں "وکان من المتقشفین المتجردین"[1] ابن عماد حنبلی انہیں "زاھد البصرۃ وشیخھا" لکھتے ہیں[2]۔

انہوں نے عبادت وریاضت میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی تھی۔ ان کے تلمیذ ہشیم کا بیان ہے کہ وہ اس درجہ کامل تھے کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ موت دروازہ پر کھڑی ہے تو بھی وہ عمل میں کوئی زیادتی نہیں کر سکتے تھے[3]۔

ان پر خوف خدا اس قدر مسلط تھا کہ غم وحزن کو سرور مفرط پر ترجیح دیتے تھے۔ خلف بن خلیفہ بیان کرتے ہیں کہ منصور بسا اوقات فرمایا کرتے تھے "غم اور رنج سے انسان کی نیکیوں میں زیادتی ہوتی ہے، اور اس کے برخلاف اکڑنا اور اترانا انسان کی برائیوں میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں"[4]۔

وفات | حضرت منصورؒ اپنے علم وفضل اور زہد وعبادت کی وجہ سے بلا قید ملت ومذہب ہر دلعزیز خلق تھے۔ ۱۳۱ھ میں مرض طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ اخیر عمر میں واسط سے ستائیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام مبارک ہے، منصور وہاں منتقل ہو گئے تھے[5]۔ جنازہ اٹھا تو اس میں ہر مذہب کے آدمی شریک تھے۔ عباد بن عوام کہتے ہیں۔ میں منصورؒ کے جنازہ میں شریک تھا، میں نے دیکھا کہ اس میں ایک طرف عیسائی بھی تھے اور ایک طرف یہودی بھی۔ ہجوم اس قدر تھا کہ میرے ماموں نے میرے گم ہو جانے کے

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۰۷ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۱ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۲
[4] ایضاً [5] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۸۰۔

ڈر سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔[1]

میمون بن مہران

نام ونسب | میمون نام، ابوایوب کنیت۔ والد کا نام مہران تھا۔ مہران بنو نصر بن معاویہ کے مکاتب غلام تھے۔ بدل کتابت ادا کرنے کے بعد آزاد ہو گئے تھے۔

پیدائش | میمون ۴۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً یہ قبیلۂ ازد کی ایک شاخ ثمالہ کی ایک عورت کے غلام تھے، اُس نے ان کو آزاد کر دیا تھا اس کے بعد بھی یہ کوفہ میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب محمد بن عبدالرحمٰن اشعث نے حجاج کے خلاف معرکہ آرائی کی جس کو حرب جماجم کہا جاتا ہے، تو میمون کوفہ چھوڑ کر جزیرہ میں آ بسے تھے، خود میمون بیان کرتے ہیں کہ جنگ جماجم کا آغاز ۸۳ھ میں ہوا تھا۔ اس حساب سے وہ کم وبیش چالیس سال کی عمر میں جزیرہ منتقل ہو گئے تھے۔

فضل وکمال | اُم نمر کی غلامی کے باوجود میمون نے تحصیل علم میں کوتاہی نہیں کی۔ انہوں نے عمر کے چالیس برس کوفہ میں ہی بسر کیے تھے جو اس وقت اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس لیے صرف ذوقِ خداداد درکار تھا، انہوں نے اکابر امت سے استفادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میمون ائمہ روزگار میں سے ہو گئے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کان ثقۃ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۴۔

کثیر الحدیث تھا۔ حافظ ذہبی اُن کو امام و پیشوا قرار دیتے ہیں۔ اور جزیرہ کا نمایاں عالم بتلاتے ہیں[1]

سلیمان بن موسیٰ الفقیہ کا بیان ہے "ہشام کی خلافت میں چار بزرگ تھے جن کو علماء امام

کہا جاتا تھا۔ حسن بصری، مکحول دمشقی، میمون بن مہران اور شہاب الدین زہری۔ ابو الملیح

کہتے تھے "میں نے کوئی شخص میمون سے افضل نہیں دیکھا"[2]

حدیث | فن حدیث میں مسلم الثبوت امام تھے، انہوں نے صحابہ کرام میں ام المومنین حضرت

عائشہ صدیقہؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ اور تابعین میں سعید بن جبیرؒ، نافع مولیٰ

ابن عمر، مقسم مولیٰ ابن عباسؓ، یزید بن عاصم وغیرہ سے استفادہ کیا تھا"

تلامذہ | اُن کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، مشہور نام یہ ہیں، خود اُن کے فرزند عمرو بن میمون،

حمید الطویل۔ ایوب، جعفر بن برقان، جعفر بن ابی وحشیہ، جیب بن الشہید، علی بن الحکم

النبانی، حکم بن عتیبہ، ابو فروۃ یزید بن سنان الرہاوی۔ حجاج بن تمیم، سالم بن مہاجر۔ ابو الملیح

الرقی[2]

اُن کی مرویات کا پایہ | کیفیت کے لحاظ سے اُن کی مرویات کا پایہ بلند تھا۔ علامہ ابن سعد کا قول پہلے

گذر چکا ہے، ابو عروبہ انہیں تابعین کے حلقۂ اول میں شمار کرتے ہیں، احمد کہا

کرتے تھے "میمون بن مہران حضرت عکرمہ سے زیادہ ثقہ ہیں"[3] عجلی کہتے ہیں "تابعی ثقہ"[3]

ابو زرعہ اور امام نسائی بھی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔

فقہ | فقہ میں وہ تمام علماء جزیرہ میں ممتاز تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۰ [3] ایضاً

وکان الغالب فی الجزیرۃ فی	فتوی اور فقہ میں جزیرہ میں سب پر
الفتوی والفقہ[1]	غالب تھے۔

تحصیل علم کے زمانہ میں ہی اُن کو فقہ میں اچھی مہارت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں "میں مدینہ میں آیا تو دریافت کیا کہ یہاں کا سب سے بڑا فقیہہ کون ہے؟ لوگوں نے حضرت سعید بن المسیب کا نام لیا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سوالات کرنے لگا۔ سعید نے فرمایا "تم تو اس شخص کی طرح سوالات کرتے ہو جو اُن تمام چیزوں کا ماہر ہو جو آج سے پہلے تک یہاں موجود رہی ہیں[2]"

لوگوں کو اُن کے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ عبدالکریم فرماتے ہیں "اے اہل رقہ ہم کو تمہارا علم نہیں ہے۔ بس جو علم ہمارے پاس میمون بن مہران کی جانب سے آتا ہے ہم اُس کو قبول کر لیتے ہیں اور جس شخص کو ہم اُن کے جادہ سے منحرف دیکھتے ہیں اُسے رد کر دیتے ہیں[3]"

ان علمی کمالات کے باعث حضرت عمر بن عبدالعزیز ایسا مردم شناس بزرگ میمون کا بڑا احترام کرتا تھا۔ آپ میمون کو دیکھتے تو فرماتے "جب میمون اور اُن کے مثل اس دنیا میں نہیں رہینگے تو لوگ مضطرب ہو جائینگے"۔ مگر خود حضرت میمون کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے کہا "جب تک آپ اس دنیا میں رہینگے لوگوں کی حالت بہتر رہیگی" آپ نے فرمایا "جاؤ اپنا کام کرو، لوگ تو اُس وقت تک بہتر حالت میں

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۷۸۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۱ [3] ایضاً ص ۳۹۲۔

رہینگے، جب تک وہ اپنے رب سے ڈرتے رہینگے۔[1]

ولایت خراج | میمون اپنی معاش کے لیے کپڑوں کی تجارت کا کام کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں ان کی دیانت و امانت پر اعتماد کرکے انہیں خراج وصول کرنے کا مہتمم بنادیا تھا، لیکن میمون اس درجہ محتاط تھے کہ وہ اس کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس اپنا استعفار بھی بھیج دیا تھا، مگر اُس کو باب خلافت میں منظور نہیں کیا گیا، اور حضرت عمرؓ نے لکھا "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، صرف درہم کا معاملہ ہے، تم اُس کو حق سے لوگے اور حق کی جگہ ہی میں رکھوگے" اس کے بعد حضرت عمرؒ کی خلافت کے اختتام تک آپ برابر اس کار خیر کو انجام دیتے رہے۔ اس سے قبل محمد بن مروان کی طرف سے آپ بیت المال کے سر دفتر تھے۔ میمون خراج کی ولایت کا تمام کام اپنی دکان میں ہی بیٹھ کر انجام دیتے تھے، آپ کے صاحبزادے عمرو بن میمون دفتر کے محافظ تھے۔

حضرتِ عمرؒ کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اُس کے عہد میں بھی چند ماہ تک خراج کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مگر پھر مستعفی ہوگئے۔ بعض دوستوں نے استعفا واپس لینے کا مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا "میری آنکھیں جاتی رہتیں، اور (تذکرۃ الحفاظ میں ہے) میری انگلیاں کٹ جاتیں، یہ مجھ کو زیادہ پسند تھا بہ نسبت اس کے کہ میں کسی عہدہ کا انچارج ہوتا"۔ کسی نے دریافت کیا "حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف سے بھی؟ فرمایا:

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۱۔

ہاں! وہ عہدہ حضرت عمرؓ کی طرف سے پیش کیا جاتا یا کسی اور کی جانب سے[1]

قضا | عہدۂ خراج ہی نہیں، بلکہ حضرت عمرؓ نے میمونؒ کی جامعیت و فقاہت کی قدر کرتے ہوئے انہیں جزیرہ کا قاضی بھی بنا دیا تھا۔[2]

معصیت سے اجتناب | حضرت میمونؒ پر خشیت ربانی کا بڑا غلبہ تھا، ممنوعات سے بہت اجتناب کرتے تھے۔ اُن کے صاحبزادہ عمرو بن میمونؒ کا بیان ہے کہ میرے والد (فرائض کے علاوہ) زیادہ نماز روزہ نہیں کرتے تھے، مگر معصیت کے قریب جانے کو بُرا جانتے تھے۔[3]

عبادت | اگرچہ عموماً وہ فرائض و سُنن کے علاوہ زیادہ عبادت نہ کرتے تھے۔ تاہم کبھی کبھی ہزار ہزار رکعتیں روزانہ پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ سترہ دن میں سترہ ہزار رکعتیں پڑھیں۔[4]

سلامت روی | حضرت میمونؒ جلیل القدر عالم ہونے کے باوجود بیحد سلیم الطبع تھے۔ اگر اپنی کسی رائے کے خلاف کوئی مضبوط دلیل سُنتے تھے، تو فوراً اُس سے رجوع کر لیتے تھے۔ بعض دلائل کی بنا پر آپ کا خیال یہ تھا کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ سے افضل ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس سلسلہ میں فرمایا "آپ کی کیا رائے ہے، وہ شخص افضل ہے جس نے مال کے خرچ کرنے میں عجلت کی (یعنی حضرت عثمانؓ) یا وہ جس نے خون بہانے میں عجلت کی (یعنی حضرت علیؓ) یہ استدلال سُن کر حضرت میمونؒ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا، اور فرمایا کہ اب آئندہ اپنی رائے پر قائم نہیں رہونگا۔

---

[1] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۸۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲
[3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۱ [4] ایضاً ص ۳۹۲۔

وفات | ہشام بن عبدالملک کے عہد میں سنہ ۱۱۱ھ میں وفات پائی، ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عبادت کرنے کے باعث پیٹ میں کوئی سخت تکلیف ہوگئی تھی اس کی وجہ سے انتقال ہوا۔[1]

سلمہ بن دینار

نام نسب | سلمہ نام، ابوحازم کنیت۔ فارس کے رہنے والے تھے، والد کا نام دینار تھا۔ اسود ابن سفیان مخزومی کے غلام تھے۔ بعض لوگوں نے ان کو بنو شجع کا غلام بتایا ہے، مگر علامہ ابن حجر نے اس کو وہم قرار دیا ہے۔

فضل وکمال | سلمہ نسلاً عجمی اور غلام تھے، مگر ان کے ذاتی شوق علم اور اسلام کے فیض مساوات نے ان کو سرآمد روزگار بنا دیا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں "سلمہ واعظ زاہد، مدینہ کے عالم اور شیخ تھے"[2] علامہ نووی انہیں "الفقیہ المشہور بالمحاسن" لکھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ انکی ثقاہت وجلالت اور شرف پر سب کا اتفاق ہے[3]۔ ابن خزیمہ فرماتے ہیں:۔

لم یکن فی زمانہ احد مثلہ[4] ان کے زمانہ میں کوئی ان جیسا نہیں تھا۔

حدیث | حدیث کے بڑے حافظ تھے، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "کان ثقۃ کثیر الحدیث"[5]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۹۲۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [3] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۹
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [5] بحوالہ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴

شیوخ | انہوں نے صحابۂ کرام میں سہل بن سعد الساعدیؓ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایتیں کی ہیں مگر اُن کے صاحبزادے نے یحییٰ بن صالح سے بیان کیا کہ جو شخص تم سے یہ کہتا ہے کہ میرے والد نے سہل بن سعدؓ کے علاوہ کسی اور صحابی سے بھی سماع کیا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں حضرت سہلؓ کے علاوہ کسی اور سے سماع ثابت نہیں ہے۔

غیر صحابی علماء میں ایک جماعت کثیر سے روایتیں کی ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔

ابوامامہ بن سہل بن حنیف، سعید بن المسیب، عامر بن عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن ابی قتادہ، نعمان بن ابی عیاش، یزید بن رومان، عبیداللہ بن مقسم، ابراہیم بن عبدالرحمن، ابوصالح السمان، ابوسلمۃ بن عبدالرحمن، ابن المنکدر وغیرہم

تلامذہ | جن بزرگوں نے سلمہ سے روایتیں نقل کی ہیں اور اُن کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں اُن میں سے مشہور علماء کے نام یہ ہیں۔

امام زہری، عبیداللہ بن عمرو بن اسحٰق، ابن عجلان۔ ابن ابی ذئب، مالک، حماد، سلیمان بن بلال، سعید بن ابی ہلال، سفیان ثوری، سفیان بن ابی عیینہ، ابوغسان المدنی، ہشام بن سعد، وہیب بن خالد، ابوصخر حمید بن زیاد الخراط، اسامہ بن زید اللیثی[2]۔

ثقاہت کے اعتبار سے اُن کی روایتیں معتبر ہوتی تھیں۔ امام احمد بن حنبل، ابوحاتم، عجلی،

[1] بحوالہ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔

اور امام نسائی انہیں "ثقہ" کہتے ہیں۔ ابن حبان نے بھی اُن کا شمار ثقات میں کیا ہے[1]۔

فقہ | فقہ میں بھی انہیں کمال حاصل تھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:۔

وکان فقیہ النفس مناقب ابی حازم کثیرۃ وکان فقیھا ثبتا کثیر العلم کبیر القدر[2]

سلمہ نفس کے فقیہ تھے اُن کے مناقب بہت ہیں اور وہ فقیہ معتبر تھے، اُن کا علم بہت اور اُن کا مرتبہ بڑا تھا۔

علامہ نووی انہیں "الفقیہ المشہور بالمحاسن" لکھتے ہیں۔ اس کمال تفقہ کے باعث ہی چند دنوں تک وہ مدینہ کے قاضی رہے تھے[3]۔

وعظ | معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمہ مستقلاً وعظ بھی کہتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی دونوں انہیں "القاص الواعظ" (قصہ گو اور واعظ) لکھتے ہیں[4]

وسیلۂ معاش | اتنے بڑے عالم کامل ہونے کے باوجود کھجوروں کی تجارت کرکے معاش حاصل کرتے تھے[4]۔

زہد و عبادت | وہ جس طرح علماء مدینہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے زہد و عبادت کے لحاظ سے بھی اُن میں ممتاز تھے۔ ابن حبان لکھتے ہیں "سلمہ مدینہ کے مشہور عابد و زاہد تھے[5]"

امراء و سلاطین سے استغناء | خودداری کا عالم یہ تھا کہ امراء و سلاطین سے الگ تھلگ رہتے تھے، خود جانا تو درکنار بلائے بھی جاتے تب بھی نہیں جاتے تھے۔ ایک مرتبہ امام زہری

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۶ [3] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [5] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۴۴۔

کی وساطت سے خلیفہ وقت سلیمان بن عبد الملک نے اُن کو بلایا تو آپ نہیں گئے اور یہ کہلا بھیجا "اگر اس کو مجھ سے کچھ کام ہے تو اُسے میرے پاس آنا چاہیے۔ رہا میں تو مجھ کو اس کی طرف کوئی حاجت نہیں ہے۔

حکمت آبی ان اخلاقی و علمی کمالات کے ساتھ قدرت نے انہیں حکمت و فرزانگی سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کے منہ سے حکمت بہ نسبت ابو حازم کے زیادہ قریب ہو[1]۔ ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ سلمہ کی برابر کسی شخص کے پاس حکمت و وعظ کی باتیں نہیں تھیں[2]۔

اقوال حکیمانہ آپ کے بعض حکیمانہ مقولے مشہور ہیں جن کو حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے اُن سے آپ کی حکمت کا اندازہ ہو سکتا ہے، فرماتے ہیں "ہر وہ عمل جس کی وجہ سے موت کا خوف کیا جاتا ہو اُسے ترک کر دو، پھر تم جب مروگے تو موت تمہیں ضرر نہیں پہنچائیگی" ایک مرتبہ اُنھوں نے فرمایا کہ "جو شخص اللہ کے اور اپنے تعلق کو درست رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسرے بندگانِ خدا کے درمیانی تعلقات کو بہتر بنا دیتا ہے۔ اور جو شخص اپنے اور اللہ کے تعلق کو خراب رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کے اور دوسرے بندوں کے تعلقات کو خراب کر دیتا ہے، ایک شخص کے ساتھ رکھ رکھاؤ رکھنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام اشخاص کے ساتھ نباہ کی کوشش کی جائے"۔ ایک مرتبہ خلیفہ ہشام نے آپ سے دریافت کیا "میں امور سلطنت کی ذمہ داریوں سے کس طرح

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۸

عہدہ برآ ہو سکتا ہوں؟ فرمایا "یہ تو بہت آسان ہے، ہر چیز کو اس کے جائز طریقہ سے حاصل کرو اور پھر جائز مصارف میں ہی خرچ کرو"۔ ہشام بولا "یہ تو صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق خاص سے خواہشات نفس سے بری رکھا ہو"[1]

وفات | ۱۴۱ھ میں وفات پائی[2]

عبداللہ بن عون

نام و نسب | عبداللہ نام ابوعون کنیت، عبداللہ بن درہ کے غلام تھے۔

پیدائش | سیلِ جارف سے تین سال قبل پیدا ہوئے[3]

فضل و کمال | کوفہ کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں میں نے ایوب، یونس، تیمی اور ابن عون جیسے فضلا کسی ایک شہر میں یکجا نہیں دیکھے[4] حضرت شعبہ فرماتے تھے میں نے ابنِ عون، ایوب اور یونس جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا بیان ہے کہ عراق میں ابن عون سے زیادہ سنت کو جاننے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ہشام ابن حسان کہتے تھے "میری دونوں آنکھوں نے ابن عون جیسا کوئی نہیں دیکھا"[5]۔ حافظ ذہبی ان کے علم و فضل کی داد ان لفظوں میں دیتے ہیں۔

لابن عون جلالۃ عجیبۃ و وقع فی النفوس لانہ کان اماما فی	ابن عون کی بڑی شان اور دلوں میں بڑی وقعت تھی، کیونکہ وہ علم میں اور عبادت و

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ و ۱۲۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۶ [3] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵ [4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۷ [5] یہ سب اقوال تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۷، ۱۴۸ سے ماخوذ ہیں۔

فی العلم راساً فی التالّٰہ والعبادۃ | خدا پرستی میں سردار تھے اپنے انفاس کی
حافظاً لانفاسہ کبیر الشان[1] | حفاظت کرتے تھے (یعنی بیکار وقت ضائع

نہیں کرتے تھے) اور بلند شان والے تھے۔

ابن عماد حنبلی انہیں امام اور شیخ اھل البصرۃ وعالمھم لکھتے ہیں[2]۔

حدیث — ابن عون بصرہ کے رہنے والے تھے۔ مگر علم حدیث کے شوق میں انہوں نے مختلف شہروں کے ائمہ حدیث سے کسب فیض کیا تھا اور متعدد مراکز حدیث کے موتیوں کو اپنے دامانِ طلب میں جمع کرلیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے پاس احادیث کا ایسا عمدہ ذخیرہ اکٹھا ہوگیا تھا جو کسی کے پاس نہیں تھا۔ ابن مدائنی فرماتے ہیں "ابن عون کے پاس ایسی عمدہ اسانید جمع ہوگئی تھیں جو ان کے کسی ساتھی کے پاس نہیں تھیں، انہوں نے مدینہ میں قاسم اور سالم سے، بصرہ میں حسن بصری اور محمد بن سیرین سے، کوفہ میں شعبی اور نخعی سے مکہ میں عطا اور مجاہد سے، شام میں مکحول اور رجاء بن حیوٰۃ سے سماع حدیث کیا تھا۔ یعنی وہ اس عہد کے تمام بڑے بڑے سرچشمہائے علم وفضل سے سیراب ہوئے تھے۔

ان بزرگانِ حدیث کے علاوہ انہوں نے جن سے شرف تلمذ حاصل کیا، حافظ ابن حجر نے ان کی ایک طویل فہرست دی ہے، ان میں سے بعض نام یہ ہیں:۔

ثمامہ بن عبداللہ بن انس، انس بن سیرین، ابراہیم النخعی، زیاد بن جبیر، امام شعبی سعید بن جبیر، موسیٰ بن انس بن مالک، ہشام بن زید بن انس اور حضرت نافع رحمہم اللہ

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۴۷

ان اکابر اسلام کے فیض نے ابن عون کو بصرہ کا مرجع علم بنا دیا تھا۔ وہیب کہتے تھے بصرہ کا امر صرف چار لوگوں پر منحصر تھا۔ ایوب، یونس، تیمی، ابن عون[۱]۔ علامہ ابن سعد انہیں ثقۃ کثیر الحدیث لکھتے ہیں[۲]۔ ابن مبارک کہتے تھے کہ میں نے جن جن لوگوں کا تذکرہ سنا تھا، ملاقات کے بعد سب کو کمتر پایا، بجز ابن عون، سفیان اور حیوٰۃ کے، پھر ان تینوں میں بھی ابن عون کا حال یہ تھا کہ میں چاہتا تھا کہ ان کے دامن سے وابستہ ہو جاؤں، اور اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک کہ میں نہ مر جاؤں یا وہ[۳]۔ ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں اور اپنے عہد کا سردار کہتے ہیں۔ امام نسائی ایک جگہ انہیں ثقۃ مامون اور دوسرے مقام پر ثقۃ ثبت کہتے ہیں۔ حضرت شعبہ فرماتے تھے "ابن عون مجھ سے کوئی روایت بیان کریں اور فرمائیں "میرا گمان ہے کہ میں نے یہ سنا ہے" یہ بالیقین مجھ کو زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ میں اس روایت کو ان کے علاوہ کسی دوسرے ثقہ سے سنوں[۴]۔ ان پر لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ عثمان بتی کہتے تھے "کسی شخص کی شہادت اس کے باپ کے حق میں جائز نہیں ہے لیکن ابن عون اس سے مستثنیٰ ہیں[۵]۔"

احتیاط فی الحدیث

اس کمال علم و فضل اور نہایت ثقاہت کے باوجود وہ روایت حدیث میں بڑی احتیاط کرتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے راستہ چلنا بند کر دیا تھا۔ بکار بن محمد

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۶ و ۳۴۷ [۲] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۴۔
[۳] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۷ [۴] ایضاً [۵] حاشیہ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۸۔

کا بیان ہے کہ حضرت ابنِ عون نے مجھ سے کہا کہ "بھتیجے لوگوں نے میرا راستہ بند کر دیا ہے میں اپنی ضرورت کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں آ جا سکتا ہوں"۔ بکار کہتے ہیں اس سے ابن عون کی مراد یہ تھی کہ لوگ اُن سے حدیثیں پوچھتے تھے[1]۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ احادیث بیان کرتے بھی تھے تو ہر ایک شخص کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے بلکہ جن کو صاحبِ ذوق و صلاحیت سمجھتے تھے اُن کو احادیث سُناتے تھے۔ بکار کا بیان ہے کہ ابن عون کے صرف چند مخصوص بھائی تھے جن کے سامنے وہ احادیث بیان کرتے تھے اور جماعت کو سماع حدیث کی اجازت نہیں دیتے تھے[2]۔

محمد بن سیرین ایک مرتبہ اُن کے پیچھے چلنے لگے، غالباً سماعِ حدیث کے لیے ابن عون نے پوچھا "تمہیں کچھ کام ہے؟ بولے نہیں" فرمایا "تو پھر واپس چلے جاؤ"۔

محمد کے ساتھ ابن عون خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ابن عون انہیں احادیث سُناتے جس کو وہ کہہ دیتے کہ کیا عمدہ ہے، اُسے بیان کرتے تھے۔ اور جس پر وہ نہیں کہتے تھے اُسے بیان نہیں کرتے تھے[3]۔

خشوع | احادیث بیان کرتے وقت ایک خاص قسم کا خشوع و خضوع اس خیال سے طاری ہو جاتا تھا کہ کہیں اُنھوں نے حدیث میں زیادتی یا کمی نہ کر دی ہو، اس خشوع کا یہ عالم ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کو رحم آ جاتا تھا[4]۔

تلامذہ | روایت میں بڑے محتاط تھے، اس کے باوجود اُن کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، اور

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۵ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

اُس سے بڑے بڑے ائمہ حدیث پیدا ہوئے۔ مثلاً حضرت اعمش، سفیان ثوری، شعبہ اور ابن مبارک عام تلامذہ میں قابل ذکر یہ ہیں۔

داؤد بن ہند، یحییٰ القطان، بشر بن المفضل، ازہر بن سعد السمان۔ معاذ بن معاذ نضر بن شمیل، یزید بن ہارون، ابو العاصم، محمد بن عبد اللہ۔

زہد و ورع | علم و فضل کے ساتھ حضرت ابن عون کے مکارم اخلاق کا طغرائے امتیاز زہد و ورع تھا۔ بکار بن محمد کا بیان ہے کہ میں نے ابن عون کو کبھی کسی سے مذاق کرتے، شعر پڑھتے اور جھگڑتے نہیں دیکھا۔ انہیں اپنے کام سے کام تھا۔[1]

قرہ کہتے تھے "ہم ابن سیرین کے زہد و ورع پر تعجب کرتے تھے۔ مگر ابن عون نے تو اُن کی یاد بھی بھلادی۔" امام اوزاعی فرماتے تھے "ابن عونؒ اور سفیانؒ کی وفات کے بعد تو سب لوگ برابر ہوگئے۔"[2] ابن حبان کا بیان ہے کہ ابن عون عبادت و ریاضت زہد و ورع، سُنت کی پابندی، ارباب بدعت پر تشدد اور فضل و کمال کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے سردار تھے۔[3] علم کی ذمہ داری شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے، فرماتے تھے "میں چاہتا ہوں کہ علم کی ذمہ داری سے برابر سرابر عہدہ برآ ہو جاؤں۔"[4] ورع کا یہ عالم تھا کہ کبھی سچی یا جھوٹی قسم نہیں کھائی۔

عقیدہ میں تشدد | صحابۂ کرام کے پاک اور صاف عقائد کے سختی کے ساتھ پابند تھے اور اُن میں مبتدعانہ خیالات کی آمیزش کو پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے سامنے فرقہ

---

[1] ابن سعد، ج ۷ ق ۲ ص ۲۵ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸، ۱۴۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۴۸ [4] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۵۔

قدریہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے "میری عمر اس عقیدہ کی عمر سے زیادہ ہے۔ میں نے دو شخصوں معبد الجہنی اور سنہویہ کے علاوہ اسلاف میں کسی کو اس کا ذکر کرتے نہیں سُنا۔ اس طرح کے خیالات رکھنا شر ہے"[1] وہ ایسے لوگوں کو سلام تک کرنے کے روادار نہیں تھے۔[2]

عبادت | اپنے اوقات کے بڑے پابند تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ جتنا وقت بچتا تھا اُس کا بیشتر حصّہ عبادت میں گذارتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتے اور ذکر اللہ کرتے رہتے تھے۔ آفتاب کے طلوع ہو جانے پر نماز پڑھتے اور پھر اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ ایک ہفتہ میں قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن روزہ رکھتے، اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ غسل کرکے بہترین لباس زیب تن فرماتے خوشبو لگاتے، اور نماز جمعہ کے لیے نہ تو بہت پہلے جاتے اور نہ بالکل اخیر میں، بلکہ ہر امر میں اعتدال مرعی رکھتے تھے۔ جامع مسجد کبھی پا پیادہ آتے اور کبھی سواری پر آتے تھے، جمعہ کے فرض مسجد میں پڑھتے تھے۔ اور سُنن و نوافل گھر پر پڑھتے تھے۔ رمضان میں عبادت اور بڑھ جاتی تھی۔ فرض نماز باجماعت پڑھ کر گھر چلے آتے، اور تنہائی میں عبادت کرتے۔ یہ اُن کا معمول تھا جس میں وفات کے وقت تک فرق نہیں آیا۔[3]

لہسن سے اجتناب | لہسن سے منہ میں ایک طرح کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عون عبادت زیادہ کرتے تھے، اس لیے وہ لہسن سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ اُن کو اگر

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۷ [2] ایضاً ص ۲۵ [3] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۶ و تذکرۃ الحفاظ

کسی کھانے میں لہسن کا اثر بھی محسوس ہو جاتا تھا تو اس کو نہیں چکھتے تھے۔

جہاد فی سبیل اللہ زہد و عبادت کے ساتھ اُن میں جہاد کا بھی بڑا ولولہ تھا۔ خاص اسی مقصد کے لیے اُنہوں نے ایک اونٹنی پال رکھی تھی۔ علامہ ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ اُنہوں نے ایک رومی سے جنگ کرکے اُس کو قتل کر دیا تھا۔

احسان میں اخفاء لوگوں پر احسان کرتے تھے، مگر بڑے اخفا کے ساتھ۔

اخلاق عام لوگوں کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، حلم اور بردباری میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے غلام نے اُن کی ناقہ کے چہرہ پر مار دیا جس سے اُس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ ابن عون نے ناقہ کو اس حال میں دیکھا تو غلام سے صرف یہ فرمایا "کیا مارنے کے لیے ناقہ کا صرف چہرہ ہی رہ گیا تھا۔ اللہ تجھ کو برکت دے۔ تو میرے پاس سے چلا جا، جا تو آزاد ہے"

بکار کا بیان ہے کہ میں نے ابن عون کے ساتھ عرصہ دراز تک مصاحبت کی ہے۔ میں نے کسی شخص کو اُن سے زیادہ زبان پر قابو رکھنے والا نہیں دیکھا۔ وہ اپنی لونڈی غلاموں بلکہ مرغی بکری تک کو بُرا بھلا نہیں کہتے تھے۔

لونڈی غلام تو پھر بھی اپنے ہی تھے۔ وہ دشمنوں کو بھی بُرا نہیں کہتے تھے۔ ابن عون نے ایک عربی عورت سے شادی کر لی تھی، اس جرم میں بلال ابن بردہ نے اُن کو زد و کوب کرایا تھا، لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے بلال کے متعلق کبھی ایک حرف بُرا نہیں کہا۔ ایک مرتبہ بعض لوگوں نے کہا کہ بلال نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے

تو آپ نے فرمایا کہ "ایک آدمی مظلوم ہوتا ہے مگر پھر وہی ظلم کی شکایت کر کے ظالم بن جاتا ہے۔ تم میں سے کوئی بھی بلال کے متعلق اتنا سخت نہیں ہے جتنا کہ میں ہوں لیکن میں اس کے ظلم کی شکایت کر کے ظالم نہیں بنونگا۔"

پہلے گذر چکا ہے کہ ابن عون لہسن بالکل نہیں کھاتے تھے۔ بکار بن محمد کی ایک باندی عینا حضرت ابن عون کی خدمت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے آپ کے لیے کھانا تیار کیا جس میں لہسن ڈالدیا۔ حضرت ابن عون کے سامنے کھانا آیا تو لہسن کی بو سونگھ کر کھانے سے دستکش ہو گئے اور ناگواری طبع کے باوجود اس سے صرف یہ کہا "اللہ تم کو برکت دے، اللہ تم کو برکت دے۔ تم اس کھانے کو میرے پاس سے اٹھالو" عینا کہتی ہے کہ میں نے کھانا تو اٹھا لیا مگر ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ اور بھاگ کر میں نے سیرین کے گھر میں پناہ لی۔[1]

علالت | آپ کو ذاتِ نبوی کے ساتھ والہانہ شیفتگی تھی، بڑی آرزو رکھتے تھے کہ ایک مرتبہ خواب میں ہی جمال جہاں افروز نبوی کے دیدار سے شادکام ہو جائیں اُن کی یہ تمنا برآئی اور وہ خواب میں دیدار جمال نبوی سے مشرف ہوئے۔ اس شرف پر ایسے وارفتہ ہوئے کہ بالاخانہ سے اتر کر مسجد میں آنا چاہتے تھے کہ گر پڑے۔ پیروں میں چوٹ آئی، مگر آپ نے اس کا علاج نہیں کرایا۔

وفات | آخرکار یہ چوٹ ہی مرض الموت کا سبب بن گئی۔ آپ بیماری میں نہایت صابر

---

[1] یہ سب واقعات ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۲۶، ۲۷، ۲۸ سے ماخوذ ہیں۔

شاکر رہتے تھے۔ زبان پر حرف شکایت نہیں لاتے تھے۔ بکار بن محمد کہتے ہیں کہ ابن عون بیماری کی حالت میں شیر سے زیادہ شاکر رہتے تھے۔ آخری سانس تک قبلہ رو ہو کر خدا کا ذکر کرتے رہے۔ انجام کار اس قید ہستی سے نجات پائی اور ۱۵۱ھ میں واصل الی اللہ ہو گئے۔

جنازہ | جنازہ اٹھا تو اس شان سے کہ بیشمار خلقت شریک جنازہ تھی۔ مسجد کا صحن اور اس کی عمارت ناکافی ثابت ہوئی اور محراب میں رکھ کر نماز پڑھائی گئی۔

بارگاہ نبوت میں مقبولیت | حضرت ابن عون کو ذات نبوی کے ساتھ جو والہانہ شیفتگی تھی اس کی مقبولیت کی سند یہ ہے کہ ابن عون کی زندگی میں بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں "ابن عون کی زیارت کرو"

ترکہ | ترکہ میں نقد روپیہ کچھ نہیں چھوڑا، صرف دو مکان تھے، مرض الموت میں پانچویں حصہ کی وصیت اعزا، کے لیے کر گئے تھے۔ دس ہزار کا قرض چھوڑا تھا، اس کو ادا کرنے کے بعد وصیت پوری کر دی گئی۔

حلیہ | خدا نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت بھی دیا تھا۔ پھر مزاج بھی لطیف و نفیس پایا تھا۔ نرم اور باریک کپڑے پہنتے تھے اور خوشبو کا استعمال کثرت سے کرتے تھے۔ پورا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلتے تھے۔ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے تو خادم تولیہ پیش کرتا اور آپ اس سے ہاتھ منہ صاف کرتے تھے۔[1]

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۶-۲۹-۳۰۔

عمرو بن دینار

نام ونسب | عمرو نام، ابو محمد کنیت۔ باذان کے غلام تھے۔

پیدائش | سنہ ۴۶ھ یا اس کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

علم وفضل | حضرت عمرو اس عہد کے اکثر دوسرے علماء وفضلاء کی طرح اگرچہ غلام تھے لیکن اسلام نے غلاموں کو کسب فضل وکمال کے جو مواقع عنایت فرمائے ہیں، حضرت عمرو اس کی ایک روشن مثال تھے۔ اکابر امت ان کی جلالتِ علم کے معترف ہیں۔ حافظ ذہبی انہیں الحافظ الامام اور عالم الحرم لکھتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں: "ان کی جلالت امامت اور ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے وہ ائمہ تابعین میں سے تھے۔"

حضرت عمرو بن دینار کا علم نہایت وسیع تھا اور اس کی شہرت دور دور تھی طاؤس نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے کو ہدایت کی کہ "مکہ جاؤ تو عمرو بن دینار سے ضرور ملنا ان کے کان علماء کے لیے خریطہ ہیں" (کہ جو سنتے ہیں سب سینہ میں محفوظ کر لیتے ہیں)[1] ابن مہدی کہتے ہیں۔ حضرت شعبہ فرماتے تھے "میں نے عمرو بن دینار ایسا کوئی نہیں دیکھا"[2]۔

حدیث | حدیث ان کا خاص فن تھا۔ علامہ ذہبی انہیں حافظ حدیث تسلیم کرتے ہیں

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷۔

اور علامہ ابن سعد فرماتے ہیں۔

کان عمرو ثقۃ ثبتا کثیر الحدیث[1] عمرو ثقہ تھے، ثبت اور کثیر الحدیث تھے۔

صحابہ میں اُنھوں نے جلیل القدر اساطین اُمت سے فیض حاصل کیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ، ابوالطفیل، سائب بن یزید رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اور تابعین میں حضرت سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، طاؤس بن کیسان۔ عطاء بن ابی رباح، سالم بن عبداللہ، مجاہد، محمد بن علی۔ ابن ابی ملیکہ، سلیمان بن یسار اور امام زہریؒ وغیرہ سے حدیث سُنی تھی۔

تلامذہ | جنھوں نے اُن سے استفادہ کیا، اُن میں زیادہ مشہور اور قابل ذکر یہ ہیں:

ابن جریج، دونوں حماد، سفیان بن عینیہ، سفیان ثوری اور ورقاء۔

مرویات کا پایہ | تثبت اور ثقاہت کے لحاظ سے اُن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مسعر سے کسی نے اُن کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: ثقۃٌ ثقۃٌ ثقۃٌ۔ حضرت شعبہ فرماتے ہیں "میں نے ان سے زیادہ صاحب تثبت کوئی نہیں دیکھا[2]۔ سفیان نے ایک مرتبہ سعد سے پوچھا "آپ نے حدیثوں میں سب سے زیادہ متقن کس کو پایا؟" فرمایا عمرو بن دینار، اور قاسم بن عبدالرحمٰن کو۔ ابن عینیہ اور جریر انہیں ثقۃٌ ثبت صدوق کثیر الحدیث کہتے تھے[3]۔

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶، ۱۰۷ [3] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۰

حضرت عمرو بن دینار کی ذات مشتاقانِ حدیث کے لیے مرکز توجہ تھی۔ لوگ دوسروں سے پوچھ پوچھ کر اُن کی روایات لکھتے تھے۔ سفیان فرماتے ہیں: "ایوب مجھ سے پوچھتے تھے کہ عمرو بن دینار نے فلاں شخص سے کیا کیا حدیثیں بیان کی ہیں۔ میں اُن کو بتانے کے بعد پوچھتا "کیا آپ لکھنا چاہتے ہیں" وہ کہتے "ہاں"[1] سفیان فرماتے تھے "جو حدیث میں عمرو بن دینار سے سُنتا ہوں وہ مجھ کو اُس حدیث سے زیادہ محبوب ہے جس کو بیس آدمیوں سے سُنوں[2]"

روایت بالمعنیٰ | غایت احتیاط فی النقل کی وجہ سے وہ بسا اوقات روایت بالمعنیٰ کرتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں "وکان یحدث علی المعنیٰ[3]"

احتیاط | حضرت عمرو بن دینار خاص خاص تلامذہ کو احادیث قلمبند کرنے کی اجازت دیدیتے تھے۔ چنانچہ حضرت سفیان فرماتے ہیں "میں نے ایوب کے لیے اطراف حدیث لکھی تھیں پھر اُن سے متعلق میں نے عمرو بن دینار سے سوال کیا۔ لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر لکھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ معمر کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں نے عمرو بن دینار سے سُنا، فرما رہے تھے "لوگ ہم سے ہماری رائے دریافت کرتے ہیں، ہم اُن کو بتا دیتے ہیں، اور وہ اُس کو پتھر کی لکیر جان کر قلمبند کر لیتے ہیں حالانکہ اُن کو ایسا نہیں چاہیے کیونکہ ممکن ہے ہم اُس سے رجوع کر لیں"۔ ایک دفعہ کسی نے اُن سے کہا کہ "سفیان لکھتے ہیں" آپ یہ سُن کر لیٹ گئے اور رونے لگے۔ اور فرمایا "جو شخص

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [2] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ق ۱ ص ۲۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷

مجھ سے سُن کر لکھتا ہے وہ مجھے تنگی میں مبتلا کرتا ہے۔ سفیان کہتے ہیں "یہ سُن کر میں نے وہ بات نہیں لکھی جس کو ہم یاد کر سکتے ہوں[1]"

فقہ | حدیث کی طرح اُن کو فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ علامہ نووی اُن کو مجتہد اصحاب مذہب میں شمار کرتے ہیں[2]۔ ابن ابی نجیح کہتے ہیں "میں نے عمرو بن دینار سے زیادہ فقیہ کسی کو نہیں دیکھا، نہ طاؤس کو، اور نہ عطا ومجاہد کو۔ ابن ابی عیینہ فرماتے ہیں

ما کان عندنا افقہ ولا اعلم — ہمارے پاس عمرو بن دینار سے بڑا نہ کوئی فقیہ تھا

ولا احفظ من عمرو بن دینار[3] — نہ عالم اور نہ زیادہ حفظ حدیث والا۔

مرکز علم مکہ کے مفتی تھے[4]، لیکن اس کمال تفقہ کے باوجود فتویٰ دینے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ کسی مسئلہ میں اگر انہیں ذرا بھی شک ہوتا تھا تو اُس کے متعلق لب کشائی کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے کسی چیز کی نسبت کوئی سوال کیا، آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سائل بولا "میرے دل میں اس مسئلہ کے بارہ میں چند شبہات ہیں" آپ نے فرمایا "بخدا تمہارے دل میں ابو قبیس (پہاڑ) کی مانند کسی شک کا ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میرے دل میں بال برابر بھی شک ہو (یعنی مسئلہ کا جواب دیتے ہوئے)[5]"

عبادت | علم وفضل میں نمایاں مقام رکھنے کے ساتھ بڑے عبادت گذار بھی تھے۔ وہ رات

---

[1] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [2] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ قسم اول ص ۲۷ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷ [4] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۰ [5] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳۔

کے ایک حصہ میں سوتے تھے، ایک تہائی شب درسِ حدیث میں بسر کرتے تھے اور ایک تہائی رات نماز پڑھتے رہتے تھے۔[1]

جماعت کی پابندی | نمازِ جماعت کے بڑے پابند تھے، یہاں تک کہ بڑھاپے میں جبکہ نہایت درجہ ضعف و نقاہت کی وجہ سے اپاہج ہوگئے تھے، گدھے پر سوار ہو کر مسجد جاتے تھے جو اُن کے مکان سے کافی فاصلہ پر تھی، پھر گدھے پر بھی خود سوار نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اُن کا کوئی خادم یا شاگرد سوار کرتا تھا۔ سفیان کا بیان ہے کہ عمرو بن دینار کسی حالت میں بھی مسجد میں آنا ترک نہیں کرتے تھے۔ اُن کو گدھے پر سوار کرکے لیجایا جاتا تھا اُس وقت میں کمسنی کی وجہ سے اُنہیں اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ پھر میں بڑا ہو کر اُن کے اُٹھانے پر قادر ہوگیا، اُن کا گھر مسجد سے دور تھا۔[2]

خلوص و للّٰہیت | خلوص و للّٰہیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی مذہبی و علمی خدمات پر کسی قسم کا کوئی معاوضہ یا وظیفہ لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں "ایک مرتبہ ابن ہشام نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کا وظیفہ جاری کیے دیتا ہوں آپ اطمینان سے گھر بیٹھے ہوئے فتویٰ دیتے رہیے۔ میں نے کہا" کہ میں ایسا نہیں چاہتا" چنانچہ وہ اخیر دم تک یونہی بلا معاوضہ خدمات انجام دیتے رہے۔[3]

سادگی | مزاج میں بیحد سادگی تھی، کبرسن کے باعث سر اور داڑھی کے بال سفید ہوگئے تھے لیکن آپ نے خضاب لگانا پسند نہیں کیا۔[4]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷، [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۵۳ [3] ایضاً [4] ایضاً

وفات | ۱۲۶ھ میں وفات پائی، آپ کے بعد افتاء کی خدمت عبداللہ بن ابی نجیح کے سپرد ہوگئی۔ اس وقت آپ کی عمر اسی برس کی تھی[1]۔

سلیمان بن طرخان تیمی

نام ونسب | سلیمان نام، ابو معتمر کنیت۔ نسباً مری تھے، بنو تیم میں بسلسلہ غلامی سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی وجہ سے حافظ ذہبی انہیں مولاهم البصری، اور ابن عماد الحنبلی انہیں التیمی القیسی، لکھنے کے بعد "مولاهم" لکھتے ہیں۔

علم وفضل | علم وکمال کے اعتبار سے وہ بصرہ کے علماء اعلام میں سے تھے۔ حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی انہیں حافظ، امام، اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں[2]۔

حدیث | کے ممتاز حافظ تھے۔ ابن سعد فرماتے ہیں "وکان ثقۃ کثیر الحدیث" اس عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے حفظ واتقان کے معترف ہیں۔ حضرت سفیان فرماتے تھے۔ بصرہ کے حفاظ تین ہیں۔ سلیمان التیمی، عاصم الاحول، داؤد بن ابی ہند۔

شیوخ | صحابہ کرام میں انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ اور تابعین میں حسن بصری ابو عثمان، طاؤس، اعمش، قتادہ، اور ابو اسحاق سبیعی سے استفادہ کیا تھا۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶، وابن سعد ج ۵ ص ۳۵۴۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۲ و شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۱۲

تلامذہ — ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا، ممتاز تلامذہ یہ ہیں :۔ شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابن المبارک، یزید بن ہارون اور ہوذہ بن خلیفہ۔ ابن علیہ، ابراہیم بن سعد، جریر وغیرہم

مرویات کا پایہ — ثقاہت کے اعتبار سے وہ مسلّم تھے، شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے سلیمان سے زیادہ کوئی سچا نہیں دیکھا، وہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو اُن کا رنگ بدل جاتا تھا۔[۱]

حافظ ذہبی نے اُن کی مرویات کی تعداد دو سو بتائی ہے۔[۲]

عبادت و ریاضت — حضرت سلیمان کا اصل طغرائے امتیاز عبادت و ریاضت تھا، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں و وکان من العباد المجتہدین[۴] ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں۔

وکان عابدًا صوامًا قانتًا للہ قوامًا — سلیمان عابد، صائم النہار، خدا کے مطیع و فرمانبردار اور قائم اللیل تھے۔

رات رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ صبح کی نماز رات کے وضو سے ہی پڑھتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے معتمر اور وہ خود رات میں مسجدوں کا چکر لگا کر کبھی نماز کسی مسجد میں پڑھتے اور کبھی کسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ صبح تک یہی کرتے رہتے تھے۔[۳]

سعید بن عامر الضبعی کا بیان ہے کہ ہر سجدہ میں ستر مرتبہ تسبیح پڑھتے تھے۔ ایک روایت

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۰۲ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۲۔ [۳] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۱۲
[۴] ابن سعد ج ۷۔ ق ۲ ص ۱۸۔

ہے کہ عصر سے مغرب تک تسبیح پڑھتے رہتے تھے، نماز کے علاوہ روزوں کا بھی حال یہی تھا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ روزہ رکھتے تھے، اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔

صدقہ وخیرات | صدقہ وخیرات کثرت سے کرتے تھے۔ جریر کہتے ہیں "سلیمان پر کوئی ساعت ایسی نہیں آتی تھی کہ وہ اُس میں خیر خیرات نہ کرتے ہوں۔ اگر صدقہ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا تو دو رکعت نماز ہی پڑھ لیتے تھے" غرضکہ وہ خدا کی اطاعت اور بندگی سے کسی وقت بھی خالی نہیں ہوتے تھے۔ حماد بن سلمہ کا بیان ہے کہ "جب کبھی بھی سلیمان کے پاس ایسے وقت آتے جبکہ خدا کی عبادت کی جا سکتی، تو ہم انہیں خدا کی عبادت کرتے ہوئے ہی پاتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُن میں عصیت کا مادہ ہی نہیں ہے"

مواخذہ کا ڈر | اس قدر زہد و عبادت کے باوجود مواخذۂ آخرت سے ہمیشہ خائف رہتے تھے۔ اُن سے کسی نے کہا "سلیمان! آپ تو آپ ہی ہیں۔ آپ کے مثل کون ہوگا؟" بولے "ایسا نہ کہو، مجھ کو نہیں معلوم میرے رب کی طرف سے آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔ اُس نے خود فرمایا ہے۔ بدا لھم من اللہ ما لم یکونوا یحتسبون" اللہ کی طرف سے اُن کے لیے وہ بات ظاہر ہوگی جس کا انہیں گمان بھی نہیں ہوگا۔

قدریہ سے نفرت | الحب فی اللہ والبغض فی اللہ اُن کا شعار تھا۔ اس بنا پر قدریہ فرقہ سے بہت بغض رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں رونے لگے کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا:-

"ایک دفعہ میں نے ایک قدری کے پاس سے گذرتے ہوئے اُسے سلام کرلیا تھا۔ اب ڈرتا ہوں کہ کہیں اس پر مواخذہ نہ ہو۔" حضرت سلیمان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ کوئی شخص اُن کے پاس حدیث سُننے کے لیے آتا تو وہ پہلے اُس کا امتحان لیتے، اُس سے دریافت فرماتے کہ کیا زنا کا فعل بہ تقدیرِ الٰہی ہے؟" وہ کہتا "ہاں" پھر آپ اُس سے اس پر قسم لیتے اور اگر وہ قسم کھا لیتا تو آپ اُسے پانچ احادیث سُناتے تھے۔

نکتہ وری | ہر زمانہ میں ایسے افراد رہے ہیں جو مذہب کے معاملہ میں خصوصاً سہولت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کسی خاص امام کی تقلید یا کسی خالص عالم کے مسلک کی پیروی پسند نہیں کرتے۔ بلکہ جس امام کے مسلک میں اُنہیں جو بات آسان معلوم ہوتی ہے، اُسے اختیار کر لیتے ہیں اور دل کی تسلی کے لیے عذر یہ کر دیتے ہیں کہ ہر امام برحق ہے۔ اس طرح کے سہولت پسند افراد سے متعلق حضرت سلیمان التیمی نے کیا عجیب دیدہ ورانہ بات کہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"اگر تم ہر عالم کی رخصت یا اُس کی لغزش کو اختیار کرنے لگو گے تو تم میں تمام شر ہی شر پیدا ہو جائیگا۔"[1]

وفات | ماہ ذوالقعدہ ۱۴۳ھ میں وفات پائی اُس وقت ستاون سال کی عمر تھی۔[2]

---

[1] صدقہ وخیرات کے عنوان سے یہاں تک کی سب معلومات تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۲، ۱۴۳ سے ماخوذ ہیں۔
[2] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۸ و تذکرۃ الحفاظ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۰۱۔

حسن بصریؒ

نام ونسب حسن نام، ابوسعید کنیت، والد کا نام یسار تھا۔

غلامی ان کے والدین غلام تھے، اس بارہ میں روایتیں مختلف ہیں۔ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد میسان کے قیدیوں میں سے تھے۔ ربیع بنت نضر نے اُن کو خرید کر آزاد کر دیا تھا، دوسری روایت میں یہ ہے کہ ان کے والدین ایک انصاری کی غلامی میں تھے، اُنہوں نے بیوی کے مہر میں بنو سلمہ کو دیدیا تھا جنھوں نے ان کو آزاد کر دیا۔تیسری روایت یہ ہو کہ ان کے والد زید بن ثابت کے غلام تھے اور ان کی والدہ حسن کا نام خیرہ تھا اُم المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں[1]۔اور واقعات مابعد سے معلوم ہوگا کہ یہی روایت زیادہ صحیح ہے۔

ولادت اور بچپن ۲۲ھ میں یعنی حضرت عمرؓ کی شہادت سے تقریبًا دو سال پہلے مدینہ میں پیدا ہوئے[2] جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا ہے ان کی والدہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں اس تقریب سے حضرت حسن کو اُم سلمہؓ کے گھر میں تربیت پانے کا موقع ملا۔ان کی والدہ کسی کام سے باہر چلی جاتیں یا گھر میں ہی کسی کام میں مشغول ہوتی تھیں تو حضرت ام سلمہؓ

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۱۱۵۔ [2] حضرت حسن بصری کی صحیح تاریخ ولادت کوئی نہیں لکھتا صرف اتنا لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے ختم ہونے میں دو سال کی مدت باقی تھی کہ حضرت حسن پیدا ہوئے۔ پھر حافظ ذہبی وغیرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۱۰ھ میں حسن بصریؒ کا انتقال ہوا تو ان کی عمر اس وقت اٹھاسی سال کی تھی اب اس میں اشکال یہ ہے کہ ۱۱۰ میں سے ۸۸ گھٹا دیے جائیں تو ۲۲ھ نکلتا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کی وفات ذی الحجہ ۲۳ھ میں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے صرف ایک سال کا فرق رہتا ہے اس

حضرت حسن کو دودھ پلادیتی تھیں [۱]۔ بے شبہ یہ اتنا بڑا شرف ہے کہ کسی خوش نصیب کو ہی مل سکتا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں "حضرت حسن میں جو غیر معمولی فصاحت اور کشش پائی جاتی تھیں یہ سب اسی مقدس شیر خوارگی کے طفیل میں تھیں [۱]۔

حضرت ام سلمہؓ کے تعلق سے حسن کو دوسری ازواج مطہرات کے گھروں میں بھی آنے جانے کا موقع ملتا تھا، خود اُن کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے عہد خلافت تک جبکہ اُن کی عمر تیرہ سال کی تھی وہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھروں میں بے تکلف آتے جاتے تھے۔

علم وفضل حسن ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ صحابۂ کرامؓ کی بڑی تعداد بقید حیات تھی، پھر ان کی تربیت بھی ایسے مقام پر ہوئی تھی، جہاں دن رات علم ودین کے چرچے رہتے تھے اور خود اُن کے اندر فطری استعداد وصلاحیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم وعمل، فضل وکمال، زہد واتقاء اور تمام اخلاقی وروحانی کمالات، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے اُن کا دامن پُر نہ ہو۔ علامہ ابن سعد نے ان کے تمام اوصاف ایک سطر میں جمع کر دیے ہیں. فرماتے ہیں:-

كان عالماً رفيعاً ثقة حجة مأموناً	حضرت حسن عالم، بلند مرتبہ، معتمد، برہان،
عابداً ناسكاً كثير العلم فصيحاً	نیک خصلت، عبادت گذار، وافر العلم، فصیح،

(بقیہ صفحہ ۱۷۵) کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر کی شہادت ۲۳ھ کے آخری حصہ میں ہوئی تھی اور حضرت حسن بصری ۲۱ھ کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ تھوڑے دنوں کا فرق ایسا کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ تقریباً دو برس کو رواۃ نے دو برس سے تعبیر کر دیا۔ [۱] تہذیب الاسماء واللغات ق ۱ ج ۱ ص ۱۶۱۔

جمیلاً وسیماً[1] خوبصورت، اور خوش رو تھے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

حافظ علامۃ من بحور العلم فقیہ حسن حافظ، علامہ، علم کا سمندر، نفس کے

النفس کبیر الشان عدیم النظیر فقیہ، بڑے شان والے، بے نظیر، پسندیدہ

ملیح التذکیر بلیغ الموعظۃ وعظ کہنے والے خوب نصیحت کرنے والے

راس فی انواع الخیر[2] تمام انواع خیر میں سردار تھے۔

تفسیر | تفسیر کی تعلیم انہوں نے بڑی محنت اور شوق سے حاصل کی تھی۔ ابوبکر الہذلی بیان کرتے ہیں "ایک دن مجھ سے سفاح نے دریافت کیا کہ تمہارے حسن اس بلند مرتبہ کو کس طرح پہنچ گئے؟" میں نے کہا "انہوں نے بارہ برس کی عمر میں ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔ اس کے بعد وہ جب تک ایک سورۃ کی تفسیر و تاویل اور اس کی شانِ نزول معلوم نہیں کرلیتے تھے دوسری سورت نہیں پڑھتے تھے[3]"

حدیث | حدیث کی سماعت انہوں نے ان اساطین امت سے کی تھی جو مدینہ میں اس فن کے مرجع خلائق بزرگ تھے۔ صحابہ میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، عمران بن الحصینؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت معاویہؓ، انسؓ، جابرؓ ان کے شیوخ تھے۔

بعض لوگوں کو حضرت حسن بصری پر یہ اعتراض تھا کہ وہ تدلیس کرتے ہیں یعنی اپنے

---

[1] ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۱۵ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶۷۔ [3] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶۔

اصل شیخ کا نام نہیں لیتے اور حدیث کو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں لیکن اس کی وجہ جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں یہ تھی کہ اُن کے عہد میں حجاج کے مظالم اور اس کی سفاکیوں کا بڑا چرچا تھا، حضرت حسنؒ فرماتے ہیں "میں جب کسی حدیث میں "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہتا ہوں، سمجھ لو کہ وہ میں نے حضرت علیؓ سے سنی ہے لیکن (حجاج کی وجہ سے) میں ایک ایسے زمانہ میں ہوں کہ حضرت علیؓ کا نام نہیں لے سکتا"۔ غالباً حضرت حسن سے استفادہ کرنے والے اس راز کو جانتے تھے اور وہ اُن کے ایسا کرنے پر کچھ نہیں کرتے تھے۔ یونس بن عبید نے اُن سے ایسا سوال کیا تو فرمایا "اے میرے بھتیجے آج تم نے مجھ سے ایک ایسی بات دریافت کی ہے جو آج تک کسی نے دریافت نہ کی تھی اور اگر تمہاری منزلت میرے دل میں نہ ہوتی تو میں اس بھید کو تم سے بھی بیان نہ کرتا"۔[1]

اکابر علماء کی رائے

بہر حال وہ بڑے بڑے علماءِ عصر کے نزدیک معتبر اور ثقہ تھے۔ اور وہ اُن سے حدیثیں سنتے تھے۔ انس بن مالک کہا کرتے تھے "حسن سے دریافت کرو، اُن کو سب کچھ محفوظ ہے اور ہم تو بھول گئے"۔ عاصم الاحول کا بیان ہے "میں نے شعبی سے کہا کہ میں بصرہ جا رہا ہوں، آپ کو وہاں کا کوئی کام ہو تو بتلائیے" بولے "تم بصرہ پہنچو تو حسن کو میری طرف سے سلام کہنا" میں نے کہا "میں تو اُن کو پہچانتا نہیں ہوں" فرمایا "تم بصرہ میں داخل ہو تو دیکھنا وہاں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش رو اور پُر رعب کون ہے بس وہی حسن ہوں گے۔ تم اُن سے میرا سلام کہہ دینا"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں بصرہ کی مسجد میں

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶۔

داخل ہوا تو حضرت حسن کو دیکھا وہاں تشریف رکھتے ہیں اور لوگوں کا ایک جم غفیر اُن کے اردگرد بیٹھا ہوا ہے سلیمان التیمی کہتے تھے "حسن شیخ بصرہ ہیں" مطر الوراق کا قول تھا کہ "جابر بن زید اہل بصرہ میں سب سے بڑے بزرگ مانے جاتے تھے، پھر جب حسن آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ آخرت میں ہیں اور وہاں کی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر اُن کے متعلق خبریں دے رہے ہیں[1]" عطاء بن ابی رباح خود جلیل القدر محدث ہیں وہ فرماتے تھے "تم اس شخص (حسن) کی طرف رجوع کیا کرو، وہ بہت بڑے عالم، امام، اور مقتدا ہیں[2]"

تلامذہ | علم و فضل کی اس عام شہرت کی وجہ سے اُن کے تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا جن میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔ ایوب، قتادہ، بکر بن عبداللہ مزنی، عطاء بن السائب، یونس بن عبید، منصور بن زاذان، مجاہد، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان[3]۔

فقہ | تفسیر و حدیث کے علاوہ وہ فقہ کے بھی بڑے وسیع النظر امام تھے اور بصرہ کے مفتی بھی تھے۔ قتادہ کا بیان ہے "میں جس کسی فقیہ کے پاس بیٹھا میں نے دیکھا کہ وہ بھی حضرت حسن کے فضل و کرم کا مرہون ہے"۔ ایوب کہتے تھے "میں نے حسن سے بڑا فقیہ کوئی نہیں دیکھا" بکر المزنی کہتے ہیں "جس شخص کو یہ پسند ہو کہ وہ ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے عالم کو دیکھے اُس کو چاہیے کہ حسن کو دیکھے، کیونکہ ہمیں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو اُن سے بڑا عالم ہو" حماد بن سلمۃ یونس بن عبید اور حمید الطویل سے نقل کرتے ہیں کہ ہم نے فقہا کو دیکھا لیکن حسن سے زیادہ کسی

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۴ و ۲۶۵ [2] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص تذکرہ حسن بصری
[3] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۴۔

کو مروت میں کامل نہیں پایا۔"

وسعت علم و حکمت ان علوم و فنون نے اُن کو فضل و کمال اور حکمت و ادب کا دریائے بے کنار بنا دیا تھا۔ ربیع بن انس سے منقول ہے، کہتے تھے۔

اختلفت الی الحسن عشر سنین — میں حضرت حسن کے پاس دس برس یا اس سے
او ماشاء اللہ فلیس من یوم الا — کم و بیش آتا جاتا رہا لیکن مجھ کو کوئی دن ایسا نہیں ملا
اسمع منہ مالم اسمع قبل ذلک — جس میں میں نے ایسی بات سُنی ہو جو میں اس سے پہلے نہ سُنی ہو۔

اعمش کہتے ہیں "حسن حکمت کی باتیں خوب یاد کرتے تھے۔ پھر وہ اُن کا اظہار کر ڈالتے تھے" حضرت ابو جعفر باقر کے سامنے جب کبھی حسن کا ذکر آتا تھا تو وہ فرماتے تھے "ذاك الذی یشبہ کلامہ کلام الانبیاء" یہ تو وہ ہیں جن کا کلام انبیاء کے کلام کے مشابہ ہوتا ہے۔[1]

فصاحت و بلاغت گفتار، علمی مہارت و کمال کے علاوہ قدرت نے اُن کو فصاحت و بلاغت کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس وصف میں وہ سب سے ممتاز تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں "حضرت حسن بصرہ کے سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے۔ علامہ ابن سعد اور حافظ ذہبی دونوں اُن کی فصاحت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ابن عون کہتے ہیں "میں حضرت حسن کے لہجہ کو رؤبۃ بن العجاج کے لہجہ سے تشبیہ دیتا ہوں"[2] ابو عمرو بن العلا کہتے ہیں "میں نے حجاج اور حسن سے زیادہ فصیح اور رؤبۃ اور عجاج سے بڑا شاعر کوئی نہیں دیکھا"[3]۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک مسلمان کے لیے سب سے زیادہ کٹھن اور دشوار مرحلہ امر بالمعروف اور

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۵ [2] ایضاً ص ۲۷۰ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۶

نہی عن المنکر کا ہے۔ قدرت نے حضرت حسن کو جس بیدار قوتِ عمل کی دولت سے نوازا تھا اُس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے اربابِ صولت وہیبت کی پروانہ کرتے تھے اور جو امر حق ہوتا تھا اُس کو ظاہر کیے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اُنہیں لکھا کہ "مجھ پر خلافت کا بار ڈال دیا گیا ہے، آپ ایسے لوگ تلاش کیجیے جو اس معاملہ میں میری امداد کریں"۔ حضرت حسن نے جواب دیا "لوگ دو ہی قسم کے ہیں، ابناءِ دنیا، تو آپ کو اُن کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ابناءِ آخرت، تو وہ اس چیز کو پسند نہیں کرتے۔ پس بہتر یہی ہے کہ آپ خدا سے مدد طلب کریں"۔ ابن ہبیرہ کو یزید بن عبد الملک نے عراق وخراسان کی گورنری پر مامور کیا تو اُس نے حضرت حسن، ابن سیرین اور شعبی کو بلا کر کہا کہ خلیفہ نے مجھ کو فلاں معاملہ کی نسبت ایسا ایسا لکھا ہے اور میرا فرض ہے کہ اُس کے مطابق عمل کروں۔ اس پر ابن سیرین اور شعبی نے ایک ایسی بات کہی جس میں کچھ توریہ پایا جاتا تھا۔ پھر حسن بصری کی باری آئی تو اُنہوں نے صاف صاف کہا "ابو ہبیرہ! تو یزید کے معاملہ میں اللہ سے خوف کر، اور اس کے برعکس اللہ کے معاملہ میں یزید سے مت ڈر کیونکہ اللہ زیادہ طاقتور ہے وہ تجھ کو یزید کے شر سے بچا سکتا ہے، لیکن یزید تجھ کو اللہ کے قہر سے نہیں بچا سکتا۔ اللہ میں یہ قدرت ہے کہ وہ تیرے پاس ایک فرشتہ بھیج دے جو تجھ کو تیرے تخت سے اُتار دے اور تیرے وسیع محل میں سے نکال کر تنگنائے قبر میں پہنچا دے۔ اُس وقت سوائے تیرے عمل کے کوئی چیز تیرے کام نہیں آئیگی، تو خدا کی معصیت کرنے سے بچ، کیونکہ اللہ نے اس حکومت کو بندگانِ خدا اور دین کا مددگار بنایا ہے تو اس کو دین اور بندگانِ خدا کے خلاف استعمال

مت کر، کیونکہ خدا کی معصیت میں کسی بندہ کی اطاعت اور فرمانبرداری ناجائز اور حرام ہے۔[1]

ابوبکر الہذلی کہتے ہیں "حضرت حسنؒ نے کوئی درہم کسی تجارت میں نہیں لگایا کبھی کوئی عہدۂ سرکاری حاصل نہیں کیا اور وہ جب کسی چیز کا امر کرتے تھے پہلے اُسے خود کرتے تھے۔ اسی طرح کسی چیز کے ترک کا حکم کرتے تو پہلے اُسے خود ترک کر دیتے تھے۔"[2]

علم باطن حضرت حسنؒ علوم ظاہریہ کے علاوہ علم باطن کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ چنانچہ تمام بڑے بڑے ارباب تصوف نے آپ کا نام جلی عنوان سے لکھا ہے اور سب کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ سلسلۂ تصوف کے شیخ الشیوخ ہیں۔

خوفِ خدا تصوف میں اصل احسان یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حضور کا تصور ہر وقت رہے۔ حضرت حسن بصریؒ پر یہ کیفیت بہت غالب تھی، وہ اللہ تعالیٰ کی جلالت شان سے ہر وقت خائف اور ترساں رہتے تھے۔ یونس بن عبید سے کسی نے دریافت کیا "آپ کوئی ایسا شخص بھی جانتے ہیں جو حسن کی طرح عمل کرتا ہو"۔ کہنے لگے "عمل کرنا تو بہت دشوار ہے میں نے تو کوئی ایسا شخص بھی نہیں دیکھا جو ان کے قول کی طرح اقوال کہتا ہی ہو" اس کے بعد انہوں نے حضرت حسن کی توصیف کرتے ہوئے بیان کیا" وہ جب آتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی دوست کو دفن کر کے آ رہے ہیں، اور جب بیٹھتے تھے تو اس قدر اُداس ہوتے تھے کہ گویا وہ ایک قیدی ہیں جس کے قتل کا حکم دیا جا چکا ہے، اور جب اُن کے سامنے دوزخ کا ذکر کیا جاتا تو اُن پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی تھی کہ

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۷ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۷۔

کہ گویا دوزخ اُن کے سوا کسی اور کے لیے پیدا ہی نہیں کی گئی۔[1]

وفات | ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی وفات سے چند روز قبل ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ ایک پرندہ نے مسجد کی ایک کنگری اُٹھا لی اُس نے حضرت ابن سیرین سے تعبیر پوچھی تو انہوں نے کہا "اگر تمہارا یہ خواب سچ ہے تو حسن بصری کا انتقال ہو جائیگا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس خواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد حسن بصری وفات پا گئے۔ جنازہ اُٹھا تو اُس میں اس کثرت سے لوگ شریک تھے کہ جامع بصرہ میں عصر کی نماز کے لیے ایک متنفس بھی نہیں تھا۔ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں "آغازِ اسلام سے اب تک کی تاریخ بصرہ میں یہ سب سے پہلا اتفاق تھا"[2]

محمد بن سیرینؒ

نام ونسب | محمد نام، ابوبکر کنیت، والد کا نام سیرین تھا جو جرجرایا (عراق) کے باشندے تھے اور عین التمر میں ٹھٹھیرے کا کام کرتے تھے، اسی عین التمر کے معرکہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور کسی کو تقسیم کر دیے گئے۔ بعد میں وہ انس بن مالکؓ کی غلامی میں آگئے تھے جنھوں نے بیس ہزار درہم پر مکاتبت کر کے اُنہیں آزاد کر دیا۔[3]

ابنِ سیرین کی والدہ صفیہ حضرت ابوبکرؓ کی باندی تھیں، لیکن وہ اس شان کی تھیں

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۸ [2] ایضاً [3] ابنِ خلکان ج ۱ ص ۴۵۳۔

کہ جب ان کے نکاح کا وقت آیا تو تین ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے ان کی مشاطگی کا کام انجام دیا اور اٹھارہ بدری صحابہ کرام جن میں ابی بن کعب بھی تھے نکاح کی تقریب میں شامل ہوئے، آراستگی کے بعد امہات المومنین نے حضرت صفیہ کے لیے دعا مانگی اُدھر مردانہ مجلس میں حضرت اُبیؓ دعا مانگتے جاتے اور دوسرے صحابہ آمین کہتے جاتے تھے[1]

ولادت سیرین کثیر الاولاد تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ صرف امہات الاولاد کے بطن سے ان کے تیئس لڑکے تھے لیکن محمد حضرت صفیہ کے بطن سے تھے۔ ۳۳ھ میں جبکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت ختم ہونے میں دو سال باقی تھے آپ پیدا ہوئے[2]

علم و فضل محمد ابن سیرین فارس میں مدت تک حضرت انس بن مالک کے ساتھ کاتب کی حیثیت سے رہے تھے اور اس تقریب سے اُن کو حضرت انس سے علمی استفادہ کا بہت کافی موقع ملا تھا۔ ان کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ، ابن عمرؓ اور عمران بن حصینؓ ایسے جلیل القدر صحابہ کے فیض صحبت سے مشرف ہوئے تھے۔ ان بزرگوں کی توجہ اور خود ابن سیرین کے ذاتی شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم کے پیکر ہو گئے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں :۔

وکان فقیھا اماما عزیز العلم ثقۃ ثبتا علامۃ فی التعبیر راسا فی الورع[3]

ابن سیرین فقیہ، امام، وافر العلم، معتمد، ثابت فی الحدیث، تعبیر میں علامہ، زہد و تقویٰ کے امام تھے۔

علامہ ابن سعد فرماتے ہیں "ابن سیرین ثقہ، مامون بلند مرتبہ، عالی شان فقیہ اور امام کثیر

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۸ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۳۔

العلم اور متقی تھے[1]

تفسیر | وہ تمام اسلامی علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے چنانچہ وہ تفسیر کے بھی امام تھے علامہ نووی انہیں "الامام فی التفسیر والحدیث والفقہ وعبر الرؤیا والمقدم فی الزھد والورع" لکھتے ہیں[2]

حدیث | جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے ابن سیرین حضرت انس بن مالک کے خاص تربیت یافتہ اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ و ابن عباسؓ کے فیض صحبت پائے ہوئے تھے اور ان بزرگوں کے علاوہ انہوں نے دوسرے اجلہ صحابہ سے حدیث کی روایت کی ہے جن میں سے بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ زید بن ثابت، حذیفہ بن یمان، حسن بن علی، رافع بن خدیج سلیمان بن عامر، سمرۃ بن جندب، ابو الدرداء، معاویہ، ابو سعید خدری رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ صحابہ کے علاوہ جن غیر صحابہ علماء حدیث سے انہوں نے روایت کی ہے ان میں مشہور یہ ہیں:۔ عکرمہ، شریح، عبد الرحمن بن ابی بکرہ، قیس بن عباد، مسلم بن یسار وغیرہ[3]۔ ان اکابر امت کے فیض نے ابن سیرین کو علم حدیث کا امام بنا دیا تھا۔

فقاہت | فقاہت میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ ہشام بن حسان نے محمد ابن سیرین سے ایک روایت نقل کی تو کہا "مجھ سے یہ روایت اس شخص نے بیان کی ہے جو ان تمام انسانوں میں سب سے زیادہ سچا ہے، جن کو میں نے پایا ہے۔" ابن مدینی کہتے تھے "حضرت ابوہریرہ کے اصل شاگرد چھ ہیں۔ ابن المسیب، ابو سلمہ، الاعرج، ابو صالح، ابن سیرین، طاؤس، امام

[1] ابن سعد ج ۷، ص ۱۴۰ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۲۔ [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۵-۲۱۶

احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین انہیں ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عون کا مقولہ ہے "میں نے دنیا میں تین ایسے آدمی نہیں دیکھے، عراق میں محمد بن سیرین، حجاز میں قاسم بن محمد، شام میں رجاء بن حیوۃ۔ اور ان تینوں میں محمد بن سیرین جیسا کوئی نہیں تھا[1]۔ امام شعبی تلامذہ کو ہدایت کرتے تھے کہ ابن سیرین کے خوانِ علم سے فائدہ اٹھائیں[2]۔ علی بن مدینی، عمرو بن علی وغیرہما کہتے تھے اصح الاسانید محمد بن سیرین عن عبیدۃ عن علی ہے[3]۔

احتیاط اس وسعتِ علم اور ثقاہت کے باوجود روایت کرنے میں نہایت احتیاط کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ روایت کے صرف معانی نقل کر دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ بالفاظہا روایت کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ابن عون کہتے ہیں کان ابن سیرین یحدث بالحدیث علیٰ حروفہ[4] اس احتیاط کی وجہ سے معمولی مرتبہ کے لوگوں سے علم اور حدیث کا اخذ کرنا نامناسب سمجھتے تھے، چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے "علم دین ہے۔ اس کو حاصل کرنے سے قبل اس شخص کو خوب اچھی طرح پرکھ لو جس سے اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو[5]"

فقہ فقہ میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا۔ علامہ ابن سعد، حافظ ذہبی۔ امام نووی، حافظ ابن حجر انہیں فقیہ تسلیم کرتے ہیں۔ مورق العجلی کہتے ہیں "میں نے ابنِ سیرین سے زیادہ کوئی پاکباز فقیہ نہیں دیکھا[6]" ابن حبان انہیں فقیہ فاضل بتاتے ہیں[7]۔ علامہ خطیب بغدادی

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۵-۲۱۶ [2] ایضاً [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴
[4] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۳ [5] ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۱۴۱
[6] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۳ [7] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۱۶

لکھتے ہیں: "وکان محمد احد الفقہاء من اہل بصرۃ والمذکورین بالورع فی وقتہ"[1]

لیکن احتیاط کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جن امور میں ذرا سا شبہ بھی ہوتا تھا اُس کے متعلق فتویٰ نہیں دیتے تھے[2] کوئی شخص اُن سے فقہ کا مسئلہ پوچھتا تو اُن کا رنگ یکایک متغیر ہوجاتا اور حالت دگرگوں ہوجاتی تھی[3]

قضا میں مہارت فقہی کمال کی وجہ سے اُن کو قضا میں بڑی مہارت تھی۔ عثمان البتی کا قول ہے "اس نواح میں محمد بن سیرین سے بڑا کوئی ماہر قضا نہیں ہے"[4] لیکن اس کے باوجود عہدۂ قضا سے گھبراتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تو شام بھاگ گئے اور وہاں سے مدینہ پہنچ گئے[5]

زہد و ورع ان علمی کمالات کے ساتھ اُن میں زہد و ورع بھی حد سے زیادہ تھا۔ ابن سیرین کسب معاش کے لیے تجارت کرتے تھے لیکن انہیں اس میں کچھ شک ہوگیا تو اُسے بھی چھوڑ دیا۔ اتقاء کا یہ عالم تھا کہ وہ خود فرماتے ہیں "خواب میں اور بیداری میں میں ام عبداللہ یعنی اپنی بیوی کے سوا کسی عورت کے پاس نہیں آیا" پھر فرماتے ہیں "خواب میں اگر کوئی اجنبی عورت دیکھتا ہوں تو فوراً خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عورت میرے لیے حلال نہیں ہے اس خیال کے آتے ہی میں فوراً اپنی نگاہ پھیر لیتا ہوں"[6]

مالی نقصان غایت احتیاط کے باعث انہیں بعض اوقات شدید مالی نقصانات برداشت

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۱۔ [2] ایضاً ج ۵ ص ۳۳۶۔

[3] ابن سعد ج ۷ ق ۱ ص ۱۴۲ [4] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴۔

[5] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۹۔ [6] تاریخ خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۶

کرنے پڑتے تھے لیکن وہ اُس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ (غالباً تجارت کے سلسلہ میں) انھوں نے زیتون کے تیل کی ایک مشک چالیس ہزار درہم میں خریدی اُس میں اتفاق سے ایک مرا ہوا چوہا نکل آیا۔ حضرت ابن سیرینؒ نے اس خیال سے کہ ممکن ہے چوہا کولہو میں پڑا ہوا ہو پوری مشک پھنکوا دی لیکن چونکہ اُسے خرید چکے تھے اس لیے تیل والے نے قیمت کا مطالبہ کیا۔ یہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں قید کر دیا گیا۔[1]

خیانت سے احتراز جیل کا انچارج ان کا ارادتمند تھا، اُس نے کہا "میں رات کے وقت جیلخانہ آپ کے لیے کھول دیا کرونگا، آپ اُس وقت اپنے بال بچوں کے پاس چلے جایا کیجیے" لیکن آپ نے یہ فرما کر انکار کر دیا کہ میں تمہاری خیانتِ فرضِ منصبی میں اعانت نہیں کرونگا۔[2]

خوفِ خدا اس زہد و اتقاء کا سبب یہ تھا کہ ان میں خوفِ خدا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ہشام بن حسان کہتے ہیں "ہم ایک مرتبہ ابن سیرینؒ کی معیت میں ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہاں ہم نے اُن کو دیکھا کہ دن کو ہنستے اور رات کو روتے تھے۔" ابن عون کہتے ہیں "ابن سیرینؒ امت کے متعلق تو بہت پر اُمید لیکن خود اپنی ذات کی نسبت بہت شدید اور سخت تھے۔"[3]

ابو قلابہ کہتے ہیں "محمد بن سیرینؒ کی طرح کون نیزہ کی دھار پر سوار ہونے کی طاقت رکھتا ہے"۔ اُن کے سامنے موت کا ذکر ہوتا تھا تو اُس سے بھی آخرت کے ڈر سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ گویا اُن کے ایک ایک عضو پر موت طاری ہو گئی ہے۔[4]

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴۔ [2] ایضاً [3] دیکھو تہذیب الاسماء اور تاریخ بغدادی
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۳

شانِ بزرگی | مجموعی طور پر وہ خصائل حمیدہ کے ایسے جامع تھے کہ اُن کو کسی پہلو سے دیکھا جاتا اُن کی خوبیاں آشکارا ہو جاتی تھیں۔ ابو قلابہ کہتے ہیں

اصرفوہ حیث شئتم فلتجدنّہ[1] تم اُن کو جس طرح چاہو آزما کر دیکھو۔ تم دیکھو گے
اشدّکم ورعًا واملککم لنفسہٖ کہ وہ تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور تم سب سے
زیادہ ضابطِ نفس ثابت ہوں گے۔

خلفاء کا اعزاز | حضرت محمد بن سیرینؒ کی جلالت شان کی وجہ سے اعیان و امراء ان کے پاس ہدایا بھیجتے تھے لیکن اُن کے استغناء کا یہ عالم تھا کہ قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے بزرگ شمائل خلیفہ نے اُن کے اور حضرت حسن بصریؒ کے پاس کچھ ہدایا روانہ کیے تو حسن بصریؒ نے اُنہیں قبول کر لیا لیکن محمد بن سیرینؒ نے اُنہیں واپس کر دیا۔[2]

شانِ بزرگی | حدیث میں اہل اللہ کی علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ اُنہیں دیکھتے ہی خدا یاد آجائے۔ حضرت محمد بن سیرینؒ کا حال یہی تھا۔ ابو عوانہ کہتے ہیں "میں نے ابن سیرینؒ کو دیکھا ہے کہ بازار سے جب گذرتے تھے تو لوگ اُن کے صلاح و تقویٰ کی وجہ سے اللہ کا ذکر کرنے لگتے، اور اُس کے نام کی تسبیح و تہلیل پڑھنے لگتے تھے"[3] ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں۔ "ابنِ سیرینؒ کسی مکان میں تشریف لے جاتے تو وہاں کا کوئی شخص ایسا نہ ہوتا تھا جو اُن کو دیکھ کر اللہ کا ذکر شروع نہ کر دیتا ہو"[4] ابنِ قتیبہ کہتے ہیں "ابن سیرینؒ علم اور عبادت میں مرتبۂ کمال رکھتے تھے"[5]

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۴ [2] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۱۴۰، [3] خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۳۲،
[4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۹۔ [5] ایضًا

تعبیر خواب | ابن سیرین بہترین معبّر خواب کی حیثیت سے عوام و خواص میں زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اُن کے متعلق بعض دلچسپ حکایتیں بھی مشہور ہیں۔ ان کی وفات سے چند روز قبل ایک شخص آیا اور کہنے لگا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک نامعروف فربہ پرند اُترا اور ایک درخت پر بیٹھ کر پھول چُننے لگا پھر وہ اُڑ گیا" ابن سیرین کے چہرہ کا رنگ یہ سنتے ہی متغیر ہو گیا اور فرمایا "یہ علماء کی موت ہے"[1]۔ اس فن میں کمال کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور اُن سے درخواست کی کہ مجھ کو خواب کی تعبیر سکھا دیجیے، اُنھوں نے فرمایا "اپنا مُنہ کھولو" میں نے تعمیل ارشاد میں مُنہ کھولا تو آپ نے اُس میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا، اس واقعہ کے بعد سے میں خواب کی تعبیریں بیان کرنے لگا[1]۔

شادی | آپ نے ایک عربی خاتون سے شادی کی تھی جس سے آپ کے اولاد کثیر ہوئی لیکن عبداللہ بن محمد کے سوا سب کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا[2]۔

وفات | حضرت حسن بصری کی وفات کے سو تین ماہ بعد شوال ۱۱۰ھ میں ستتر برس کی عمر پا کر انتقال کیا[3]۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۳۹۔ [2] ایضاً ص ۱۴۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۴

ابوالعالیۃ الریاحی

نام ونسب رفیع نام، ابوالعالیہ کنیت تھی۔ بنو الریاح کی ایک عورت کے غلام تھے جس نے ان کو بعد میں آزاد کر دیا تھا، اُس کی نسبت سے ریاحی کہلاتے ہیں[1]۔ ان کے والد کا نام مہران تھا۔ بصرہ کے باشندہ تھے[2]۔

آزادی اپنی آزادی کی داستان وہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں: "مجھ کو ایک عورت نے خریدا اور جب اُس نے آزاد کرنا چاہا تو اُس کے چچا زاد بھائیوں نے کہا کہ تم اس کو آزاد کر دو گی تو یہ کوفہ چلا جائیگا، اور ہم سے تعلق بالکل منقطع ہو جائیگا۔ اس کے بعد وہ عورت مجھ کو مسجد کے ایک حصہ میں لائی اور مجھے اس کی خدمت کے لیے آزاد کر دیا اور دعا مانگی کہ "اے اللہ میں ابوالعالیہ کو اس لیے آزاد کر رہی ہوں کہ قیامت کے دن میرا یہ کارِ ثواب میرے لیے ایک ذخیرۂ آخرت بن جائے"۔

اسلام حضرت ابوالعالیہ مخضرمی تھے یعنی انہوں نے عہد جاہلیت بھی پایا تھا اور عہد اسلام بھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سال بعد مشرف باسلام ہوئے اس لیے صحابی نہ ہو سکے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے قرآن مجید پڑھا، اور اس شوق و رغبت سے کہ ایک رات میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ اس وقت تک ان کو آزادی نہیں ملی تھی۔ دن بھر اپنے آقا کا کام کرتے، اور رات کو قرآن مجید کی اول سے آخر تک تلاوت کرتے تھے۔ یہ محنت

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۱۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱

شاقہ برداشت نہ ہو سکی تو دو راتوں میں ایک قرآن مجید کے ختم کرنے کا اہتمام کیا۔ لیکن یہ بھی برداشت نہ ہو سکا تو تین راتوں میں ایک قرآن مجید ختم کرنے لگے۔ جب یہ بھی ناقابلِ تحمل ثابت ہوا تو اُنھوں نے بعض صحابۂ کرام سے شکایت کی۔ اُنھوں نے بتایا کہ جمعہ جمعہ یا ہفتہ میں کوئی اور دن، بہرحال سات دن میں ایک قرآن مجید ختم کرلینا چاہیے۔ چنانچہ ابوالعالیہ کہتے ہیں "اس مشورہ سے ہم کو عشاء کی نماز کے بعد سونے کا موقع ملجاتا تھا۔ اور ایک ہفتہ میں قرآن مجید ختم کرنا گراں نہیں گذرتا تھا۔[1]

تحصیل علم حضرت ابوالعالیہ کو تحصیلِ علم کا اتنا شوق تھا کہ غلامی کی چند در چند مصروفیتوں کے باوجود اُنھوں نے قرآن مجید پڑھا اور اس کے ساتھ عربی کتابت بھی سیکھی۔ پھر حدیث کا شوق پیدا ہوا تو بصرہ کے علماء سے سماع حدیث کرتے رہے اس سے تشنگی فرو نہ ہوئی تو اُنھوں نے مدینہ طیبہ کا ارادہ کیا تاکہ یہاں صحابۂ کرام سے بلاواسطہ استفادہ کرسکیں۔[2]

فضل وکمال اُن کی اس کوشش اور طلبِ صادق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے عہد کے نامور علماءِ تفسیر وحدیث وفقہ میں شمار ہونے لگے۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں: "کان ثقۃً کثیرالحدیث"[3] یحییٰ بن معین، ابوزرعہ، ابوحاتم اور دوسرے ائمہ کرام بھی انہیں "ثقۃ" مانتے ہیں۔[4] ابوالقاسم الطبری کہتے ہیں "وہ ثقہ ہیں اور اُن کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے۔"[5]

تفسیر قرآن مجید کے ساتھ اُن کو خاص شغف تھا اور اس میں اُنھوں نے خاص بصیرت

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۱ [2] ایضاً ص ۸۲ [3] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۵
[4] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱ [5] ایضاً

پیدا کی تھی، یہاں تک کہ ابوبکر بن ابی داؤد فرمایا کرتے تھے کہ صحابہ کے بعد ابوالعالیہ سے بڑھ کر کوئی عالم بالقرآن نہیں۔ سعید بن المسیب بھی ان کے بعد ہیں[۱]۔

قرأت | تفسیر کے ساتھ قرأت کے فن سے بھی واقف تھے اور اس کی تعلیم انہوں نے باقاعدہ حضرت ابی بن کعب سے حاصل کی تھی۔ حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی دونوں انہیں "المقری" لکھتے ہیں[۲]۔

حدیث | تفسیر و قرأت کے ساتھ انہیں حدیث میں بھی کمال حاصل تھا۔ پہلے گذر چکا ہے اسی شوق میں یہ بصرہ سے سفر کر کے مدینہ طیبہ آئے تھے، یہاں اجلہ صحابہ موجود تھے ان سے انہوں نے حدیث کا سماع کیا۔ ان میں سے بعض نام یہ ہیں:- حضرت عمر بن الخطاب رضؓ۔ ابن مسعودؓ۔ علیؓ اور حضرت عائشہؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ ابوایوبؓ۔ ابوموسیٰؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابوبرزہؓ[۳]۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوالعالیہ سے روایات نقل کی ہیں[۴]۔ اُن کے اس فضل و کمال کی وجہ سے حضرت ابن عباس جو خود بہت بڑے مفسر و محدث اور فقیہ و امام تھے حضرت ابوالعالیہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ حضرت ابن عباس بصرہ کے گورنر تھے، ابوالعالیہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے اپنا ہاتھ حضرت ابوالعالیہ کے ہاتھ میں دے کر اُنہیں تخت ہی پر اپنے پاس بٹھالیا۔ بنوتمیم کا ایک شخص بولا "یہ تو غلام ہیں" آپ نے فرمایا "علم اسی طرح شرفا میں شرف بڑھاتا ہے اور غلاموں کو

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۸۔ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۸ و شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۲

[۳] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۵۱ [۴] ایضاً

تخت پر بٹھاتا ہے[1]۔

فتنہ سے احتراز | ان علمی کمالات کے علاوہ اُن میں عملی و اخلاقی کمالات بھی کچھ کم نہ تھے طبیعت نہایت سلیم پائی تھی۔ فتنہ و فساد سے طبعاً اجتناب کرتے تھے۔ اپنا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہو رہی تھی میں اس زمانہ میں جوان تھا۔ لڑنا مرنا مجھ کو عمدہ عمدہ کھانوں سے بھی زیادہ مرغوب تھا چنانچہ میں نے بھی جنگ میں جانے کا ارادہ کیا، اور اس کے لیے خوب تیاریاں کی میدانِ کارزار میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دونوں صفیں آراستہ ہیں اور اس قدر بڑی ہیں کہ اُن کے کنارے نظر ہی نہیں آتے اُن میں سے ایک فریق نعرۂ تکبیر بلند کرتا تھا، تو فریق ثانی بھی اللہ اکبر پکارتا تھا۔ اب میں نے دل میں سوچا کہ میں ان میں سے کس فریق کو کافر قرار دوں اور کس کو مومن سمجھتا رہوں۔ پھر میں نے خیال کیا کہ مجھ کو یہاں جنگ میں آنے پر کس نے مجبور کیا ہے؟ جواب ملا کسی نے بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے میں میدانِ جنگ سے واپس چلا آیا[2]۔

بے تکلفی | دوستوں کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے رہتے تھے۔ شعیب بن الحجاب بیان کرتی ہیں۔ "ابو العالیہ ہمارے گھر آتے تھے، اور فرماتے" تمہارے گھر میں جو کچھ کھانا تیار ہو ہمیں لاکر کھلادو، بازار سے ہرگز کوئی چیز مت خریدنا[3]۔

بدگمانی سے اجتناب | بدگمانی سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ابو خلدہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت ابو العالیہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اُن کا ایک غلام ایک رومال لیکر

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۲ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۸۳۔

آیا جس میں سربمہر شکر کے ٹکرے تھے۔ ابوالعالیہ نے مہر توڑ کر دس دانے خود غلام کو دیدیے اور پھر فرمایا" اگر یہ غلام خیانت کرتا بھی تو اس سے زیادہ کی خیانت نہ کرتا۔ اور یوں ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ نوکر یا غلام سے کوئی چیز منگائیں تو سربمہر منگائیں، تاکہ بدگمانی کا موقع ہی نہ رہے[1]"۔

بے ریائی انہیں ایسے لباس یا ایسی وضع و قطع سے قلبی نفرت تھی جس سے ریاکاری کی بو آتی ہو۔ ایک دفعہ عبدالکریم اُن کے پاس اونی کپڑے پہنے ہوئے آئے حضرت ابوالعالیہ نے اُنہیں دیکھ کر فرمایا" یہ تمہارا لباس تو راہبوں کا سا لباس ہے۔ مسلمان جب ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے جاتے ہیں تو عمدہ کپڑے پہنتے ہیں"۔

لباس میں نفاست چنانچہ حضرت ابوالعالیہ کا معمول ہی یہ تھا کہ گھر میں سادہ لباس رکھتے اور پاجامہ پہنتے تھے۔ کسی نے اُن سے پوچھا" آپ گھر میں پاجامہ کیوں پہنتے ہیں؟ فرمایا۔ " اس سے ستر خوب ہوتا ہے اور گھر میں مردوں کو پاجامہ ہی پہننا چاہیے، لیکن جب وہ کہیں باہر جاتے تھے تو عمدہ سے عمدہ کپڑے جن میں قمیص، چادر، اور ازار شامل ہوتے تھے، زیب تن فرماتے تھے لیکن ان تمام کپڑوں میں چادر کا زیادہ اہتمام کرتے تھے خود اُن کا بیان ہے کہ میں چادر زیادہ اچھی اوڑھتا ہوں جس کی قیمت بیس اور تیس درہم ہوتی ہے۔

اہل بیت سے محبت اہل بیت سے اُن کو دلی محبت تھی۔ اُن کا یہ معمول تھا کہ اپنے مال کی پوری زکوٰۃ مدینہ منورہ بھیج دیتے تھے تاکہ وہاں اہل بیت کو دیدی جائے اور وہ اپنی صوابدید سے جس مستحق کو جتنا دینا چاہیں دے سکیں۔ جب اُن کا انتقال ہونے لگا تو اُنہوں نے

---

[1] ابن سعد ج ۷، ق ۱ ص ۸۳۔

وصیت کی کہ ئیں جتنا سونا، چاندی یا مال بطور ترکہ چھوڑے جا رہا ہوں اُس کو تین حصوں میں تقسیم کرلیا جائے۔ ایک حصہ فی سبیل اللہ خرچ کیا جائے ایک فقراءِ مسلمین کو دیا جائے، اور ایک تہائی اہل بیت اطہار کی خدمت میں میری طرف سے بطور نذرانہ پیش کردیا جائے"۔ ساتھ ہی وصیت کی کہ میری بیوی کا حق بھی ادا کرنا"۔

نکاح ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص اپنی کسی باندی کو تعلیم و تربیت دے اور پھر اُسے آزاد کرکے اُس سے نکاح کرلے تو اللہ تعالیٰ اُس کو دوہرا اجر دیتا ہے حضرت ابوالعالیہ نے اسی پر عمل کرتے ہوئے اپنی ایک جاریہ کو آزاد کرکے اُس سے نکاح کرلیا تھا۔ اور آپ ان کا بڑا خیال رکھتے تھے، انتقال ہونے لگا تو ورثاء کو خاص طور پر وصیت کی کہ میری بیوی کا حق پورا پورا دے دیا جائے۔ عیدالفطر کے موقع پر اپنی طرف سے ایک قفیز اور اپنی بیوی کی طرف سے دو مکوک یعنی ایک سیر کے قریب صدقہ ادا کرتے تھے۔[۱]

جمال ان معنوی کمالات کے ساتھ قدرت نے کمال صوری سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ اصمعی کا بیان ہے کہ ابوالعالیہ اور مکحول ازدی دونوں جمیل ہیں، اور حضرت ابوالعالیہ ظریف الطبع بھی بہت تھے۔[۲]

وفات علامہ ابن سعد نے تاریخ وفات سنہ ۹۰ھ بتائی ہے لیکن حافظ ذہبی اور ابن عماد الحنبلی دونوں لکھتے ہیں کہ صحیح سنہ ۹۳ھ ہے۔ مرض کے دنوں میں نہایت نحیف ہوگئے تھے۔ بچھونے سے اتر نہیں سکتے تھے وہیں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے اور سجدہ تکیہ پر کرتے تھے۔[۳]

---

[۱] یہ سب واقعات ابن سعد ج ، ق ۱ تذکرہ ابوالعالیہ سے ماخوذ ہیں [۲] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۲ [۳] ابن سعد ج ، ق ۱

خراسان کے کسی علاقہ میں انتقال ہوا۔

عطاء بن یسار

نام و نسب ابو محمد کنیت، عطاء نام، والد کا نام یسار تھا حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی غلامی کا شرف رکھتے تھے۔ مشہور فقیہ سلیمان بن یسار اور عبد الملک کے بھائی تھے[1]۔

ولادت ۱۹ھ میں پیدا ہوئے[2]۔

علم و فضل حضرت میمونہؓ کے شرفِ صحبت اور اس تقریب سے دوسرے اکابر امت کی مجالست نے اُن کو حدیث کا معتمد عالم بنا دیا تھا۔ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں وکان ثقۃ کثیر الحدیث[3]۔ حافظ ذہبی انہیں الامام الربانی اور الفقیہ الواعظ بتاتے ہیں۔ اور پھر تحریر کرتے ہیں "عطاء بڑے ثقہ اور علم کا ظرف تھے[4]"۔

شیوخ انہوں نے صحابۂ کرام کی ایک جماعت کثیرہ سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ جن میں زیادہ مشہور نام یہ ہیں حضرت ابوذرؓ، ابوالدرداءؓ، عبادہ بن الصامتؓ، زید بن ثابتؓ، معاویہ بن الحکم السلمیؓ، ابوایوبؓ، ابوقتادہؓ، ابوہریرہؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ ابن عمرو بن العاص، ابورافعؓ مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ امام بخاری اور ابن سعد کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے بھی حدیث کا سماع کیا تھا، ان بزرگوں سے فیض پانے کے علاوہ علم کی جستجو میں اُنہوں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۱۸ [3] ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۹ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۴

نے شام اور مصر کا بھی سفر کیا تھا۔[۱] حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ عطا بن یسار واعظ، عبادت گذار اور صاحب فضل و کمال تھے۔[۲] امام نووی لکھتے ہیں " ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے

تلامذہ | ان سے جن بزرگوں نے سماع حدیث کا فیض پایا اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں
ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن، محمد بن عمر بن عطار، محمد بن عمرو بن حلحلہ، ہلال بن علی، زید بن اسلم شریک بن ابی نمر، محمد بن ابی حرملہ، عمرو بن دینار

فقہ | حدیث کے بڑے عالم ہونے کے ساتھ وہ فقہ میں بھی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے چنانچہ حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی نے انہیں "الفقیہ" لکھا ہے۔

قضاء | ابن عماد الحنبلی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مدینہ میں ایک سال تک قضاء کی خدمت بھی انجام دیتے رہے تھے۔ ابن قتیبہ بھی یہی لکھتے ہیں[۳]۔

خودداری حضرت عطاء ابن یسار اگرچہ غلام تھے لیکن حضرت میمونہ کی معیت و مصاحبت اور علم و فضل نے اُن میں خودداری کا ایسا جوہر پیدا کر دیا تھا کہ ایک مرتبہ کسی عرب نے اُن کی صاحبزادی سے نکاح کرنا چاہا تو آپ نے جواب میں کہا "ہم تمہارے نسب میں اور تمہارے مرتبہ و مقام میں کوئی قدح پیدا نہیں کرتے لیکن شادی بیاہ کے معاملات ہم اپنے جیسے لوگوں میں ہی کرتے ہیں اور تم بھی شادی اپنے قبیلہ میں ہی کرتے ہو[۴]

وفات | واقدی کی روایت تو یہ ہے کہ عطا ابن یسار کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں ہوئی۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۹۴ھ میں اسکندریہ میں وفات پائی۔ علامہ نووی اس

[۱] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۱۸ [۲] ایضاً [۳] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۲۵ [۴] ابن سعد ج ۵ ص ۱۲۹

روایت کو اصح[1] اور علامہ ابن سعد اس کو اشبہ یعنی زیادہ قابلِ قبول فرماتے ہیں۔[2]

ابوبکر بن عیاش

نام و نسب | ان کے نام میں متعدد اقوال ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ شعبہ نام تھا، ابوبکر کنیت۔ واصل الاحدب الاسدی کے غلام تھے۔ کوفہ وطن تھا، ۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔

علم و فضل | مشہور امام قرأت حضرت عاصم سے تین مرتبہ قرآن مجید پڑھا تھا۔ علم حدیث میں اُن کے مشہور اساتذہ یہ ہیں۔

ابو اسحاق السبیعی۔ عبدالملک بن عمیر، صالح مولیٰ عمرو بن حریث، اسماعیل السدی

تلامذہ | ان کے علم و فقاہت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام احمد بن حنبل، ابوداؤد الطیالسی، ابوکریب، ابن مبارک، اور ابن نمیر، ایسے ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔ ابن مبارک کہتے تھے "میں نے کسی شخص کو حدیث کی طرف سبقت کرنے میں ابوبکر بن عیاش سے زیادہ تیز نہیں پایا"۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے "ابوبکر بن عیاش صاحبِ قرآن و خبر ہیں"۔

حدیث میں اُن کا پایہ | امام ابوداؤد انہیں ثقہ کہتے ہیں لیکن امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: "ربما غلط"۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں "ابوبکر اپنے صلاح کامل کی وجہ سے معروف و مشہور ہیں وہ صاحب فقہ تھے اور اخبار کا علم بھی رکھتے تھے لیکن اُن کی حدیثوں میں اضطراب پایا جاتا ہے"

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۲۵ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۱۳۰

علامہ ذہبی انہیں شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔

زہد و ورع | علم کے ساتھ صاحب زہد و ورع بھی تھے۔ یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ ابو بکر بڑے عالم و فاضل تھے، چالیس برس تک انہوں نے اپنا پہلو زمین سے نہیں لگایا۔

مقولہ | اُن کے بعض مقولے بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے تھے۔ ابو ہشام الرفاعی بیان کرتے ہیں، ایک مرتبہ ابو بکر بن عیاش نے فرمایا:-

الخلق اربعۃ معذور و مخبور و مجبور	خلق چار قسم کی ہے۔ معذور، آزمودہ، مجبور
ومثبور فالمعذور البہائم و	و بے بس اور ہلاکت زدہ۔ معذور بہائم ہیں،
المخبور بنو آدم والمجبور الملائکۃ	آزمودہ انسان، مجبور و بے بس فرشتے، اور
والمثبور ابلیس۔	ہلاکت زدہ شیاطین ہیں۔

خشیت ربانی کا اُن پر غلبہ رہتا تھا، ایک مرتبہ فرمایا "دنیا میں آنا تو سہل ہے لیکن یہاں سے منتقل ہو کر اللہ کی طرف جانا بہت سخت ہے"۔

وفات | جمادی الاولیٰ ۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت بہن پاس بیٹھی تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ آپ نے فرمایا "تم روتی کیوں ہو؟ اس گوشہ کو دیکھو یہاں میں نے اٹھارہ ہزار مرتبہ قرآن مجید ختم کیا ہے"[1]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۴-۲۴۵۔

زید بن اسلم

نام ونسب | ابواسامہ کنیت، زید نام۔ والد کا نام اسلم تھا حضرت عمرؓ کے غلام تھے۔

علم وفضل | زید کو اُس محترم ومقدس ہستی کی غلامی کا شرف حاصل تھا جس کے فیضانِ صحبت نے بے مقدار ذروں کو چشمک زنِ آفتاب بنا دیا تھا۔ پھر زید تو غلامی کی وجہ سے ہر وقت اُن کی صحبت ومعیت سے شاد کام ہوتے تھے، چنانچہ حضرت زید علم وعمل کا ایک پیکر لطیف بن گئے اور وہ مدینہ کے علماءِ اعلام وصلحاءِ کرام میں شمار ہونے لگے۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام المدنی الفقیہ" لکھتے ہیں[۱]۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں "ومناقبہ کثیرۃ"[۲]

تفسیر | اُن کو حضرت ابن عمرؓ کے فیضانِ صحبت کے باعث تفسیر میں خاص درک تھا۔ یعقوب بن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ "زید تفسیر قرآن کے عالم تھے[۳]" عبیداللہ بن عمر کا ان کی نسبت ایک قول ہے کہ "زید قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے بکثرت کرتے تھے" اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اس قول کے مطابق زید تفسیر القرآن بالرائے کی وعید کے ماتحت داخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عبیداللہ بن عمر اسی مقولہ میں یہ بھی فرماتے ہیں "لا اعلم بہ باساً" اور ممکن ہے کہ حضرت زید نے بعض آیات کی تفسیر ایسی روایات کی روشنی میں کی ہو جس سے حضرت عبیداللہ بن عمر بے خبر ہوں اور اس بنا پر انہوں نے زید کی تفسیر کو تفسیر بالرائے کہہ دیا ہو[۴]۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴۔ [۲] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۰۰ [۳] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶
[۴] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶۔

حدیث | تفسیر کی طرح حدیث میں بھی اُن کو یکساں کمال حاصل تھا۔ صحابہ میں اُنھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر، ابوہریرہ، اُم المومنین عائشہ صدیقہ، جابر، ربیعۃ بن عباد، سلمہ بن اکوع اور انس بن مالک سے روایت کی ہے۔ تابعین میں اُن کو متعدد اکابر سے سماع کا شرف حاصل تھا۔

درس حدیث | خاص مسجد نبوی میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیتے تھے جس میں مدینہ طیبہ کے اکابر علماء وفقہاء شریک ہوتے تھے۔ ابو حازم کا بیان ہے کہ حضرت زید کی مجلس میں چالیس بڑے بڑے فقہاء شرکت کرتے تھے۔ جن کی باہمی الفت وموانست کی ایک ادنیٰ دلیل یہ تھی کہ ایک کا مال دوسرے کی خدمت واعانت کے لیے ہمہ وقت موجود رہتا تھا، اور اُن میں سے دو شخص کبھی آپس میں بے فائدہ لڑتے جھگڑتے اور نزاع و پیکار کرتے نہیں دیکھے گئے۔[1]

حضرت زید کے حلقۂ درس میں امام زین العابدین علی بن الحسین بھی شریک ہوتے تھے۔ ایک دن نافع بن جبیر بن مطعم نے اُن سے کہا کہ آپ اپنے خاندانی حلقہ کو چھوڑ کر عمر بن الخطاب کے غلام کے حلقہ میں شریک ہوتے ہیں؟ فرمایا "انسان اُسی شخص کے پاس بیٹھتا ہے جس کی صحبت اُس کے دین کے لیے نافع ہوتی ہے"[2]۔

تلامذہ | جن لوگوں نے اُن کے دامنِ علم سے خوشہ چینی کی اُن کی فہرست بہت طویل ہے، چند اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت زید کے تین صاحبزادے، اُسامہ، عبداللہ اور عبدالرحمن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶۔

مالک، ابن عجلان، ابن جریج، سلیمان بن بلال، حفص بن میسرہ، داؤد بن القیس الفراء، ایوب السختیانی، جریر بن حازم، عبیداللہ بن عمر، ابن اسحاق، محمد بن جعفر بن ابی کثیر، معمر، ہشام بن سعد، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری رحمہم اللہ اجمعین۔

جلالت شان زید اگرچہ غلام تھے، لیکن اُن کا علمی دبدبہ کسی سلطان سے کم نہ تھا۔ وہ جب چاہتے خود حدیث بیان کرنے لگتے تھے، خاموش ہو جاتے تو اُٹھ کر واپس تشریف لیجاتے کسی شخص کو اُن سے سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ابنِ عجلان کا بیان ہے۔ مجھ پر کبھی کسی شخص کی ہیبت نے اتنا اثر نہیں کیا جتنا زید بن اسلم کی ہیبت نے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ زید نہایت نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ بے ڈھنگے سوالات سے اُن کو طبعاً بڑی ناگواری ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ابنِ عجلان نے اُن سے کوئی بات پوچھی تو اُنھوں نے فرمایا "جاؤ پہلے یہ سیکھو کہ سوالات کس طرح کیے جاتے ہیں، پھر میرے پاس آؤ" ایک دفعہ حضرت زید نے کوئی حدیث بیان کی، اس پر ایک شخص بولا "آپ نے یہ کس سے سُنی ہے؟" فرمایا "اے بھتیجے! ہم بے وقوفوں کی صحبت میں نہیں بیٹھتے تھے"[1]

ہردلعزیزی اُن کا یہ رعب داب اُن کی علمی جلالت وعظمت کی وجہ سے تھا۔ ورنہ ویسے وہ بہت ہردلعزیز اور محبوب کل تھے۔ اُن کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ میرے پدر بزرگوار کے چند ہم نشین تھے، اُن میں سے کسی کے پاس میرے والد مجھ کو کبھی کسی کام سے بھیجتے تھے تو وہ فرطِ شفقت سے میرے سر کو چھوتے اور اُسے بوسہ دیتے اور کہتے کہ بخدا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۵، ۳۹۶۔

تمہارے والد مجھ کو میرے بال بچوں اور گھر والوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں، اگر خدا مجھ کو اُن میں اور زید بن اسلم میں اختیار دے تو میں یہ پسند کرونگا کہ میرے سب اہل و عیال مرجائیں اور میرے لیے صرف زید زندہ و سلامت رہیں[1]۔ ابو حازم کہتے تھے "مجھ کو خدا وہ دن نہ دکھائے جبکہ میں زید کے انتقال کی خبر سنوں۔ اب کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہا جو میرے دین اور نفس کے اعتبار سے مجھ کو ان سے زیادہ پسند ہو"۔ چنانچہ جب انہیں زید کے انتقال کی خبر پہنچی تو اُن پر ایسی بے ہوشی طاری ہوگئی کہ وہ اُن کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوسکے[2]۔

فقہ | فقہ میں بھی اُن کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، امام نووی سب اُن کو فقیہ امام مانتے ہیں۔

زہد و اتقاء | علمی کمالات کے ساتھ اُن کی کلاہِ افتخار میں اخلاقی و عملی کمالات کا طرۂ امتیاز بھی لگا ہوا تھا، حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وکان من العلماء الابرار"۔ ابن عیینہ کا بیان ہے "کان زید بن اسلم رجلاً صالحاً"[3] امام نووی بھی انہیں "صالح تابعی" لکھتے ہیں۔ حدیث میں نیک لوگوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ حضرت زید اس کے صحیح مصداق تھے۔ ابو حازم کہا کرتے تھے "اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں زید کو دیکھتا ہوں تو اُن کے دیدار سے ہی تیری عبادت کی قوت مجھ میں پیدا ہو جاتی ہے، پھر اُن کی ملاقات اور اُن سے بات چیت کا تو کیا کچھ اثر نہ ہوگا[4]۔

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۴۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵۔
[4] ایضاً۔

وفات ۱۳۶ھ میں وفات پائی[1]

یزید بن ابی حبیب

نام ونسب یزید نام، ابورجا کنیت، والد کی کنیت ابی حبیب اور نام سوید تھا۔ قریش کی ایک شاخ بنی عامر بن لوئی کے غلام تھے۔

پیدائش حضرت معاویہ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے، مصر میں نشوونما پائی۔ اسی وجہ سے اُن کو مصری کہتے ہیں[2]۔

فضل وکمال فضل وکمال کے لحاظ سے ائمہ تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی انہیں "الامام الکبیر" اور ابن عماد الحنبلی "شیخ مصر" لکھتے ہیں۔ مصر میں انہی کی ذات سے علم کا چرچا ہوا۔ ابن یونس کا بیان ہے کہ یزید سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے مصر میں علم ظاہر کیا اور حلال وحرام کے مسائل کو پھیلایا۔ اس سے قبل لوگ صرف ترغیبات اور فتن کا ذکر کرتے تھے[3]۔

حدیث حضرت یزید مصر کے ممتاز امام حدیث تھے۔ حافظ ذہبی انہیں "حجۃ حافظ للحدیث[4]" اور علامہ ابن سعد ثقۃ کثیر الحدیث لکھتے ہیں[5]۔ ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں[6]۔

شیوخ انہوں نے حدیث میں کثیر التعداد ائمہ حدیث سے استفادہ کیا تھا جن میں سے چند

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۵ [2] ایضاً ص ۱۲۲ [3] ایضاً ص ۱۲۱ و ۱۲۲ [4] ایضاً ص ۱۲۲۔
[5] ابن سعد ج ۷، ق ۲ ص ۲۰۲ [6] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۹۔

نام یہ ہیں :- عبداللہ بن حارث، ابوالطفیل، اسلم بن یزید، ابی عمران، ابراہیم بن عبداللہ بن حنین، عطا بن ابی رباح، عراک بن مالک۔ اور امام زہری۔

تلامذہ | ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، اُن میں چند یہ ہیں۔ سلیمان التیمی، محمد بن اسحاق۔ زید بن ابی انیسہ، عمرو بن الحارث، عبدالحمید بن جعفر، ابن لہیعہ، اور لیث بن سعدؒ۔[1]

فقہ | حدیث کے ساتھ انہیں فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ حافظ ذہبی انہیں "المصری الفقیہ" لکھتے ہیں[2]۔ مصر کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جو تین مفتی مقرر کیے تھے حضرت یزید بن ابی حبیب بھی اُن سے ایک تھے[3]۔

جلالت شان | یہ علمی کمالات کا وقار بہت ملحوظ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ریان بن عبدالعزیز نے پیغام بھیجا کہ "مجھ کو آپ سے چند مسائل دریافت کرنے ہیں۔ ازراہ کرم کسی وقت تکلیف گوارا کرکے تشریف لائیے" آپ نے جواباً کہلا بھیجا "تم خود میرے پاس آؤ، کیونکہ تمہارا میرے پاس آنا تمہارے لیے زینت اور میرا تمہارے پاس جانا تمہارے لیے عیب ہے"[4]۔

صاف گوئی | امرا سے اس درجہ استغناء کے باعث اُنہیں بڑے سے بڑے جابر و ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کے اظہار میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ جبکہ آپ بیمار تھے مصر کا امیر حوثرہ بن سہیل آپ کی عیادت کے لیے آیا اور پوچھنے لگا "اے ابو رجا جس کپڑے پر مچھر کا خون لگ جائے اُس کا کیا حکم ہے؟ اُس کے ساتھ نماز ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟" آپ نے اپنا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۱ [3] ایضاً ص ۱۲۲ [4] ایضاً

چہرہ پھیر لیا اور جواب میں کچھ نہیں فرمایا۔ پھر جب حوثرہ چلنے لگا اور حضرت یزید نے اُسے دیکھا تو فرمایا "تم روزانہ خلق خدا کا خون بہاتے ہو لیکن مجھ سے مسئلہ مچھروں کے خون کا دریافت کرتے ہو"[1]

حلم وعقل اُن کی یہ صاف گوئی کسی تند مزاجی پر مبنی نہیں تھی، ویسے وہ بہت بردبار اور خلیق و ملنسار تھے۔ ابن یونس کا بیان ہے۔ وکان حلیما عاقلا۔ حضرت یزید خود فرماتے ہیں "اگر میرا کوئی بھائی مجھ پر غضبناک ہوتا ہے تو میں اُس کو دوبارہ غضبناک ہونے کا موقع نہیں دیتا بلکہ اُس کے غصہ کا اصل سبب دریافت کرتا ہوں اور پھر جو بات اُس کو بُری لگتی ہے اُسے چھوڑ دیتا ہوں"[2]

علماء کا اعتراف اِن کمالات کی وجہ سے علماءِ معاصرین اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لیث بن سعد انہیں "سیدنا وعالمنا" کہتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ لیث بن سعد انہیں اور عبیداللہ بن جعفر کو اپنے ملک کے دو جوہر بتاتے تھے[3] ابن وہب کہتے ہیں "اگر ان دونوں کو ایک ترازو میں رکھ دیا جائے تو دونوں برابر رہیں گے کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہوگی"[4]

رجوع خلق پبلک میں اُن کو عام ہر دلعزیزی اور عزت حاصل تھی کسی خلیفہ کے ہاتھ پر جب تک یزید بن ابی حبیب اور عبیداللہ بن جعفر بیعت نہیں کر لیتے تھے کوئی اور شخص اقدام کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس عام شہرت و ہر دلعزیزی کے باعث ان کے پاس مسائل دریافت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آخر کار آپ نے تنگ آکر خانہ نشینی اختیار کر لی[5]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲، [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۱۹ [4] ایضاً [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲

حلیہ | رنگ آبنوس کی طرح سیاہ تھا۔

وفات | ۱۲۰ھ میں وفات پائی[1]

ابو الزناد عبد اللہ بن ذکوان

نام ونسب | عبد اللہ نام والد کا نام ذکوان تھا۔ کنیت ابو عبد الرحمٰن تھی لیکن وہ ابو الزناد کے لقب سے اتنے مشہور ہوئے کہ لوگ ابو عبد الرحمٰن بھول گئے۔ مدینہ کے رہنے والے تھے عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی رملہ کے غلام تھے اس لیے قرشی کہلاتے تھے بعضوں کا خیال ہے کہ یہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے خاندان کے غلام تھے[2]

ولادت | ان کی ٹھیک تاریخ ولادت معلوم نہیں لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۳۰ھ میں ہوا اور اس وقت ان کی عمر ۶۶ برس کی تھی[3]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۴ھ میں پیدا ہوئے ہونگے۔ تابعین کرام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

علم وفضل | ابو الزناد نے انس بن مالک، ابو امامہ، عروۃ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن، شعبی، علی بن الحسین اور سعید بن المسیب اور عبد اللہ بن جعفر سے سماع کیا تھا۔ ان بزرگوں کے فیضِ صحبت اور ان کے اپنے طبعی رجحان و استعداد نے انہیں علم وفضل کے آسمان کا کوکبِ تاباں بنا دیا۔ امام نووی لکھتے ہیں "اور لوگوں نے متفقہ طور پر ابو الزناد کی کثرتِ علم، قوتِ حفظ، فضل، تنوع وتفنن فی العلوم، اور ان کی ثقاہت وتوثیق اور ان کے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۰۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۶ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۳۵، ۲۴۶

[4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۰۴

قابلِ حجت ہونے پر اتفاق کیا ہے اور سب نے مل کر ان کی بڑی ثنا کی ہے[1]۔

حضرت سفیان فرماتے ہیں "ابو الزناد حدیث میں امیر المومنین ہیں[2]" امام بخاری فرماتے ہیں "بہترین سندیں دو ہیں ایک "مالك عن نافع عن ابن عمر" اور دوسری "ابو الزناد عن الاعرج عن ابی هريرة" علی بن المدینی کہتے ہیں "کبار تابعین کے بعد ابن شہاب، یحییٰ بن سعید، ابو الزناد اور بکیر بن عبداللہ بن اشج سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔

تلامذہ | ان کا دامانِ فیض بھی بڑا وسیع تھا جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا بڑے پایہ کے علماء شمار کیے جاتے تھے، مثلاً ابن ابی ملیکہ، ہشام بن عروہ، ابو اسحاق الشیبانی۔ اور عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم وغیرہم

فقہ | حدیث کی طرح اُن کو فقہ میں بھی کمال حاصل تھا یہاں تک کہ مدینہ کے اکابر فقہاء میں شمار ہوتا تھا۔ حافظ ذہبی اُنھیں "فقیہ المدینہ" لکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ انہیں ربیعہ سے بڑا فقیہ بتاتے ہیں[3]۔

جامعیت | ایک حدیث و فقہ ہی کیا، اُنہیں تقریباً تمام علوم متداولہ میں یکساں مہارت حاصل تھی مصعب الزبیری کہتے ہیں "ابو الزناد اہل مدینہ کے فقیہ تھے اور کتابت و حساب کے بھی ماہر تھے۔ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں مدینہ کے دفاتر سرکاری کی جانچ پڑتال انہی کے سپرد تھی[4]۔

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۴۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۷
[3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۲ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۷۔

عبد ربہ بن سعید کا بیان ہے ایک مرتبہ میں نے ابوالزناد کو دیکھا کہ مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں داخل ہوئے تو اُس وقت اُن کے ساتھ جیسا بادشاہوں کے جلو میں ہوتا ہے، تین سو طلبا کا جم غفیر تھا۔ اس مجمع میں کچھ لوگ فرائض، کچھ ریاضی اور حساب، چند ایک شعر و شاعری، کچھ حدیث اور بعض کسی اور مسئلہ کی نسبت سوال کر رہے تھے۔ اور وہ سب کو جواب دیتے جاتے تھے[1]۔

علامہ ابن سعد فرماتے ہیں "کان ابوالزناد ثقۃً کثیر الحدیث فصیحاً بصیراً بالعربیۃ عالماً عاقلاً" ابن حبان کے نزدیک وہ ثقہ ہیں، فقیہ اور صاحب کتاب ہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں "اُن کی تمام حدیثیں درست اور صحیح ہیں[2]" امام نسائی، عجلی، ساجی، اور ابوجعفر الطبری سب نے ان کو ثقہ مانا ہے۔

ولایت حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو اپنے عہد میں عراق کے خراج کا منصرم بھی بنایا تھا۔ ان کے ساتھ عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کام کرتے تھے[3]۔

وفات ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں جبکہ ایک مرتبہ یہ غسل کر رہے تھے، ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔

ربیعۃ الرائی

نام ونسب ربیعہ نام، ابوعثمان کنیت، رائی لقب، باپ کا نام فروخ اور ابوعبدالرحمٰن کنیت،

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۰۴ [2] ایضاً ص ۲۰۵ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۸۲۔

آلِ منکدر کے غلام تھے۔

پیدائش اور تعلیم

ان کی پیدائش اور تعلیم کا عجیب واقعہ ہے، حضرت ربیعہ کے والد ابو عبدالرحمٰن فروخ کو بنو امیہ کے عہد میں خراسان کی ایک مہم پر جانا پڑا، اُس وقت ربیعہ شکمِ مادر میں تھے۔ فروخ نے چلتے وقت اپنی بیوی کے پاس تیس ہزار دینار گھر کے اخراجات کے لیے چھوڑ دیے تھے۔ خراسان پہنچ کر کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ فروخ پوری ستائیس برس تک وطن (مدینہ) واپس نہ آسکے۔ ربیعہ کی والدہ نہایت روشن خیال اور عقلمند تھیں۔ ربیعہ سنِ شعور کو پہنچے تو انھوں نے اُن کے لیے تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا۔ اور اس سلسلہ میں جتنا روپیہ اُن کے پاس تھا سب خرچ کر ڈالا۔ ستائیس برس کے بعد جب فروخ مدینہ واپس آئے تو اس شان سے کہ گھوڑے پر سوار تھے، اور ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔ مکان پر پہنچ کر نیزے کی نوک سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دستک سُن کر ربیعہ دروازہ پر آئے۔ اس وقت باپ بیٹے آمنے سامنے تھے، لیکن ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا تھا۔ ربیعہ نے فروخ کو اجنبی سمجھ کر کہا۔ "اے دشمنِ خدا! تو میرے مکان پر حملہ کرتا ہے؟" فروخ بولے "نہیں! بلکہ اے دشمنِ خدا، تو میرے حرم میں گھسا ہوا ہے"۔ اسی میں بات بڑھ گئی، اور نوبت بایں جا رسید کہ دونوں ایک دوسرے سے دست گریباں ہوگئے۔ اس شور وغل اور ہنگامہ کی آواز سے آس پاس کے لوگ جمع ہوگئے۔ شدہ شدہ خبر امام مالک بن انس کو بھی پہنچ گئی۔ ربیعہ اس وقت گو عمر کے لحاظ سے نوجوان تھے لیکن علم وفضل میں اُن کا چرچا دور دور تک پھیل گیا تھا، اور امام مالک ایسے ائمۂ حدیث اُن کے درس میں شریک

ہوتے تھے۔ امام مالک اور اُن کے ساتھ بعض دوسرے مشائخ وقت اس لیے یہاں آ رہے تھے کہ اپنے اُستاذ حضرت ربیعہ کی امداد کریں۔ امام مالک جس وقت یہاں پہنچے تو ربیعہ اُس وقت فروخ سے کہہ رہے تھے "خدا کی قسم! میں تم کو بادشاہ کے پاس لیجائے بغیر نہیں مانونگا" اس پر فروخ کہتے تھے "اور میں تم کو کس طرح بادشاہ کے سامنے پیش کرنے سے باز رہ سکتا ہوں۔ جبکہ تم یہاں میری بیوی کے پاس ہو"۔ لوگ درمیان میں بیچ بچاؤ کرا رہے تھے لیکن شور وشغب برابر بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے امام عالیمقام حضرت مالک بن انس کو آتے ہوئے دیکھا تو سب چُپ ہو گئے۔ امام نے آتے ہی فروخ سے مخاطب ہو کر فرمایا "بڑے میاں! آپ کسی دوسرے گھر میں قیام کر لیجیے"۔ فروخ بولے "یہ تو میرا ہی گھر ہے، میرا نام فروخ ہے اور میں بنو فلاں کا غلام ہوں" حضرت ربیعہ کی ماں نے اندر سے جو یہ سُنا تو باہر نکل آئیں اور اُنہوں نے کہا "ہاں یہ فروخ میرے شوہر ہیں اور یہ ربیعہ میرے لڑکے ہیں۔ فروخ جب خراسان کی مہم پر جا رہے تھے، ربیعہ میرے شکم میں تھے۔ اس حقیقت کے کھُل جانے پر باپ بیٹے دونوں نے معانقہ کیا اور خوب مل کر روئے۔ اب فروخ گھر میں داخل ہوئے اور بیوی سے ربیعہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ میرا بیٹا ہے؟" بولیں "ہاں" تھوڑی دیر کے بعد فروخ نے بیوی سے اُس روپیہ کے متعلق دریافت کیا جو وہ خراسان جاتے ہوئے ان کو دے گئے تھے، اور کہا کہ لو میرے ساتھ یہ چار ہزار دینار اور ہیں۔ یہاں یہ سب روپیہ حضرت ربیعہ کی تعلیم پر خرچ ہو چکا تھا۔ بیوی بولیں "میں نے وہ مال دفن کر دیا ہے۔ چند روز کے بعد نکال دونگی، ابھی ایسی جلدی کیا ہے" معمول کے مطابق

حضرت ربیعہ وقت پر مسجد میں تشریف لے گئے اور درس دینا شروع کر دیا جس میں امام مالک
حسن بن زید، ابن ابی علی، اور دوسرے اعیانِ مدینہ شریک تھے۔ والدۂ ربیعہ نے درس
کا وقت پہچان کر فروخ سے کہا کہ جاؤ نماز مسجد نبوی میں پڑھنا، اب فروخ یہاں آئے،
نماز پڑھی، پھر انہوں نے دیکھا کہ درسِ حدیث کا ایک زبردست حلقہ قائم ہے۔ ان کو
سننے کا شوق ہوا، حلقہ کے قریب چلے آئے۔ لوگوں نے ان کو دیکھ کر راستہ دینا شروع کر دیا
حضرتِ ربیعہ نے درس میں خلل پڑنے کے خیال سے سر جھکا لیا، اور ایسے ہو گئے کہ گویا انہوں
نے دیکھا ہی نہیں۔ فروخ اس حالت میں انہیں شناخت نہ کر سکے۔ لوگوں سے پوچھا
"یہ کون ہیں؟" جواب ملا "ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن" ابو عبدالرحمٰن فروخ فرطِ مسرت سے
بیتاب ہو گئے اور کہنے لگے "اللہ نے میرے بیٹے کا مرتبہ بلند کیا ہے" گھر واپس آئے تو
بیوی سے بولے "میں نے آج تمہارے بیٹے کو ایسی شان میں دیکھا ہے کہ کسی صاحبِ علم
وفقہ کو نہیں دیکھا" اب حضرت ربیعہ کی والدہ نے کہا "آپ کو کیا چیز زیادہ پسند ہے، وہ
تیس ہزار دینار یا یہ جاہ و منزلت علمی؟" فروخ بولے "نہیں، خدا کی قسم یہ وجاہت زیادہ
محبوب ہے"۔ کہنے لگیں "میں نے وہ سب روپیہ اسی پر صرف کر دیا ہے"۔ فروخ نے کہا
"تم نے وہ روپیہ صحیح مصرف میں خرچ کیا ہے"[1]۔

علم وفضل حضرت ربیعہ کی عاقلہ و فرزانہ والدۂ ماجدہ نے جس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ
بیٹے کی تعلیم پر روپیہ خرچ کیا تھا، اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ ان کا فرزندِ ارجمند ایک غلام زادہ

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۱، ۴۲۲۔

ہونے کے باوجود علم وفضل کے آسمان پر مہر جہانتاب بن کر چمکا اور دنیا کو اپنی فیض بار شعاعوں سے فائدہ پہنچایا۔ حضرت ربیعہ کی جلالتِ شانِ علم تمام علماء و محدثین میں مسلم ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں "تمام علماءِ محدثین اُن کی توثیق، جلالت، اور علم وفہم میں اُن کی بلندی مرتبت پر متفق ہیں[1]۔ ابن الماجشون کہتے ہیں "میں نے ربیعہ سے بڑھ کر کوئی حافظ سنت نہیں دیکھا[2]۔ سوار بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے ربیعۃ الرائی سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ اس پر کسی نے اُن سے پوچھا "حسن اور ابن سیرین بھی نہیں؟" بولے "ہاں حسن اور ابن سیرین بھی نہیں[3]"۔ حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں "وکان اماماً حافظاً فقیھاً مجتھداً بصیراً بالرای[4]"۔

حدیث حضرت ربیعہ نے متعدد صحابۂ کرام اور کئی ایک تابعین عظام سے فیضِ صحبت اُٹھایا تھا جس کی وجہ سے وہ حدیث کے ممتاز حفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ خطیب بغدادی اور حافظ ذہبی اُن کو "حافظ للحدیث" لکھتے ہیں۔ اُنہوں نے جن ائمۂ حدیث سے روایت کی ہے اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ حضرت انس، سائب بن یزید، محمد بن یحییٰ بن المسیب، قاسم بن محمد، ابن ابی لیلیٰ، اعرج، مکحول، حنظلہ بن قیس الزرقی وغیرہم۔

حضرت ربیعہ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ قیاس اور رائے سے زیادہ کام لیتے ہیں اسی بنا پر اُن کو رائی کہا جاتا تھا لیکن وہ حافظ سنت تھے اور اُن کی جو رائے ہوتی تھی

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۹۰۔
[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۹
[3] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۸۳۔
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸

سُنت کی روشنی میں ہوتی تھی، چنانچہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ نے ایک مرتبہ اہلِ عراق کو خطاب کر کے کہا "اے عراق والو تم ربیعہ کو رائی کہتے ہو، حالانکہ میں نے اُن سے بڑا کوئی حافظِ سُنت نہیں دیکھا"[1] حافظ ابن حجر اُن کو ثقہ کثیر الحدیث بتلاتے ہیں۔

فقہ | فقہ حضرتِ ربیعہ کی کلاہِ افتخار کا طرۂ امتیاز ہے، اور اُن کی شہرت اسی میں زیادہ ہے وہ اس میں امامت و اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی انہیں امام فقیہ مجتہد لکھتے ہیں خطیب بغدادی بھی انہیں حافظٌ للفقہ والحدیث کا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں[2]۔ امام مالک جو خود بہت بڑے فقیہ اور امام تھے، حضرتِ ربیعہ کی وفات ہوئی تو انہوں نے فرمایا "ذہبت حلاوۃ الفقہ" فقہ کا مزہ ہی جاتا رہا[3]۔ امام ابو حنیفہ بھی حضرت ربیعہ کے تلمیذ تھے۔ ابنِ زید کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ کو حضرت ربیعہ کی خدمت میں دیکھا ہے ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ربیعہ جو کچھ فرمائیں اُسے کما حقہ سمجھ لیں[4]۔

ذہانت و فطانت | اُن کے فقہی کمال کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فطرۃً نہایت ذہین و فطین واقع ہوئے تھے یحییٰ بن سعید کہتے ہیں "میں نے ربیعہ سے زیادہ کوئی صاحبِ فطانت و ذہانت نہیں دیکھا"۔ ایک دوسری روایت میں اُن کے الفاظ ہیں ما رأیت احدًا اسدّ عقلاً من ربیعۃ بن ابی عبدالرحمٰن[5]

فتویٰ | اس فقہی کمال کی وجہ سے اُن کو مدینہ طیبہ میں افتاء کا شرف حاصل تھا۔ حافظ ابن حجر

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸ [2] خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۰ [3] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۹ [4] خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۲ [5] ایضاً ص ۴۲۳ [6] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸۔

لکھتے ہیں "وکان صاحب الفتویٰ بالمدینۃ"[1]

احتیاط | لیکن فتویٰ دینے میں وہ بڑے محتاط تھے۔ جب تک کسی چیز سے متعلق اُن کو ذاتی طور پر تسلی و تشفی نہیں ہوتی تھی وہ اس پر کوئی حکم نہیں لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے مرض الموت میں عبدالعزیز بن ابی سلمہ نے اُن سے کہا "ہم کو آپ اب تک تعلیم دیتے رہے ہیں لیکن ہمارے پاس بعض اوقات لوگ ایسی چیزوں کی نسبت سوال کرتے ہیں جن کے بارہ میں ہم نے آپ سے کچھ نہیں سُنا، تو کیا ایسے مواقع پر آپ ہم کو اجازت دیتے ہیں کہ اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دے دیں، کیونکہ ہماری رائے اُن کی رائے سے بہر حال بہتر ہوگی"۔ حضرت ربیعہ یہ سُن کر بولے "مجھ کو ذرا بٹھا دو" اس کے بعد فرمایا "عبدالعزیز تم پر افسوس ہے، تم جاہل ہو کر مرو یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم کسی چیز کے متعلق بغیر علم کے کوئی حکم بیان کرو۔ پھر نہیں نہیں، تین مرتبہ فرمایا"[2]۔ یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں۔ حضرت ربیعہ بڑے بڑے مشکل مسائل کو حل کرتے تھے اور اہل مدینہ کے رئیس الفتویٰ تھے[3]

اہل عراق نے ان پر قیاس آرائی اور رائے زنی کی جو تہمت لگائی تھی حضرت ربیعہ اُس سے بہت ناراض تھے۔ چنانچہ جب وہ عراق جانے لگے تو اُنہوں نے امام مالک سے فرمایا "اگر تم یہ سُنو کہ میں نے اہل عراق کے سامنے کوئی حدیث بیان کی ہے۔ یا کسی مسئلہ میں اُن کو فتویٰ دیا ہے، تو تم مجھ کو ناقابلِ اعتبار چیز سمجھنا"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ عراق میں پہنچ کر بالکل خانہ نشین رہے۔ وہاں نہ کسی سے کوئی حدیث بیان کی اور نہ کسی مسئلہ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸ [2] ایضاً ص ۲۵۹ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۸۹

میں کوئی فتویٰ دیا۔[1]

قضاء | کمال تفقہ کے باعث ابوعباس السفاح نے حضرت ربیعہ کو عہدۂ قضا پیش کرنا چاہا تھا اور اس مقصد کے لیے کسی بہانہ سے اُس نے اُن کو انبار بلوا بھی لیا تھا[2] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے سفاح کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ حضرت ربیعہ طبیعت کے نہایت خوددار اور آزادی پسند تھے اور وہ سفاح سے کشیدہ خاطر بھی رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ سفاح نے ان کی خدمت میں ایک تحفہ بھیجا تو اُنھوں نے اُس کو رد کر دیا۔ اس کے بعد اُس نے پچاس ہزار درہم بھیجے تاکہ حضرت ربیعہ اُن سے اپنی خدمت کے لیے کوئی لونڈی خرید سکیں۔ آپ نے یہ رقم بھی قبول نہیں کی۔[3] اس کے علاوہ آپ کے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ اس عہدہ کو ایک دنیا دارانہ مشغلہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن یحییٰ بن سعید سے اُنھوں نے باتوں باتوں میں قضا کی نسبت ارشاد فرمایا کہ یہ تمہارے لیے اُن چیزوں میں بہتر ہے جو تم دنیوی مال و متاع سے حاصل کرنی چاہتے ہو۔[4]

درس | جیسا کہ شروع میں گذر چکا ہے، حضرت ربیعہ مسجد نبوی میں حدیث کا اور فقہ کے مسائل کا درس دیتے تھے۔ جس میں بڑے بڑے اعیان علما شرکت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُن کے حلقہ میں چالیس حدیث کے علما شامل تھے جن کے سروں پر عمامے بندھے ہوئے تھے۔ اُن کی تقریر عقل و حکمت کے مضامین سے پُر ہوتی تھی۔ ابن زید کا بیان ہے کہ حضرت ربیعہ ایک زمانہ تک خانہ نشین رہے جس میں اُن کا مشغلہ بجز

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۵ [2] ایضاً ص ۴۲۱ [3] ایضاً ص ۴۲۵ [4] ایضاً ص ۴۲۳۔

شب و روز نماز پڑھنے کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر انہوں نے لوگوں میں نشست و برخاست شروع کردی۔ اور وہ جب کبھی بولتے تھے عقل و حکمت کی باتیں کرتے تھے[1]

تلامذہ | اُن کے فیضانِ درس نے ایک کثیر جماعت کو علم و عمل کا پیکر بنادیا جن میں امام مالک بن انس، یحییٰ بن سعید الانصاری، اور سلیمان التیمی، شعبہ، سفیان بن عیینہ، سفیان الثوری، حماد بن سلمہ، لیث بن سعد اور ابو ضمرہ بھی شامل ہیں[2]۔ یحییٰ بن سعید عمر میں حضرت ربیعہ سے بڑے تھے۔ لیکن بقول متنبی۔

وشیخ فی الشباب ولیس شیخاً   یسمّٰی کل من بلغ المشیبا

حضرتِ ربیعہ پھر بھی یحییٰ کے شیخ تھے۔ اور وہ اگرچہ خود بھی اس پایہ کے عالم اور بزرگ تھے کہ حضرت ربیعہ کی غیر موجودگی میں بہترین حدیثیں لوگوں کو سناتے اور اُن کا درس دیتے تھے لیکن شیخ کی عظمت و جلالتِ شان کا یہ عالم تھا کہ اثناء درس میں آجاتے تو یحییٰ رُک جاتے تھے[3]

یحییٰ بن سعید تو پھر بھی تلمیذ تھے۔ حضرت ربیعہ کی امامت و وسعتِ نظر کا اعتراف خود اُن کے اساتذہ کو بھی تھا۔ چنانچہ قاسم بن محمد جو ان کے شیخ ہیں، ان کے پاس اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں فتویٰ لینے آتا اور انہیں اس کا جواب قرآن مجید یا سُنت نبوی میں معلوم ہوتا تھا تو وہ اُسے فتویٰ دے دیتے تھے۔ ورنہ فرماتے کہ تم ربیعہ یا سالم کے پاس جاؤ[4]

سیرتِ شیخ | ان علمی کمالات کے ساتھ وہ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی ایک بلند پایہ بزرگ تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸ [2] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۵۸ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۳ [4] ایضاً

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ وہ سلاطین وامراء کے عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی خرچ کرنے میں بڑے فیاض تھے۔ اپنے ضرورتمند احباب، احباب کی اولاد اور شاگردوں کی ضرورتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ابن وہب کا بیان ہے کہ ربیعہ بڑے سخی تھے۔ اُنھوں نے اپنے بھائیوں پر چالیس ہزار دینار خرچ کیے[1]۔ ابن زید کہتے ہیں " میں نے مدینہ میں ربیعہ سے بڑا کوئی سخی نہیں دیکھا۔ ان کا مال جو کچھ ان کے پاس تھا، ان کے دوستوں، دوستوں کے بچوں یا سائلیں کے لئے وقف رہتا تھا[2]۔ وہ جس طرح اپنا مال دوستوں کے لیئے وقف رکھتے تھے اُسی طرح ضرورت کے وقت ان کو دوستوں سے روپیہ طلب کرنے میں بھی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُن کے متعلقین نے کہا "آپ نے اپنا سب مال تو خرچ کر دیا۔ اب دوستوں سے طلب کرتے پھرتے ہیں آپ کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس سے آپ کی شان میں بٹہ لگتا ہے" آپ نے فرمایا "میرا اور میرے دوستوں کا معاملہ ایک ہی ہے میں نہیں سمجھتا کہ اُن میں سے کوئی مجھ کو میری علمی وجاہت کی وجہ سے دیتا ہے[3]۔

قوت گویائی حضرت ربیعہ کلام بہت کرتے تھے۔ اُن کا مقولہ تھا کہ "خاموش آدمی خوابیدہ اور گونگے کے درمیان ہوتا ہے[4]" اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک دن حضرت ربیعہ اپنی مجلس میں تقریر کر رہے تھے کہ اتفاق سے ادھر ایک اعرابی آنکلا، اور وہاں کھڑا ہو کر دیر تک آپ کی تقریر خاموشی کے ساتھ سنتا رہا، حضرت ربیعہ نے خیال کیا کہ اعرابی اُن کی طلاقت لسانی اور فصاحت بیانی سے متاثر ہو گیا ہے، آپ نے اُس سے دریافت کیا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۹ [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۴ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۴
[4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۹۴۔

نے اعرابی! تم لوگوں کے نزدیک بلاغت کی کیا تعریف ہے؟" اعرابی بولا "مختصر لفظوں کے ساتھ معنیٰ صحیح صحیح ادا کرنا" پھر پوچھا "اور عجز عن الکلام کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا "وہ جس میں تم مبتلا ہو" حضرت ربیعہ کو یہ سُن کر بڑی ندامت ہوئی[1]

وفات: حضرتِ ربیعہ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۳۰ھ بتاتا ہے۔ اور کوئی ۱۳۶ھ لیکن موخر الذکر روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وقول من قال سنۃ ست وثلاثین ومائۃ اصح" علامہ ابن خلکان بھی اسی کو صحیح اور مورخین کا متفق علیہ بتاتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے حضرت ربیعہ ہاشمیہ میں دفن کیے گئے تھے جس کو انبار میں سب سے پہلے خلیفۂ عباسی سفاح نے آباد کیا تھا۔ اور سفاح بروز جمعہ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۲ھ تخت نشین ہوا ہے۔ اس بنا پر اگر ربیعہ کی وفات ۱۳۰ھ میں تسلیم کی جائے تو پھر ہاشمیہ میں اُن کا دفن ہونا کوئی معنیٰ ہی نہیں رکھتا۔

محمد بن عجلانؒ

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، مدینہ کے رہنے والے۔ اور فاطمہ بنت الولید بن عتبہ بن ربیعہ کے غلام تھے، انہوں نے کم سنی میں بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔ اس لیے اُن کا شمار صغار تابعین میں ہے۔ ان کے والد کا نام عجلان تھا جن کی نسبت خود محمد بن عجلان کا ایک عجیب بیان یہ ہے کہ وہ شکم مادر میں تین سال رہے تھے[2]

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۸۳۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶۔

علم وفضل | علم وفضل اور زہد واتقاء کے لحاظ سے تابعین میں اُن کو مرتبہ بلند حاصل تھا۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام القدوۃ" اور پھر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں "وہ مفتی، فقیہ، عالم، عامل ربانی، بلند مرتبت بزرگ تھے"[1]

امام نووی لکھتے ہیں "ابن عجلان امام، فقیہ اور عابد تھے"[2] ابن عماد الحنبلی کہتے ہیں "وہ عابد، پابند شریعت اور صداقت شعار تھے"[3] ابن عجلان سراپا پیکر علم وفضل تھے۔ عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ "کوئی شخص ابن عجلان سے بڑھ کر علماء سے مشابہ نہیں تھا۔ میں اُن کو تمام ارباب علم میں یاقوت سے تشبیہ دیتا تھا"[4]

حدیث | حدیث میں اُن کو مرتبہ کمال حاصل تھا۔ حافظ ابن حجر واقدی کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں "ابن عجلان ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ابو زرعہ، ابو حاتم، امام نسائی، عجلی، یحییٰ بن معین، اور ابن حبان سب اُن کو ثقہ تسلیم کرتے ہیں۔ ابن عیینہ سے کسی نے اُن کی نسبت دریافت کیا تو کہا "کان ثقۃً عالماً"[5]

انہوں نے صحابہ کرام میں انس بن مالک اور ابو الطفیل سے اور تابعین میں اپنے والد واجد، عکرمہ، نافع، سعید المقبری، اور رجاء بن حیوۃ، اعرج، اور ابو الزناد، زید بن اسلم وغیرہ سے سماعِ حدیث کیا تھا۔

درس | خاص مسجد نبوی میں درس دیتے تھے جس میں کثرت سے لوگ شریک ہوتے تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۷ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۲۴
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶۔ [5] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۴۲۔

حافظ ذہبی کا بیان ہے لہ حلقۃ کبیرۃ فی مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

ان کے خوشہ چینوں میں امت کے ائمۂ کبار شامل تھے۔ مثلاً عبیداللہ بن عمر، منصور بن المعتمر، مالک بن انس، لیث بن سعد، ثوری، ابن عیینہ، حیوٰۃ بن شریح، شعبہ، قطان، عبداللہ بن ادریس، اور ولید بن مسلم۔[2]

فقہ | فقہ میں بھی اُن کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ ابن سعد، حافظ ذہبی۔ اور امام نووی اُن کو فقیہ لکھتے ہیں۔ فتویٰ بھی دیتے تھے وکان یفتی۔[3]

عبادت اور زہد | ان علمی کمالات کے ساتھ زہد و ورع بھی اُن کی قبائے کمال کا تکمۂ زریں تھا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں " وکان احد العلماء العاملین" حافظ ذہبی انہیں "عالم ربانی" لکھتے ہیں۔ ابن سعد انہیں "عابداً ناسکاً" کہتے ہیں۔

جلالتِ شان | علمی و عملی کمالات کے باعث لوگ اُن کو "مدینہ منورہ کا حسن بصری" سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی بات پر ناراض ہو کر گورنر مدینہ جعفر بن سلیمان نے اُن کو کوڑوں کی سزا دینے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اُس سے کہا " خدا تمہاری اصلاح کرے۔ اگر حسن بصری ایسا کرتے تو کیا تم اُن کو بھی کوڑے لگواتے؟" اُس نے کہا "نہیں" لوگوں نے کہا " تو پس ابنِ عجلان بھی مدینہ کے حسن ہیں" یہ سُن کر جعفر اپنے ارادہ سے باز آگیا اور انہیں معاف کر دیا۔

وفات | بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اسکندریہ پہنچ کر کسی عورت سے نکاح کر لیا تھا لیکن وہاں موافقت نہ ہو سکی، آپ پھر مدینہ واپس آ گئے جہاں ۱۴۸ھ میں وفات پائی رحمہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۶۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۰۔ [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۴۲

اللہ تعالیٰ لہ

محمد بن اسحاق

نام و نسب | محمد نام ابو عبد اللہ کنیت، والد کا نام اسحاق تھا ان کے دادا یسار عین التمر کے اسیران جنگ میں سے تھے۔ اسی بنا پر ابن اسحاق بھی قیس بن مخرمہ بن مطلب کے غلام لکھے جاتے ہیں۔

علم و فضل | علم و فضل کے لحاظ سے ان کا شمار ممتاز تابعین میں ہے، علی الخصوص فن مغازی اور سیر میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں "وہ علم کے سمندر تھے۔ نہایت ذکی، قوی الحافظہ، علم کے پرشوق طالب، عالم اخبار (روایات) ماہر انساب، اور علامۂ روزگار[2]۔

حدیث | حدیث میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ شعبہ ان کو "امیر المومنین فی الحدیث" اور "امیر المحدثین" کہتے ہیں۔ یزید بن ہارون کہتے تھے "اگر میرے بس میں ہوتا تو میں محمد بن اسحاق کو محدثین کا امیر بنا دیتا[3]"۔ علی بن المدینی کا بیان ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا دار و مدار چھ اشخاص پر رہ گیا ہے۔ آپ نے ان سب کے نام لیے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ ان چھ شخصوں کا علم بارہ علماء کی طرف منتقل ہو گیا۔ انہی میں سے ایک محمد بن اسحاق ہیں[4]"۔ ابو معاویہ کہتے ہیں کہ "ابن اسحاق ان لوگوں میں سے تھے جو سب سے زیادہ قوی الحافظہ ہیں"۔ ابراہیم الحربی سے کسی نے پوچھا "محمد بن اسحاق کے بارہ میں کسی نے کلام کیا ہے؟" بولے "ان کی نسبت

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۷ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۴

[4] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۱۹

سفیان بن عیینہ تو یہ کہتے تھے کہ جب تک یہ لڑکا (محمد بن اسحاق) زندہ رہیگا مدینہ میں علم باقی رہیگا
علی بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے خود حضرت سفیان کی زبانی سُنا ہے، فرماتے تھے "میں
نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو محمد بن اسحاق کو متہم کرتا ہو" شعبہ ایک دوسرے مقولہ میں
فرماتے ہیں" اگر حدیث میں کسی کو سردار بنایا جائے تو محمد بن اسحاق اس کے مستحق ہیں"[1]

امام زہری کا اعتماد

امام زہری اُن کے اُستاد تھے لیکن وہ خود محمد بن اسحاق کی وسعت علم کی قدر
کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام زہری کسی سفر میں جانے لگے۔ طلبائے حدیث نے اُن کی دُور
تک مشایعت کی تو آپ نے فرمایا "تم میرے ساتھ کیوں جا رہے ہو۔ میں نے تم میں ایک
غلام احول (محمد بن اسحاق) کو اپنا قائم مقام بنا کر چھوڑ دیا ہے"۔ ساجی کا بیان ہے کہ امام
زہری کے اس ارشاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے طلبا، کو امام زہری کی کسی روایت میں کوئی شک
ہوتا تھا تو وہ محمد بن اسحاق سے ہی اُن کے حافظہ پر اعتماد کی وجہ سے رفع شک کرتے تھے"[2]
سفیان بن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام زہری کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں
محمد بن اسحاق آ گئے۔ امام زہری نے اُن سے فرمایا "دیر کہاں کر دی؟" محمد بن اسحاق
بولے "کیا آپ کے ہاں دربان کے ہوتے ہوئے کوئی آسانی سے آ بھی سکتا ہے؟" امام زہری
نے یہ سُنکر فوراً دربان کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ "محمد بن اسحاق جس وقت بھی آئیں اُن کو اندر آنے
سے نہ روکا جائے"۔ امام زہری کو محمد بن اسحاق پر جو اعتماد تھا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا
ہے کہ وہ فرماتے تھے "جب تک محمد بن اسحاق مدینہ کے لوگوں میں رہینگے مدینہ میں علم بہت

---

[1] دیکھو ان مقولوں کے لیے بغدادی ج ۱ ص ۲۲۷ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۲۔

وافر رہیگا"۔[1]

شیوخ انہوں نے حدیث میں قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، ابان بن عثمان، محمد بن علی بن الحسین، امام زہری، نافع مولی عبد اللہ بن عمر، ابوسلمہ بن عبد الرحمن، ابن المنکدر، مکحول، ابراہیم بن عقبہ، حمید الطویل، سالم ابو النضر، ابو الزناد، عطار بن ابی رباح، عکرمہ، یزید بن ابی حبیب، یزید بن رومان وغیرہم رحمہم اللہ سے سماعت کی تھی۔ حضرت انس بن مالک اور سعید بن المسیب کو بچپن میں دیکھا تھا لیکن سماعت نہیں کر سکے۔ امام زہری سے خصوصیت تھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔[2]

تلامذہ جن لوگوں نے اُن سے استفادہ کیا اور اُن کی حدیثیں قبول کیں اُن میں چند اکابر علم و دین کے اسمار گرامی یہ ہیں حضرت سفیان، شعبہ ابن عیینہ، حماد بن یزید، حماد بن سلمہ، ابن المبارک، ابراہیم بن سعد۔

علم سیر و مغازی اُن کا خاص فن سیر و مغازی تھا جس میں اُن کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں" وہ علم کے ظرف تھے، مغازی اور سیر کے علم میں بڑے ماہر (حبر) تھے" پھر اُن کے متعلق چند اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔" جس چیز پر عمل مقرر ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ ابن اسحاق مغازی اور ایام نبویہ کے بیان میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ بعض اوقات ایسی نرالی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں جن میں وہ منفرد ہوتے ہیں"[3] امام زہری سے کسی نے پوچھا "آپ محمد ابن اسحاق کی مغازی کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟" بولے " وہ توان روایات

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۱۹ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۸ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۳، ۱۶۴

کے سب سے بڑے عالم ہیں[1]، امام شافعی فرماتے تھے "جو شخص مغازی میں مہارت پیدا کرنی چاہتا ہے اُس کو بجز اس کے چارہ نہیں کہ محمد بن اسحاق پر اعتماد کرے[2]"۔

اُن کی روایاتِ مغازی نے اس قدر شہرت پائی تھی کہ بادشاہوں کی محفلوں تک میں انہی کا ذکر ہوتا تھا۔ چنانچہ ابن عدی کا بیان ہے کہ "اگر محمد بن اسحاق کے لیے کوئی اور فضل نہ ہوتا اور صرف یہی ایک بات ہوتی کہ انہوں نے بادشاہوں کو بے معنی کتابوں کے مطالعہ سے منحرف کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مغازی اور آپ کی بعثت اور ابتدائے آفرینش کے ذکرو اذکار کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ تو یہ بھی ایسی فضیلت ہے جس کی جانب انہوں نے سبقت کی ہے۔ اس میں شک نہیں اس کے بعد بھی اُن کے طرز پر بعض لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ اُن کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے۔ اُن کی حدیثیں بہت مشہور ہوئیں۔ مگر میں نے اُن میں کوئی ایسی حدیث نہیں پائی جس کی وجہ سے اُن پر ضعف کا قطعی حکم لگا دیا جائے، ہاں وہ بسا اوقات خطا بھی کر جاتے ہیں، یا کہیں کہیں انہیں کسی چیز میں شک ہو جاتا ہے لیکن اس طرح کی خطائیں تو دوسرے بھی کرتے ہیں اس سے اُن کی شان میں کوئی خاص نقص لازم نہیں آتا[3]۔"

جامعیت وہ صرف علم حدیث و مغازی کے ہی بلند مرتبت عالم نہیں تھے بلکہ ہر قسم کے علم و فن سے دلچسپی رکھتے اور اُس میں گفتگو کرتے تھے[4]۔ عبداللہ بن فائد بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن اسحاق کے پاس بیٹھتے تھے وہ جب کسی فن میں کلام شروع کرتے تو اسی مجلس میں ختم کرکے اُٹھتے تھے[5]۔ علامہ

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۰ [2] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۱۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴، ۴۵ [4] ایضاً ص ۴۴

خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وہ سیر و مغازی کے عالم تاریخ عالم سے باخبر، آغاز آفرینش کی تاریخ سے واقف۔ اور انبیاء کرام کے قصوں سے آگاہ تھے۔ اور اُن سے ائمۂ علماء نے روایت کی ہے"[1]

ثقاہت وسعت علم اور ثقاہت خصوصاً نقاد حدیث کی نگاہ میں دو مختلف چیزیں ہیں جہاں تک وسعتِ علم کا تعلق ہے، قریب قریب اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد بن اسحاق علم کے ناپیدا کنار سمندر تھے۔ اور خصوصاً اُن کو سیر و مغازی کے علم میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا حدیث کی کثرت روایات کا یہ عالم تھا کہ ابراہیم بن سعد کے پاس جو صرف احکام سے متعلق ابن اسحاق کی روایت کی ہوئی حدیثیں موجود تھیں اُن کی تعداد سترہ ہزار تھی[2] لیکن چند وجوہ سے اُن کی ثقاہت میں بڑا اختلاف ہے، ایک طرف سفیان بن عیینہ کا بیان یہ ہے کہ میں کچھ اوپر ستر سال تک محمد بن اسحاق کا ہمنشین رہا، اس مدت میں اہل مدینہ میں سے کوئی ایسا شخص نہیں پایا جو اُن کو متہم کرتا ہو، یا اُن کی شان میں کوئی ایسی ویسی بات کہتا ہو[3] مفضل الغلابی نے یحییٰ بن معین سے اُن کی نسبت دریافت کیا تو اُنھوں نے فرمایا "کان ثقۃ وکان حسن الحدیث"[4] اسی طرح اور بھی بعض بڑے بڑے ائمۂ حدیث کے اقوال ہیں جن سے اُن کی ثقاہت کا ثبوت ملتا ہے لیکن ان کے برعکس دوسری جانب امام مالک اور ہشام بن عروہ نے ان پر سخت جرح کی ہے۔ اور اُن کو بالکل ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۱۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱

[3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱ [4] ایضاً ص ۳۹۔

امام مالک اور ہشام بن عروہ کی شدید جرح کی وجہ

اس قدر سخت جرح کی وجہ کیا ہے؟ کیا وہ حقیقۃً ناقابلِ اعتبار تھے اور یا اس جرح کی وجہ کچھ خارجی اسباب ہیں؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ محمد بن اسحاق امام مالک کی روایات پر زیادہ اعتنا نہیں کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ کسی نے اُن کے سامنے امام ہمام کی چند روایتیں نقل کیں تو محمد بن اسحاق انھیں سُن کر ہنس پڑے اور پھر چپ ہو کر رہ گئے۔ ایک مرتبہ لوگوں سے کہا تم مجھ کو مالک کی حدیثیں سُنایا کرو۔ میں اُن کے مرض کا طبیب ہوں۔ امام مالک نے یہ سُنا تو فرمایا "اچھا! ابن اسحاق یہ کہتا ہے کہ میں مالک کی حدیثوں کا طبیب (بیطار) ہوں! ہم نے تو اُس کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا ہے[1]۔ اسی طرح ہشام بن عروہ کی جرح کا سبب بھی بعض لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ محمد بن اسحاق ہشام کی بیوی فاطمہ بنت المنذر سے احادیث کی روایت کرتے تھے۔ ہشام نے یہ سُنا تو سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے "ابن اسحٰق بالکل جھوٹ کہتا ہے، میری بیوی کو تو اُس کی نو برس کی عمر سے جب سے میں نے اس سے شادی کی ہے آج تک کسی مخلوق نے دیکھا ہی نہیں[2]۔ لیکن ادنیٰ تامل سے ان دونوں توجیہات کی رکاکت ظاہر ہو جاتی ہے۔ پہلی توجیہ کے غلط ہونے کی دلیل تو یہ ہے کہ اگر بالفرض محمد بن اسحاق کی نسبت یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو امام مالک کی احادیث کا ڈاکٹر کہتے تھے تب بھی امام مالک ایسے بلند مرتبہ اور مسلم الثبوت امامِ عالیمقام سے یہ امر بہت مستبعد ہے کہ وہ محض اپنے ذاتی انتقام کی وجہ سے ایک ثقہ کو کذاب اور دجال کہہ بیٹھیں۔ اب رہی ہشام کی جرح کی وجہ، تو اُس کی لغویت

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۳ [2] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۲

اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ اُس عہد میں مستورات سے احادیث کے روایت کرنے کا عام دستور تھا۔ اُم المومنین حضرت عائشہ جو جملہ "وقرن فی بیوتکن" کی پردہ نشین خواتین میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہیں، خود اُن سے کثرت سے روایتیں مروی ہیں۔ اس بنا پر ہشام کا محض یہ سُن کر کہ محمد بن اسحاق اُن کی بیوی سے روایت کرتے ہیں۔ ناراض ہو کر اُن کو کذاب کہنا قطعاً غیر معقول بات ہے۔ پھر اُس پر طرّہ یہ ہے کہ ہشام نے ابن اسحاق پر جو اعتراض کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے میری بیوی کو دیکھا کس طرح؟ اُس کو تو نو برس کی عمر سے اب تک کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی عورت سے کوئی روایت نقل کرنا اُس کے دیکھنے کو مستلزم نہیں ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہشام جیسا شخص اتنی ذرا سی بات کو نہ سمجھ سکے۔ اور وہ محض اپنی بیوی سے روایت کا ذکر سنتے ہی لعن طعن شروع کر دے، اور تہمت طرازی کرنے لگے۔ اور وہ بھی کسی معمولی آدمی پر نہیں بلکہ محمد بن اسحاق ایسے سن رسیدہ صاحب علم و فضل پر۔

اِن دلائل کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ دونوں توجیہیں بالکل غلط ہیں کہ ان سے محمد بن اسحاق کی ثقاہت ہی نہیں بلکہ خود امام مالک اور ہشام بن عروہ کی ثقاہت پر بھی حرف آتا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ خود محمد بن اسحاق میں جلالتِ علم کے باوصف بعض ایسی کوتاہیاں تھیں جن کے باعث امام مالک نے جو علامہ خطیب بغدادی کے قول کے مطابق تنقید و تعدیل میں اتنے سخت تھے کہ اربابِ صلاح و دیانت اور اصحاب ثقاہت و امانت کی شان میں بھی بعض مرتبہ نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے تھے[۱] اُن پر شدید جرح کر دی۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے

[۱] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۳۔

کہ بعض لوگوں نے خواہ محمد بن اسحاق کو کیسا ہی قوی الحافظہ مانا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود انہیں اپنی قوتِ حفظ پر پورا اعتماد نہیں تھا۔ چنانچہ اُن کا معمول تھا کہ کسی شخص کے پاس پانچ یا اس سے زیادہ حدیثیں ہوتی تھیں تو وہ اُسے اپنی حدیث سُنا کر فرماتے تھے "تم اس کو میری خاطر اپنے پاس ودیعت رکھ لو ممکن ہے میں بھول جاؤں، تو تم مجھ کو یاد دلا سکو گے"[1] اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مغازی کی روایات قبول کرنے میں نہایت نرم واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے اُن یہودیوں کی روایتوں کو بھی قبول کر لیا جو بعد میں اگرچہ مسلمان ہو گئے تھے لیکن یہودیت کے زمانہ میں اُنہوں نے غزوۂ خیبر وغیرہ کے جو واقعات جس طرح سُنے تھے اُسی طرح اُن کو بے تکلف نقل کرتے تھے[2] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی یہ سہل انگاری صرف مغازی کے معاملہ میں ہی نہیں تھی۔ بلکہ احادیث میں بھی وہ بعض اوقات اسی طرح کا تساہل کر جاتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کے سامنے کسی نے اُن کا ذکر کیا تو فرمایا "محمد بن اسحاق ایک شخص تھے جو احادیث کے بڑے شوقین تھے، انہیں لوگوں کی کتابیں ملتی تھیں تو اپنی کتاب میں درج کر لیتے تھے"۔ امام احمد سے ایک موقع پر کسی شخص نے پوچھا "اگر ابن اسحاق کسی روایت میں منفرد ہوں تو آپ اسے قبول کریں گے؟" فرمایا "نہیں! خدا کی قسم میں نے اُن کو دیکھا ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو ایک جماعت سے نقل کرتے تھے اور پھر اس کے اور اُس کے کلام میں کوئی فصل نہیں کرتے تھے"[3]

تیسری وجہ یہ ہے کہ اُن پر قدری ہونے کا شبہ تھا۔ اور بعض لوگوں کے اقوال سے اس شبہ کی تقویت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ دحیم سے کسی شخص نے امام مالک کا قول اُن کی نسبت نقل

[1] خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۰ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۵ [3] ایضاً ص ۴۳۔

کہا تو انہوں نے کہا" یہ حدیث کی نسبت نہیں ہے۔ اور وہ مغازی کے بارہ میں ہے بھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک وہ قدریہ عقائد سے متہم تھے[1] دحیم نے تو صرف اتہام کا ہی ذکر کیا ہے۔ ہارون بن معروف صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ وہ قدری تھے[2]

مکی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ محمد بن اسحاق نے صفاتِ باری سے متعلق ایسی احادیث بیان کیں کہ مجھ کو اُن سے نفرت ہو گئی اور میں پھر اُن کے پاس کبھی نہیں گیا۔

ابن غسان کہتے ہیں "میں ۱۹۳ھ میں مدینہ طیبہ میں تھا، وہاں یزید بن ہارون حدیث کا درس دیتے تھے۔ میں بھی اُس میں شریک ہوتا تھا۔ اور اس حلقہ میں خاص اہلِ مدینہ کی بھی ایک جماعت ہوتی تھی۔ ایک دن اُنہوں نے درس دیتے دیتے محمد بن اسحاق کی چند روایتیں بیان کرنی شروع کر دیں۔ اہلِ مدینہ یہ سُنتے ہی کہنے لگے "بس حضرت! اُن کی حدیثیں رہنے دیجیے، اُنہیں تو ہم خوب پہچانتے ہیں" یزید بن ہارون نے ہر چند ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ ایک نہ مانے اور بالآخر انہیں درس ختم کرنا پڑا[3]" پھر اس کے علاوہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے کبھی کبھی ایسے افعال بھی سرزد ہو جاتے تھے جن کی وجہ سے محدثین اور خصوصاً نقادِ حدیث کی نظر میں اُن کو پایۂ ثقاہت و حجیت حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً ابن ابی عدی کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق مرغوں سے کھیلتے تھے[4] ظاہر ہے یہ باتیں ثقاہت کے سخت منافی ہیں۔

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۴ [2] ایضاً ص ۲۲۵ [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۶
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۳۔

ان وجوہ کی بنا پر تنہا امام مالک اور ہشام بن عروہ ہی نہیں بلکہ اور بھی متعدد ائمۂ حدیث نے اُن کو حجت ماننے سے انکار کیا ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں "وہ قوی نہیں ہیں"۔ دارقطنی کا قول ہے "اُن سے احتجاج نہیں ہو سکتا"[1] محمد بن عبداللہ بن نمیر کہتے ہیں "محمد بن اسحاق کی مصیبت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات مجہول لوگوں کی روایت سے باطل حدیثیں نقل کر دیتے ہیں"[2]۔ ابو عبداللہ کا بیان ہے "محمد بن اسحاق بغداد آئے تو وہ ہر کس و ناکس سے روایت کر دیتے تھے، اور ثقہ، غیر ثقہ میں امتیاز نہیں کرتے تھے"۔

میں نے اپنے استاذ حضرۃ العلام مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ سے صحیح بخاری کے درس میں یہ بھی سُنا ہے کہ دراصل اخیر عمر میں تقاضائے پیری سے محمد بن اسحاق کا حافظہ بہت کمزور ہو گیا تھا، اور اس پر طرفہ یہ ہوا کہ اُن کا مجموعۂ احادیث جس سے وہ روایتیں نقل کرتے تھے کسی حادثہ سے نذرِ آتش ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ روایتیں پھر بھی بیان کرتے اور اُن میں زیادہ احتیاط نہیں برتتے تھے۔ اس بنا پر صحیح روایتیں غیر صحیح روایتوں سے اس طرح خلط ملط ہو گئیں کہ اُن میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ واللہ اعلم

اس تقریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق کی جلالتِ شان اور وسعتِ علم مسلّم، لیکن محدثین کے خاص معیار کے مطابق اُن کی منفرد روایتوں کو لائقِ احتجاج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ حافظ ذہبی کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں "محمد بن اسحاق علم کے ظرف تھے مغازی اور سیر کا علم بہت وسیع رکھتے تھے لیکن وہ ان چیزوں میں یقینی طور پر حجت نہیں۔ اُن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۴ [2] تاریخ بغدادی ج ۱ ص ۲۲۷۔

کی حدیث پایۂ صحت سے فروتر ہے۔ اگرچہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے سچے اور پسندیدہ ہیں[1] " پھر آگے چل کر فرماتے ہیں" وہ حلال وحرام میں حجت نہیں۔ مگر ہاں ایسے کچھ زیادہ کمزور بھی نہیں ہیں۔ اُن سے فی الجملہ سند لیجا سکتی ہے[2]"۔

تصانیف | اُنھوں نے سیرت اور تاریخ پر کئی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ فہرست ابن ندیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مشہور تصنیف کتاب المغازی کے علاوہ ایک کتاب کتاب الخلفاء اور ایک کتاب السیرۃ والمبتداء کے نام سے بھی تھی[3]۔

ان کی مشہور کتاب سیرت ابن اسحاق ہے۔ ابن ہشام میں کثرت سے اسی کتاب سے روایتیں اخذ کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ ایک مرتبہ محمد بن اسحاق خلیفۂ عباسی مہدی کے پاس گئے تو اُس وقت اُس کے پاس اُس کا بیٹا موجود تھا۔ مہدی نے کہا " اے ابن اسحاق! آپ اسے پہچانتے ہیں؟" بولے "کیوں نہیں؟" مہدی نے کہا " تو اچھا! آپ اس لڑکے کے لیے ایک ایسی کتاب لکھیے جس میں حضرتِ آدم کی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام حالات وواقعات مذکور ہوں" آپ نے اس فرمائش کی تعمیل میں یہ کتاب لکھ کر پیش کی تو مہدی نے کہا " یہ تو بہت طویل ہوگئی ہے۔ اسے مختصر کر دیجیے" چنانچہ اُنھوں نے اس کو مختصر کر دیا۔ اور جو مفصل کتاب تھی وہ خزانۂ شاہی میں محفوظ کر دی گئی۔ علامہ بغدادی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "راوی نے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ ابن اسحاق بجائے مہدی کے منصور کے پاس گئے ہونگے، اور اُس وقت

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۶۳ [2] ایضاً ص ۱۶۴ [3] فہرست ابن ندیم ص ۱۳۶

اُس کے پاس مہدی موجود ہوگا۔ پھر منصور کی فرمائش پر اُنہوں نے یہ کتاب مہدی کے لیے لکھی ہوگی۔[1]

وفات | پہلے وہ مدینہ طیبہ میں رہتے تھے پھر کوفہ، جزیرہ اور رے وغیرہ مختلف مقامات میں پھرتے رہے، آخر میں بغداد میں مقیم ہوگئے اور یہیں ۱۵۱ھ یا ۱۵۲ھ میں وفات پائی، اور مقبرۂ خیزران میں دفن ہوئے۔

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۲۲۱۔

اتباعِ تابعینؒ وغیرہم

عبداللہ بن مُبارک

نام و نسب | ابوعبدالرحمٰن کنیت عبداللہ نام والد کا نام مبارک تھا جو بنو حنظلہ کے ایک شخص کے غلام تھے
مبارک اپنے آقا کے نہایت مطیع و فرماں بردار غلام اور پرہیزگار و متقی تھے، یہ باغ میں کام کرتے تھے
ایک مرتبہ ان کے آقا نے ان سے ایک ترش انار طلب کیا تو انھوں نے شیریں انار لیجا کر پیش کر دیا
آقا کو بڑا غصہ آیا۔ اور کہا "تم شیریں اور ترش میں بھی امتیاز نہیں کرتے" بولے "ہاں" اس نے وجہ
پوچھی تو کہا "آپ نے مجھ کو ترش انار کھانے کی اجازت نہیں دی ہے" آقا نے اِس بات کی
تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ مبارک نے جو کچھ کہا تھا درست تھا اس شخص کو مبارک کی اس درجہ
دیانتداری پر سخت حیرت ہوئی۔ اور اُسی دن سے اُس کو ان کے ساتھ ... گرویدگی پیدا ہو گئی[1]
اس کے ساتھ ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ مبارک کے آقا نے اپنی لڑکی کی شادی کرنی چاہی تو اُن
سے دریافت کیا "مبارک! میں اپنی اس بیٹی کی شادی کس سے کروں؟" انھوں نے کہا "عہدِ
جاہلیت میں لوگ حسب کی تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کو داماد بنانے کے لیے مالدار کی جستجو ہوتی
تھی، اور عیسائی جمال کو اہمیت دیتے تھے لیکن اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۸۔

دیندار ہونا شرطِ شادی سمجھا جاتا ہے" مبارک کے آقا کو ان کا یہ جواب بہت پسند آیا اور اس نے اپنی بیوی سے جا کر کہا "میری بیٹی کا شوہر بننے کے لیے مبارک سے زیادہ مناسب کوئی اور شخص نہیں ہے۔ آخر کار میاں بیوی دونوں راضی ہو گئے اور اس لڑکی کی شادی مبارک سے کر دی گئی[1]۔

ولادت حضرت عبداللہ اسی بیوی کے بطن سے مرو میں ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور اس مرو کی نسبت سے ہی مروزی کہلائے۔

تعلیم و تربیت ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہونے کے باعث حضرت عبداللہ سے آثار کمال و ترقی بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ انہیں طلب علم کا اتنا شوق تھا کہ کم عمری میں بھی اس مقصد کے لیے سفر کرنے سے باز نہیں آتے تھے[2]۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے "ابن مبارک کے زمانہ میں ان سے زیادہ طلب علم کرنے والا کوئی نہیں تھا"۔ ابو اسامہ شہادت دیتے ہیں "میں نے دنیا میں عبداللہ بن مبارک سے زیادہ طلب علم کا جذبہ رکھنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا[3]" انہیں طلب علم کے شوق میں اپنی حیثیت کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی ہر چھوٹے اور بڑے سے علم حاصل کرتے تھے[4]۔

علم و فضل اس شوق و ذوق اور محنت و جستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ہر علم و فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ بڑے بڑے ائمۂ عصر ان کی جامعیت علوم و فنون اور مہارت کا اعتراف کرتے تھے جا فظ

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۳ [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۴

[4] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۶۔

ذہبی فرماتے ہیں "ابن مبارک امام حافظ، علامہ شیخ الاسلام فخر المجاہدین قدوۃ للزاہدین تھے[1]"، عجلی انہیں جامع للعلم بتاتے ہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں

كان فيه خصال لم تجتمع في احد من اهل العلم في زمانه في الارض كلها[2]۔	ابن مبارک میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ اُن کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہیں ہوئے تھے۔

امام نووی فرماتے ہیں "عبداللہ بن مبارک کی امامت و جلالت پر سب کا اتفاق ہے وہ کل چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی تھی اور اُن کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی تھی[3]" علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "ابن مبارک نے علم طلب کیا، روایات کثیرہ بیان کیں، علم کے مختلف ابواب و انواع پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ زہد میں اور ترغیب جہاد میں اشعار کہے علم کثیر کی سماعت کی۔ وہ معتبر تھے، مقتدا، حجت اور کثیر الحدیث تھے[4]"

حدیث | حدیث اُن کا خاص فن تھا اس کے لیے اُنہوں نے شام، مصر، یمن، حجاز اور عراق کے طویل و دشوار سفر کیے، اور اُس زمانہ کے جلیل القدر ائمہ حدیث سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ان کے شیوخ کی فہرست بہت طویل ہے جس میں سے چند نام یہ ہیں۔

شیوخ | سلیمان التیمی، سلیمان الاعمش، حمید الطویل، عبداللہ بن عون، یحییٰ بن سعید الانصاری، موسیٰ بن عقبہ، ابن جریج، مالک بن انس، سفیان الثوری، شعبہ، اوزاعی، ابو عوانہ، زہیر بن معاویہ[5]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۵
[4] ایضاً ص ۲۸۶ [5] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۲۔

مہارتِ فن | اِن اکابرِ اُمت کے فیضِ التفات اور خود اپنے ذاتی ذوق و شوق کے باعث عبداللہ ابن مبارک حدیث کے دریائے بیکراں بن گئے۔ اُن کی مہارت و امامت کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی اور بعض وہ امام جن سے سماع حدیث کا اشتیاق ابن مبارک رکھتے تھے خود وہ آپ کی حدیثیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ احمد بن سنان کا بیان ہے "عبداللہ بن مبارک پہلی مرتبہ حماد بن زید کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنہوں نے پوچھا "آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" بولے "خراسان سے" پوچھا "خراسان کے کس شہر سے؟" جواب دیا "مرو سے" پھر دریافت کیا "وہاں ایک شخص ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے۔ آپ انہیں بھی جانتے ہیں؟" کہا "ہاں جانتا ہوں" پوچھا "وہ کس طرح ہیں؟" بولے "ابن مبارک ہی تو اس وقت آپ سے خطاب کر رہا ہے۔" حماد بن زید یہ سُن کر بے تاب ہو گئے۔ ان کو سلام کیا اور مرحبا کہا۔[1]

ابن مہدی کہتے تھے "ائمہ چار ہی ہیں امام مالک، ثوری، حماد بن زید۔ اور ابن مبارک" شعیب بن حرب کا بیان ہے "ابن مبارک جیسا کوئی شخص نہیں تھا" شعبہ کا بیان ہے "ہمارے پاس ابن مبارک ایسا بزرگ کوئی نہیں آیا" ابو اُسامہ انہیں "امیر المومنین فی الحدیث" بتاتے ہیں۔ شعیب بن حرب نے ایک مرتبہ کہا "میں نے ہرچند یہ چاہا کہ سال میں تین دن کے لیے ابن مبارک جیسا بن جاؤں لیکن نہ بن سکا۔"[2]

ایک مرتبہ یحییٰ بن معین کے سامنے کسی نے ابن مبارک کا ذکر کیا تو فرمایا "سید من سادات المسلمین" فضیل کہتے ہیں "ربِ کعبہ کی قسم میری آنکھوں نے ابن مبارک جیسا کوئی

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴

شخص نہیں دیکھا۔[1]

اصحابِ حدیث میں اگر کبھی اختلاف ہوتا تو ابنِ مبارک کی طرف رجوع کرتے تھے
فضالۃ النّوسی کہتے ہیں "میں کوفہ کے علماءِ حدیث کے پاس اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ ان حضرات میں
اگر کسی حدیث سے متعلق نزاع ہوتا تھا تو یہ کہتے تھے "چلو حدیث کے اُس طبیب کے پاس
چلیں اور اس حدیث کے بارہ میں پوچھیں"۔ یہ طبیب عبداللہ بن مبارک تھے۔[2]

قوتِ حافظہ حدیث کے لیے قوتِ حافظہ شرطِ اولیں ہے۔ عبداللہ بن مبارک کو قدرت نے
اس نعمت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔ صخر حضرت عبداللہ بن مبارک کے ایک دوست
تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ میں اور ابن مبارک دونوں ایک مقام سے
گذر رہے تھے۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص خطبہ دے رہا ہے۔ خطبہ طویل تھا، ہم دونوں سُنتے
رہے۔ خطبہ کے ختم پر ابن مبارک بولے "مجھ کو یہ تمام خطبہ یاد ہوگیا۔ جماعت میں سے کسی شخص نے
یہ فقرہ سُن لیا۔ بولا "اچھا سُناؤ" ابنِ مبارک نے فوراً وہ خطبہ از اول تا آخر سُنا دیا۔[3]

احتیاط اس علم و فضل اور قوتِ حافظہ کے باوجود وہ محتاط اس قدر تھے کہ محض حافظہ سے
روایت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب دیکھ کر روایت کرتے تھے۔ کسی نے اُن سے پوچھا "ابو
عبدالرحمن! آپ احادیث یاد کرتے ہیں؟" یہ سُنتے ہی رنگ بدل گیا۔ اور فرمایا "میں نے
کبھی کوئی حدیث یاد نہیں کی ہے۔ میں کتاب اُٹھاتا ہوں اور اُس میں غور و خوض کرتا ہوں،
پھر جو روایت مجھ کو پسند ہوتی ہے وہ خود بخود دل میں بیٹھ جاتی ہے"۔[4] امام احمد بن حنبل فرماتے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵ [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۶ [3] ایضاً ص ۱۶۵، ۱۶۶ [4] ایضاً ص ۱۶۵

ہیں "ابن مبارک صاحب حدیث اور حافظ حدیث تھے اور کتاب سے حدیث بیان کرتے تھے"[1]

ابن معین کا بیان ہے کہ "وہ ثقہ اور ثبت فی الحدیث تھے ان کی کتاب میں جو احادیث درج تھیں اُن کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی"

ابن مبارک نے اپنی کتاب میں منتخب احادیث کا ایسا وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا کہ جو روایات اس میں نہیں ملتی تھی لوگ اُس سے مایوس ہو جاتے تھے۔[2]

حدیث سے شغف حدیث سے شغف کا یہ عالم تھا کہ علی بن الحسن بن شقیق کا بیان ہے "ایک مرتبہ سردی کی رات میں ابنِ مبارک (غالباً عشا کی نماز پڑھ کر) مسجد سے نکل رہے تھے کہ دروازہ پر مجھ سے ملاقات ہوئی اور ایک حدیث پر گفتگو ہونے لگی، اس گفتگو کو اتنی طوالت ہوئی کہ فجر کی نماز کا وقت آگیا اور موذن نے اذان دینی شروع کر دی"[3]

اسی شغف بالحدیث کی وجہ سے وہ باہر کم نکلتے تھے۔ زیادہ تر گھر میں ہی بیٹھے ہوئے احادیث وآثار کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا "آپ کو مکان میں تنہا بیٹھے رہنے سے وحشت نہیں ہوتی؟" فرمایا "بھلا وحشت مجھ کو کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ہوتا ہوں"[4]

نااہلوں سے اجتناب نااہل لوگوں کے سامنے حدیث روایت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ہاشمی شخص حضرت ابنِ مبارک کے پاس آیا اور روایت حدیث کی درخواست کی آپ نے انکار کر دیا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴ [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۵

[4] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۴۔

ہاشمی نے اپنے لازم سے کہا "چلو" اور سواری پر بیٹھ کر جانے لگا۔ ابنِ مبارک نے فوراً اٹھ کر رکاب تھام لی۔ ہاشمی بولا" ابنِ مبارک! آپ حدیث تو سُناتے نہیں اور یوں میری رکاب تھام رہے ہیں؟ فرمایا" میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے لیے اپنے بدن کو ذلیل کر دوں لیکن حدیث تمہاری خاطر ذلیل کرنا نہیں چاہتا"۔[1]

اسناد کا اہتمام | روایت کے معاملہ میں اسناد کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ مسیب بن واضح کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے ابنِ مبارک سے دریافت کیا کہ ہم کس سے علم حاصل کریں؟ فرمایا" ان لوگوں سے جنہوں نے علم محض اللہ کے لیے طلب کیا ہو اور اسناد کے معاملہ میں سخت ہوں۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ملاقات کسی ثقہ شخص سے ہوتی ہے لیکن اُس کی ملاقات غیر ثقہ سے ہوتی ہے اور وہ اُس سے روایت کر بیٹھتا ہے اور کبھی اُس کے برعکس ہوتا ہے۔ روایت کو چاہیے کہ ثقہ عن ثقہ مروی ہو"۔[2]

فقہ | فقہ میں بھی بڑا کمال رکھتے تھے۔ حافظ ابن حجر، علامہ ذہبی۔ امام نووی، ابن عماد حنبلی سب اُن کو فقیہ لکھتے ہیں۔ امام مالک فرماتے تھے" یہ ابن مبارک خراسان کے فقیہ ہیں"۔[3] ابن شماس کہتے تھے" میں نے سب سے بڑے فقیہ کو دیکھا ہے اور سب سے بڑے متقی کو بھی، اور سب سے زیادہ قوی حافظہ رکھنے والے کو بھی۔ سب سے بڑے فقیہ ابنِ مبارک ہیں"حضرت عبداللہ بن مبارک کی موجودگی میں بڑے بڑے معتمد علماء و فقہاء مسئلہ بتانے سے احتراز کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت سفیان ثوری سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے دریافت کیا" تم کہاں سے آئے ہو؟"

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۷

بولا" میں اہلِ مشرق میں سے ہوں" آپ نے فرمایا" کیا تمہارے پاس مشرق کا سب سے بڑا عالم نہیں ہے؟" اس شخص نے کہا" وہ کون ہیں؟" بولے" عبداللہ بن مبارک" یہ سُن کر سائل نے تعجب سے کہا" تو کیا ابن مبارک مشرق کے سب سے بڑے عالم ہیں؟" حضرت ثوری نے جواب دیا" ایک مشرق ہی کیا وہ تو مغرب کے بھی سب سے بڑے عالم ہیں۔"[1]

جامعیت | ابن مبارک علمی و عملی کمالات کے ایک ایسے گلدستۂ سدا بہار تھے کہ اُن کی جس کسی خصلت کو دیکھا جاتا نگاہِ تجسس محوِ حیرت ہو کر رہ جاتی تھی اور بے ساختہ زبان سے یہ شعر نکل جاتا تھا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم | کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اربابِ درس و تدریس اور اصحابِ علم و فضل ہوتے ہیں" بادۂ مرد افگن جنگ" کے حریف بننے کی تاب اُن میں کم ہوتی ہے۔ اور جو لوگ کتاب بینی میں زیادہ وقت گذارتے ہیں اُن کے گھوڑے میدانِ غزا میں سرپٹ نہیں دوڑتے لیکن ابن مبارکؒ کی ذات بیک وقت تمام علمی و عملی کمالات کی جامع تھی۔ عباس بن مصعب کہتے ہیں" ابنِ مبارکؒ حدیث، فقہ، حدیث، ایام رجال، بہادری، سخاوت، تجارت، ہردلعزیزی، ان تمام کے جامع تھے[2]" حسن بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن مبارک کے اصحاب جمع ہوئے اور انھوں نے کہا کہ آؤ ابن مبارک کے خصائل و شمائل کو شمار کریں"۔ چنانچہ انھوں نے بالاتفاق کہا" ابنِ مبارک کی ذات ستودہ صفات میں علم، فقہ، ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۲ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۵

زہد، تقویٰ، خموشی، قیامِ لیل، عبادت، حج، غزوہ، شہسواری، شجاعت، تندرستی و تنومندی، فضول اور لغو باتوں سے اجتناب، اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرنا، یہ تمام صفات جمع تھیں[۱] حافظ ذہبی بڑے پُراشتیاق انداز میں لکھتے ہیں "خدا کی قسم! میں عبداللہ بن مبارک سے محبت فی اللہ کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اُن کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ کو بھلائیاں عطا فرمائیگا کیونکہ اللہ نے ان کو پرہیزگاری، عبادت، اخلاص، جہاد، وسعت علم، پختہ یقینی، ہمدردی، غمگساری، مروت اور دوسری صفات حمیدہ سے متصف کیا ہے[۲]"

اُن کی اس شانِ جامعیت کے باعث ابو اسحاق الفزاری انہیں امام المسلمین کہتے تھے[۳]

مرجوعِ خلائق حضرت عبداللہ بن مبارک کے فضل و کمال کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی، لوگ اُن کی زیارت و ملاقات کے لیے بے چینی کے ساتھ کسی مناسب موقع کے منتظر رہتے تھے عبدالرحمٰن بن یزید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام اوزاعی نے اُن سے پوچھا "تم نے کبھی عبداللہ بن مبارک کو بھی دیکھا ہے؟" اُنھوں نے کہا "نہیں" فرمایا

لو رأیتہ لقرّت عینک[۴] اگر تم انہیں دیکھ لیتے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں

وہ جدھر جاتے تھے ارادتمندوں اور عقیدت گساروں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید رقہ میں فروکش تھا کہ اسی اثناء میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے یہاں تشریف لانے کی خبر پہنچی۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ بے تحاشا دوڑ پڑے اور اس قدر

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴

[۳] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۳ [۴] ایضاً ص ۱۵۷

کشمکش ہوئی کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں ہزاروں آدمی استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل پڑے تھے،
فضا پر غبار چھا گیا تھا۔ ہارون الرشید کی ایک حرم (ام ولد) نے محل کے برج پر سے جو یہ تماشا دیکھا
تو پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے؟" حاضرین نے کہا "خراسان کے ایک عالم جن کا نام عبداللہ بن مبارک
ہے۔ رقہ آرہے ہیں" بولی "بخدا! بادشاہ تو یہ ہیں، بھلا ہارون کیا بادشاہ ہے جو پولیس اور سپاہیوں
کے بغیر لوگوں کو جمع کر ہی نہیں سکتا"[1]

جب حضرت عبداللہ بن مبارک مرو سے روانہ ہوئے تو اہلِ مرو کو آپ کی جدائی کا
سخت رنج وقلق ہوا۔ ایک شاعر نے ان لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

اذا سار عبدُ اللہ من مرو لیلۃً　　فقد سار منھا نورھا وجمالُھا

اذا ذکر الاحبار فی کلّ بلدۃٍ　　فھم انجمٌ فیھا وانت ھلالُھا

ترجمہ:۔ عبداللہ رات کے وقت مرو سے روانہ ہوئے تو گویا مرو کا تمام نور اور جمال وہاں سے
چلا گیا۔ ہر شہر کے بڑے بڑے علماء کا اگر ذکر کیا جائے تو وہ سب ستارے ہونگے اور اے ابنِ
مبارک آپ اُن میں ہلال کی طرح چمکتے ہونگے[2]

علماء میں قدر عامۃ الناس کا کیا ذکر؟ بڑے بڑے ائمہ اور اساتذہ حدیث وفقہ اُن کا غایت درجہ
احترام کرتے تھے اور اُن کے استقبال ومشایعت کو اپنا فریضہ عقیدتمندی سمجھتے تھے۔ عبداللہ
بن سنان کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک مکہ سے روانہ ہوئے تو سفیان بن عیینہ اور
فضیل بن عیاض اُن کی مشایعت کے لیے دور تک ساتھ گئے۔ اُن میں سے ایک نے ابن مبارک

---

[1] تاریخ ابنِ خلکان ج ۱ ص ۲۴۸　[2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۶

کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ فقیہ اہل مشرق ہیں" دوسرے نے کہا اور فقیہ اہل مغرب بھی [1]

یحییٰ بن یحییٰ الاندلسی کہتے ہیں "ایک مرتبہ ہم امام مالک کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابن مبارک آگئے۔ انہوں نے شرکتِ مجلس کی اجازت چاہی، امام مالک نے اجازت دے دی۔ وہ تشریف لائے تو امام مالک نے اپنی نشست کو بدل دیا اور حضرت ابنِ مبارک کو اپنے پاس بٹھایا" یحییٰ کا بیان ہے کہ "امام مالک کسی شخص کے لیے بھی اپنی مجلس میں تبدیلی نہ کرتے تھے" [2]

حسن ادب | ابن مبارک حسن ادب کے جوہر سے بھی حصۂ وافر رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے اگر کوئی قرأتِ حدیث کرتا تھا تو وہ اُس سے کسی عبارت کو دوبارہ نہیں پڑھواتے تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ سُنتے رہتے تھے۔ ابن مہدی کا بیان ہے "ابن مبارك أدبُ عندنا من الثوری" [3]

ایک دفعہ امام مالک حدیث کا درس دے رہے تھے جس میں ابن مبارک بھی اتفاقاً شریک ہوگئے تھے۔ ایک تلمیذ قرأت کر رہا تھا، اس درس میں متعدد مواقع پر امام مالک نے حضرت ابنِ مبارک سے بعض حدیثوں اور مسائل کی نسبت دریافت کیا کہ ان کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ وہ از راہِ حسن ادب چپکے چپکے جوابات دیتے رہے۔ امام مالک کو حضرتِ ابنِ مبارک کے اس ادب پر بڑا تعجب ہوا اور جب وہ چلے گئے تو فرمایا "یہ ابن مبارک فقیہ خراسان تھے" [4]

عبادت | ان علمی و اخلاقی کمالات کے ساتھ عبادت گذار بھی بہت تھے نعیم بن حماد کہتے ہیں "میں نے ابنِ مبارک سے زیادہ نہ تو کوئی عقلمند دیکھا ہے۔ اور نہ اُن سے زیادہ کوئی عبادت گذار دیکھا" [5]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵
[4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۷۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵۔

خوفِ خدا | اُن پر خوفِ خدا کا غلبہ اس درجہ تھا کہ زہد سے متعلق احادیث یا آیات پڑھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذبح کیے ہوئے بیل ہیں گھگی بندھ جاتی تھی اور وہ بولنے پر بالکل قادر نہیں ہوتے تھے۔[1]

فصاحت | فصاحت کا کمال بھی اُن میں اس قدر تھا کہ تمام علماءِ عصر اس کا اعتراف کرتے تھے۔ ابن جریج تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میں نے ابن مبارک سے بڑا کوئی عراقی فصیح نہیں دیکھا۔[2]

شاعری | اپنے علمی و مذہبی مشاغل کے ساتھ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے لیکن اُن میں عام شاعری سے الگ حکمت و نصیحت کی باتیں بیان کرتے تھے۔ اُن کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

قد یفتح المرءُ حانوتاً لمتجرہٖ ... وقد فتحتَ لکَ الحانوتَ بالدین

بین الاساطینِ حانوتٌ بلا غلقٍ ... تبتاع بالدین اموال المساکین

صیّرت دینک شاہیناً تصید بہٖ ... ولیس یفلح اصحاب الشواہین

ترجمہ:- (۱) لوگ تجارت کے لیے دکانیں کھولتے ہیں لیکن تو نے دین کی دکان کھول رکھی ہے۔

(۲) بڑے بڑے ستونوں کے درمیان تیری دکان ہے جو بند ہی نہیں ہوتی اور جس کے ذریعہ دین کے بدلہ میں مسکینوں کے اموال خریدے جاتے ہیں۔

(۳) تو نے (اے دین فروش) اپنے دین کو شاہین بنا رکھا ہے جس سے تو شکار کرتا پھرتا ہے۔ اور ہاں شاہین باز لوگوں کو فلاح نہیں ہوتی۔

تجارت | غایت خودداری کی وجہ سے وہ علم و زہد کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا نہایت معیوب خیال کرتے تھے۔ اس بنا پر اُن کا ذریعۂ معاش تجارت تھا اور اُس میں ان کو جو نفع ہوتا تھا اُس کا اندازہ اس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۸

سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فضیل بن عیاض کی روایت کے مطابق وہ ایک لاکھ درہم سالانہ فقراء پر تقسیم کرتے تھے[1]۔

تجارت کا مقصد | لیکن اُن کی تجارت کا مقصد سرمایہ دار بن کر اپنے لیے بیش از بیش سامان آسائش فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ علم کی حقیقی وقعت اُس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ صاحب علم کو اپنی کسی معاشی ضرورت میں ابنائے روزگار میں سے کسی کی طرف احتیاج نہ ہو جیسا کہ کسی فارسی شاعر نے کہا ہے۔

مرا بتجربہ معلوم گشت آخر حال کہ قدر مرد بعلم ست و قدر علم بمال

اور ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

ویزدی بعقل المرء قلۃ مالہ وان کان اسریٰ من رجال واحوا[2]

چنانچہ ایک دفعہ فضیل نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ ہم کو تو زہد اور قوتِ لایموت پر قانع رہنے کا حکم کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خود خراسان سے قیمتی قیمتی سامان تجارت لاتے ہیں اور اسے بلدۂ حرام میں فروخت کرتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟" فرمایا "اے ابو علی یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ مال کے ذریعہ اپنی آبرو محفوظ رکھوں اور اُس کی مدد سے خدا کی اطاعت زیادہ سے زیادہ کروں اور تاکہ میں خدا کا جو حق اپنے ذمہ واجب دیکھوں اُس کی طرف سبقت کرکے اُسے ادا کرسکوں"۔ فضیل نے کہا "ابن مبارک! سبحان اللہ اس مقصد نیک کا کیا کہنا۔ اگر یہ پورا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [2] ترجمہ: کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا سردار اور ہمیر کرنے والا ہو لیکن اگر وہ قلیل المال ہے تو لوگ بات بات پر اُس کی عقل کو بٹہ لگاتے ہیں۔

ہو سکے۔[۹] غالباً اسی عام مسلمانوں کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی وجہ سے ابن مہدی کہا کرتے تھے میں نے اس اُمت کا خیر خواہ ابن مبارک سے زیادہ کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔[۱۰]

علماء و طلباء کی خدمت حضرت ابنِ مبارک یوں تو اپنا تمام مال کارہائے خیر میں صرف کرتے تھے لیکن علماء و طلباء دین کی مالی خدمت کا خصوصیت سے بڑا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن الحسن کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک نے فضیل بن عیاض سے جو اُن کے تلمیذ تھے فرمایا "اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا۔"[۱۱] بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے تھے کہ ابن مبارک خاص اپنے اہلِ وطن پر اتنا مال تقسیم نہیں کرتے جتنا کہ وہ دوسرے شہروں میں تقسیم کر آتے ہیں۔ ابن مبارک کو اس اعتراض کی خبر ہوئی تو اُنہوں نے فرمایا "میں جن علماء اور طلباء پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے اربابِ فضل و صدق ہیں۔ اِن لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا، اور اس میں پوری محنت و سعی سے کام لیا، لیکن ان کی ضرورتیں بھی وہی ہیں جو عام لوگوں کی ہوتی ہیں اس لیے اگر ہم ان کو چھوڑ دیں تو یہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ جائینگے اور علم ضائع ہو جائیگا۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے ان کو غنی کر دیا تو یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں علم کی اشاعت کرینگے اور نبوت کے بعد میرے نزدیک اشاعتِ علم سے افضل کوئی چیز نہیں ہے۔"[۱۲]

ارباب حوائج کی امداد علماء و طلباء کے علاوہ عام حاجتمند لوگوں کی امداد بھی بڑی فراخ حوصلگی سے کرتے تھے سلمۃ بن سلیمان کا بیان ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مبارک کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں

[۹] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۰ [۱۰] ایضاً ص ۱۶۱ [۱۱] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۶ [۱۲] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۰

مقروض ہوں۔ آپ میری طرف سے قرض ادا کر دیجیے۔ آپ نے فوراً اپنے وکیل کو لکھ دیا کہ اس شخص کا قرض ادا کر دیا جائے۔ یہ شخص خط لے کر وکیل کے پاس آیا تو اُس نے پوچھا "تم نے عبداللہ بن مبارک سے کتنی رقم طلب کی تھی؟" بولا "سات سو درہم" اب اس وکیل نے حضرت ابن مبارک کو لکھا کہ یہ شخص تو سات سو درہم کا مقروض ہے اور اسی کا آپ سے اُس نے مطالبہ کیا تھا لیکن آپ لکھتے ہیں کہ اس کو سات ہزار درہم دے دیے جائیں، اور اب تو غلات بھی ختم ہو گئے ہیں؟ ابن مبارک نے جواب میں لکھا "اگر غلات ختم ہو گئے ہیں تو کیا مضائقہ ہے، عمر بھی ایک دن یونہی ختم ہو جائیگی، اب تو جو کچھ میرے قلم سے نکل گیا ہے تم اُس پر عمل کرو۔[1]

ایک اور واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ محمد بن عیسٰی کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک طرطوس بہت آتے جاتے تھے۔ راستہ میں رقہ پڑتا تھا وہاں ایک سرائے میں قیام کرتے تھے۔ یہاں ایک نوجوان تھا جو سرائے میں قیام کی مدت میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی خدمت کرتا، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا، اور ان سے حدیث کا سماع کرتا تھا۔ ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ ابن مبارک رقہ کی سرائے میں حسب معمول قیام پذیر ہوئے تو آپ کو وہ نوجوان نہیں ملا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ قرض کی وجہ سے گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا "وہ کتنی رقم کا مقروض ہے؟" لوگوں نے بتایا دس ہزار درہم کا۔ آپ نے تلاش کے بعد صاحبِ قرض کو رات کے وقت بلایا اور کہا کہ تم اپنے دس ہزار درہم مجھ سے لے لو اور اُس نوجوان کو رہا کر دو۔ یہ خطیر رقم ادا کرنے کے بعد حضرت ابنِ مبارک شب میں ہی یہاں سے

[1] تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱۰ ص ۱۵۹۔

روانہ ہوگئے۔ وہ نوجوان رہا ہوا تو لوگوں نے اُسے بتایا کہ حضرت ابن مبارک اس سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے، اور اب تک وہ غالبًا دو تین منزل پہنچے ہونگے۔ یہ سُن کر نوجوان بھاگا اور آخر کار دو تین منزل کی مسافت پر اُنھیں پالیا۔ حضرت ابنِ مبارک نے اُس نوجوان سے اُس کا حال دریافت کیا تو اُس نے کہا۔ میں قید میں تھا کہ ایک شخص سرائے میں مقیم ہوا اُس نے میری طرف سے قرض ادا کر دیا اور میں رہا ہوگیا، اور لطف یہ ہے کہ میں اُس شخص کو جانتا بھی نہیں ہوں کہ کون ہے، اور کہاں سے آیا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی وفات تک کسی پر اس راز کا افشا نہیں ہوا[1]۔

تواضع اور مدارات ارباب حوائج کے ماسوا وہ اپنے مہمانوں، دوستوں اور رشتہ داروں کی خاطر مدارات پر بھی بہت کافی خرچ کرتے تھے۔ اسمٰعیل بن عیاش اپنے بعض دوستوں سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ مصر سے مکہ تک حضرت عبداللہ بن مبارک کے رفیق سفر ہوگئے تو کل مدتِ سفر میں حضرت ابن مبارک کا معمول یہ تھا کہ خود روزہ رکھتے تھے لیکن اپنے تمام ساتھیوں کو حلوہ بنا بنا کر کھلاتے تھے۔

ایک دفعہ غالبًا کسی غزوہ کے لیے حضرت ابنِ مبارک بغداد سے مصیصہ کے لیے روانہ ہوئے صوفیا کی ایک جماعت بھی رفیق سفر تھی۔ آپ نے اپنے ملازم کو بُلا کر حکم دیا کہ ایک طشت لاؤ طشت آگیا تو آپ نے اُس کو ایک رومال سے ڈھکوا دیا، اور اُس کے بعد اپنے ساتھیوں سے خطاب کر کے فرمایا "تم میں سے ہر شخص اپنا ہاتھ رومال کے نیچے لیجائے اور اُسے جو ملے لے لے" ایسا کرنے سے کسی

[1] خطیب بغدادی جلد ۱۰ ص ۱۵۹۔

کو دس درہم ملے، کسی کو بیس، اور کسی کو اس سے کم یا زیادہ۔ مصیصہ پہنچ کر آپ نے فرمایا" یہ پردیس ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب جو کچھ باقی رہ گیا ہے اُسے تقسیم کر دیا جائے"۔ اس وقت آپ کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگ جنہیں بیس بیس دینار ملے تھے، ازراہ مذاق کہتے تھے" ابو عبدالرحمٰن! یہ تو بیس درہم ہیں" آپ جواب میں فرماتے" پروانہ کرو، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ غازی کے نفقہ میں برکت عطا فرما دے"۔

حسن بن شقیق اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مبارک مرو سے حج کے لیے روانہ ہونے نکلتے تھے تو اُن کے پاس مروی احباب واصحاب جمع ہو کر اُن کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کرتے، آپ اُن سے فرماتے" تم لوگ اپنے اپنے نفقات میرے پاس جمع کر دو۔ چنانچہ آپ اُن سے روپیہ پیسہ لے کر اس کو ایک صندوق میں بند کر دیتے اور اُس کو مقفل کر کے رکھ دیتے، اس کے بعد آپ ان اصحاب کو لے کر مرو سے بغداد آتے، اور راستہ میں ان پر خوب خرچ کرتے، بہترین کھانے کھلاتے اور راحت وآسائش کا عمدہ سے عمدہ سامان فراہم کرتے۔ بغداد سے مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوتے تو ان لوگوں کے واسطے اچھے اچھے کپڑے بھی سلواتے۔ غرض یہ ہے کہ مرو کی واپسی تک حضرت عبداللہ بن مبارک ان لوگوں پر بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ اپنا روپیہ خرچ کرتے، یہاں آکر اپنے تمام حاجی دوستوں کے مکانات پر اُس زمانہ کے حجاج کے قاعدہ کے مطابق سفیدی اور دوسرے آرائش وزیبائش کے لوازم کراتے۔ تین دن کے بعد ان سب کی طرف سے ان کے احباب واعزا کی نہایت مکلف دعوت کرتے۔ اور جب ان سب کاموں سے فارغ ہو جاتے تو صندوق کھول کر ہر ایک کی تھیلی جس پر اُس کا نام لکھا ہوتا

تھا اس شخص کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے تمام رفقاء کے جملہ مصارفِ حج کا خود تکفل کرتے تھے یہاں تک کہ وطن کی واپسی کے وقت ان لوگوں کو اپنے بال بچوں اور متعلقین کے لیے مکہ کے جو تحائف خریدنے ہوتے تھے اُن کی قیمت بھی خود ہی ادا کرتے تھے[1]

ان واقعات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کس قدر سیر چشم، فیاض، بامروت، اور سخی تھے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے کس درجہ جان نثار دوست تھے۔ چنانچہ وہ بسا اوقات یہ شعر پڑھتے تھے۔

واذا صاحبت فاصحب صاجًا ذا حیاءٍ وعفافٍ وکرم

قابلًا للشیٔ لا ان قلت لا واذا قلت نعم قال نعم

ترجمہ:۔ اگر تم کسی کو دوست بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ جو باحیا ہو اور صاحب عفت وکرم بھی ہو۔ اور جس کا حال یہ ہو کہ تم کسی چیز پر "نہیں" کہہ دو تو وہ بھی نہیں کہہ دے۔ اور اگر تم "ہاں" کر دو تو وہ بھی "ہاں" کہہ اٹھے۔

سلاطین کے سامنے اظہارِ حق

حضرت عبداللہ بن مبارک اُن بزرگوں میں سے تھے جن کی نظریں جاہ و جلالِ خداوندی کے تصور سے ہر وقت روشن رہتی ہیں اور اس بنا پر وہ دنیا کے قاہر و جابر بادشاہوں کی صولت و شوکت سے ذرا مرعوب نہیں ہوتے۔ ابراہیم بن نوح موصلی کا بیان ہے کہ ہارون رشید عین زربہ آیا تو اس نے حضرت ابن مبارک سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا۔ "امیر المومنین! ابن مبارک خراسانی شخص ہیں، مجھ کو ڈر یہ ہے کہ کہیں وہ آپ سے ایسی باتیں

[1] یہ واقعات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۵۷-۱۵۸ سے ماخوذ ہیں۔

نہ کریں جو آپ کو ناگوار گذریں اور جن سے متاثر ہو کر آپ انہیں قتل کرا دیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں اپنے آپ کو بھی ہلاک کرونگا، اور عبداللہ بن مبارک اور امیرالمومنین کی ہلاکت کا بھی سبب ہونگا۔

ہارون یہ سُن کر اُس وقت تو خاموش ہو گیا۔ چند روز کے بعد اُس نے پھر ابن مبارک کو یاد کیا تو میں نے عرض کیا "امیرالمومنین! ابن مبارک سخت مزاج اور بے پروا آدمی ہیں" ہارون پھر خاموش ہو گیا۔ لیکن اتفاقاً اس واقعہ کے تین دن بعد حضرت ابنِ مبارک خود ہی تشریف لے آئے ان سے کسی نے پوچھا "آپ پہلے تو ہارون کی ملاقات سے اجتناب کرتے تھے، اب آپ کیسے چلے آئے؟" فرمایا "میں اپنے دل کو موت پر راضی کرنا چاہتا تھا، مگر وہ نہیں ہوتا تھا، اب جبکہ وہ مرنے پر رضامند ہو گیا تو میں ہارون کے پاس چلا آیا"۔[1]

طب حضرت عبداللہ بن مبارک کے کمالات کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اُس سے طب کا فن تک خارج نہ تھا، وہ اس میں بھی ارباب فن کا سا کمال رکھتے تھے، ایک مرتبہ وہ حضرت سفیان ثوری کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ شدتِ کرب سے کراہ رہے ہیں۔ پوچھا کیا حال ہے؟ اُنھوں نے اپنا مرض بیان کیا۔ حضرت ابنِ مبارک نے لوگوں سے اُسی وقت پیاز کی ایک گنٹھی منگوائی۔ وہ آگئی تو آپ نے اُس کو تراش کر حضرت ثوری سے کہا کہ اس کو سونگھیے۔ انھوں نے تھوڑی دیر اس کو سونگھا تھا کہ ایک چھینک آئی اور اُس سے تمام کرب و اضطراب ختم ہو گیا حضرت ثوری بولے "سبحان اللہ! آپ فقیہ بھی ہیں اور طبیب بھی"۔[2]

تواضع اور انکسار ان خوبیوں کے باوصف تواضع اور فروتنی اس قدر تھی کہ کبھی اپنی تعریف سُننا گوارا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۶ [2] ایضاً

نہیں کرتے تھے۔ ابوالوہب المروزی کہتے ہیں "میں نے عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ تکبر کی تعریف کیا ہے؟" فرمایا" وہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو حقیر سمجھو اور اُن سے اس کی توقع کرو کہ وہ تمہیں پسند کریں" اس کے بعد فرمایا "تکبر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم اپنی کسی چیز کی نسبت یہ خیال کرو کہ یہ کسی اور کے پاس نہیں ہے"[1]

شجاعت اور مہارتِ جنگ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے حضرت عبداللہ بن مبارک صرف صاحبِ علم و فضل ہی نہیں تھے بلکہ اُنہیں فنِ سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا۔ عبدہ بن سلیمان المروزی کا بیان ہے "ہم ایک مرتبہ روم کی ایک مہم پر حضرت عبداللہ بن مبارک کے ساتھ گئے وہاں دیکھا کہ فریقین کی صف آرائی کے بعد دشمن کی صف سے ایک بہادر نکلا اور اُس نے للکار کر دعوتِ جنگ دی۔ اُس کے جواب میں ہماری طرف سے بھی ایک بہادر بڑھا جس نے اپنے حریف کو قتل کر دیا، اس کے بعد دشمن کی صف سے ایک اور جنگجو سپاہی نکلا اور ہماری فوج کے بہادر نے اُس کا بھی کام تمام کر دیا۔ اب ہمارے بہادر نے گرج کر کہا کیا کوئی اور ہے جو مقابلہ کے لیے آئے، کچھ تامل کے بعد دشمن کی صف سے تیسرا جنگ آزما بڑھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں میں جنگ ہوتی رہی۔ آخرکار ہماری فوج کے اس بہادر نے اس کے بھی اس زور سے نیزہ مارا کہ اُس کا لاشہ زمین پر خاک و خون میں تڑپ رہا تھا۔ راوی کہتا ہے اب ہم سب دوڑ پڑے اور اس شخص کا احاطہ کر لیا۔ اُس نے آستین سے اپنا مُنہ چھپا رکھا تھا۔ میں نے زور سے جھٹکا دیکر آستین مُنہ پر سے ہٹائی تو دیکھا کہ ہمارا یہ بہادر عبداللہ بن مبارک تھا۔ مجھ کو دیکھ کر فرمانے لگے۔

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۶۔

"کیوں ابوعمرو! تم بھی اُن لوگوں میں سے ہو جو مجھ پر طعن و تشنیع کرتے ہیں"[1]

غایتِ کمال و بزرگی | تمام علمی و عملی کمالات کی جامعیت نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی شخصیت کو اس قدر محبوب و ہردلعزیز بنا دیا تھا کہ لوگ اُن سے بے ساختہ محبت کرتے تھے۔ اور اُن کی شان میں کوئی کلمۂ استخفاف سُن نہیں سکتے تھے۔ اسود بن سالم کہتے ہیں "ابن مبارک امام مقتدیٰ تھے۔ اور سُنت میں سب سے زیادہ تثبت رکھتے تھے۔ میں اگر کسی شخص کو اُن پر نکتہ چینی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے اُس کے اسلام میں شک ہونے لگتا ہے"[2]

ابن عیینہ فرماتے ہیں "میں نے صحابۂ کرام کے حالات میں غور کیا ہے اور ادھر عبداللہ بن مبارک کے حالات بھی دیکھے ہیں دونوں کے مقابلہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ صحابہ کو حضرت ابنِ مبارک پر محض اس وجہ سے فضیلت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پایا ہے اور آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے رہے ہیں"[3]

امام نسائی کا بیان ہے کہ "میں ابنِ مبارک کے عہد میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو مرتبہ کے اعتبار سے اُن سے زیادہ بڑا اور بلند ہو۔ اور جس میں تمام خصائل محمودہ اس جامعیت کے ساتھ پائی جاتی ہوں"۔ خلیلی کہتے ہیں "ابن مبارک متفق علیہ امام ہیں، ان کی کرامات ناقابلِ شمار ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ ابدال میں سے ہیں"[4]

تلامذہ | حضرت عبداللہ بن مبارک ایسی جامع شخصیت سے کون کسبِ فیض کرنا نہیں چاہتا چنانچہ

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۷ [2] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۸

[3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵ [4] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۷۔

آپ سے استفادہ کی غرض سے مختلف ولایتوں کے بے شمار لوگ دور دراز سے آتے اور اپنی تشنگی علم بجھاتے تھے[1] ان میں سے بعض بڑے بڑے ائمہ علم و ہنر بھی تھے۔ مثلاً عبدالرحمن بن مہدی یحییٰ بن معین، ابوبکر بن شیبہ، احمد بن حنبل المروزی، حبان بن موسیٰ[2]

وفات | وفات بھی اس قدر اچھی ہوئی کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے۔ کسی غزوہ میں گئے تھے کہ وہاں سے واپسی پر راستہ میں ہی بیمار ہو گئے، عمر وہی پائی جو سید ولد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی یعنی ۶۳ برس کی۔ آخر کار اسی مرض میں ۱۳ رمضان ۱۸۱ھ کو علی الصباح ہیت[3] میں انتقال فرمایا[4] مشہور عباسی خلیفہ ہارون کو اطلاع ہوئی تو اس نے کہا "افسوس! علماء کے سردار کا انتقال ہو گیا[5] حضرت سفیان بن عیینہ بولے "وہ بڑے فقیہ، عالم، عابد، زاہد، شیخ، بہادر، اور شاعر تھے" فضیل بن عیاض نے کہا "ابن مبارک چل بسے لیکن انہوں نے اپنا مثل کوئی نہیں چھوڑا[6] رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ

یحییٰ بن معین

نام و نسب | ابو زکریا کنیت، یحییٰ نام، والد کا نام معین تھا۔ قبیلۂ مرۃ غطفان کے غلام تھے۔ ابن ابی خیثمہ کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ میں جنید بن عبدالرحمن مری کا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۳ [2] ایضاً [3] یہ شہر دریائے فرات کے ساحل پر واقع ہے۔

[4] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۱۶۸ [5] ایضاً ص ۱۶۳ [6] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۸۵۔

آزاد کردہ غلام ہوں۔

ولادت وسکونت | بغداد سے ۲۶ میل کی مسافت پر ایک گاؤں ہے جس کا نام نقیا ہے یحییٰ بن معین یہاں کے رہنے والے تھے۔ ابوجعفر کے عہد حکومت میں ۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم | حضرت یحییٰ کے والد معین رے کا خراج وصول کرنے پر مامور تھے۔ اس میں انہوں نے بہت دولت کمائی تھی جب انتقال ہونے لگا تو ان کے پاس دس لاکھ پچاس ہزار درہم نقد جمع تھے۔ ان کی وفات پر حضرت یحییٰ نے اس تمام سرمایہ کو علم حدیث کی تعلیم پر صرف کر دیا یہاں تک کہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں لم یبق لہٗ نعل یلبسہٗ (ترجمہ: ان کے پاس پہننے کے لیے ایک جوتہ بھی نہیں بچا)[1]

علم وفضل | علم کے لیے ان کے اس ایثار و فداکاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وقت کے سب سے بڑے محدث و علامہ بن گئے خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وہ بڑے ربانی امام، عالم، حافظ، ثبت فی الحدیث اور پختہ علم والے تھے[2]" حافظ ذہبی انہیں "الفرد سید الحفاظ" لکھتے ہیں۔ امام نسائی کہا کرتے تھے "ابوزکریا معتمد ہیں، مامون ہیں اور ائمہ حدیث میں سے ہیں"۔ ابن مدینی کا بیان ہے کہ حضرت آدم کے زمانہ سے اب تک مجھ کو کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے یحییٰ بن معین کی برابر حدیثیں لکھی ہوں۔ ابن مدینی کہتے ہیں "لوگوں کا علم یحییٰ بن معین پر ختم ہوگیا" یحییٰ القطان کہتے ہیں "ہمارے پاس ان دو شخصوں جیسا کوئی نہیں آیا۔ ایک احمد بن حنبل، اور دوسرے یحییٰ بن معین"۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے "یحییٰ بن معین ہم سب سے زیادہ عالم ہیں[3]"۔ امام نووی

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۷۷، ۱۸۰ [2] ایضاً ص ۱۷۷ [3] یہ سب معلومات تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶ سے ماخوذ ہیں۔

فرماتے ہیں "سب لوگوں کا اُن کی امامت، توثیق، حفظ جلالتِ شان، اور علم میں تقدم و انہماک پر اتفاق ہے۔"[1]

علم حدیث | یوں تو اُنہوں نے اُس زمانہ کے مروجہ اسلامی علوم سب کچھ ہی پڑھے ہونگے لیکن اُن کو حدیث سے اتنا شغف تھا اور خاص اس علم میں اُنہوں نے وہ کمال پیدا کیا کہ اُن کی شخصیت خود فن کے لیے سرمایۂ نازو افتخار بن گئی اور دوسرے فنون کا علم اُن کے علم حدیث کے بالمقابل بے آب و تاب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب سیران کی امامت فی الحدیث کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے ہیں لیکن ان کی تفسیر دانی یا تفقہ کا کہیں ذکر تک نہیں کرتے۔

شیوخ | حضرت یحییٰ بن معین کو حدیث کا فطری ذوق تھا۔ اُنہوں نے بیشمار شیوخ سے احادیث کا سماع کیا جن میں سے چند مشہور نام یہ ہیں:۔

عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، وکیع۔ ابن ابی عدی، القطان، ابن مہدی عبدالصمد بن عبدالوارث وغیرہم۔

حدیث کی کتابت | یحییٰ بن معین نے صرف سماع پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جو کچھ سُنتے تھے اُسے لکھ بھی لیتے تھے۔ چنانچہ علی بن المدینی کا بیان ہے کہ یحییٰ بن معین نے حدیث کی جتنی کتابت کی ہے مجھ کو نہیں معلوم کہ کسی اور نے بھی اتنی کتابت کی ہو۔" احمد بن عقبہ کہتے ہیں" ایک مرتبہ میں نے یحییٰ بن معین سے پوچھا "آپ نے کتنی احادیث قلمبند کی ہیں" فرمایا" میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔" اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد احمد بن عقبہ کہتے ہیں" میرا گمان ہے

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۷۔

کہ محدثین کرام نے ان چھ لاکھ احادیث کے علاوہ جن کو یحییٰ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا، چھ چھ لاکھ احادیث خود اپنے قلم سے لکھ لکھ کر حضرت یحییٰ کو دی ہیں۔[1] محمد بن نصر طبری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں حضرت یحییٰ بن معین کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہاں دفتروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ حضرت یحییٰ اُن کی طرف اشارہ کرکے فرمانے لگے "جو حدیث ان دفاتر میں نہ ملے وہ کاذب ہے۔" ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اُن کی کتابوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ تیس الماریاں (قمطر) اور بیس صندوق کتابوں سے پُر ہیں۔[2] پھر لکھتے وقت احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک روایت کو پچاس پچاس مرتبہ لکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر ہم کسی حدیث کو اتنی مرتبہ نہ لکھیں تو ہم اُسے پہچان ہی نہیں سکتے۔[3]

تنقید احادیث علمِ حدیث میں حضرت یحییٰ بن معین کو سب سے زیادہ کمال تنقید روایات میں تھا اس میں اُن کو ایسا ملکہ تھا کہ روایات کے انبار میں جو روایت نادرست ہوتی تھی اُسے فوراً پہچان جاتے اور اُس کی غلطی پر تنبیہ کردیتے تھے۔ ابو سعید الحداد کا بیان ہے کہ ہم کسی محدث کے پاس جاکر اُس کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تو معلوم یہ ہوتا کہ ہر لکھی ہوئی حدیث درست اور صحیح ہے۔ اتنے میں ابو زکریا یحییٰ بن معین تشریف لے آتے تو سب سے پہلی چیز جو اُن کے ہاتھ لگتی وہ خطا ہوتی تھی اور وہ خطا اس قدر باریک ہوتی تھی کہ حضرت یحییٰ بن معین کے بتائے بغیر ہم میں سے کوئی اُس کا پتہ لگا نہیں سکتا تھا۔ ایک مجلس میں علی ابن مدینی اور امام احمد تشریف فرما تھے، امام یحییٰ بن معین بھی تشریف رکھتے تھے۔ حدیث پر مذاکرہ ہو رہا تھا کسی شخص نے کہا "اے یحییٰ بن معین! آج ہم آپ کو

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۲ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷

بہترین احادیث سُناتے ہیں" بولے "ہاں سُناؤ" اُن کی یہ خواہش دیکھ کر لوگوں نے حدیثیں سُنانی شروع کیں۔ اِن حدیثوں میں جہاں جہاں غلطی تھی یحییٰ بن معین اُس پر تنبیہ کرتے رہے۔ پھر ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت ابن معین کی تنقید بالکل درست تھی۔[1]

تنقید حدیث کے فن میں حضرت ابنِ معین کی مہارت اُس زمانہ کے بڑے بڑے ائمہ فن کے نزدیک مسلم تھی۔ ابن الرومی کا بیان ہے کہ "ایک مرتبہ میں امام احمد بن حنبل کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا "اے ابو عبداللہ! ذرا ان احادیث کو دیکھیے، ان میں کچھ خطا معلوم ہوتی ہے؟" آپ نے فرمایا "تم ابو زکریا (یحییٰ بن معین) کے پاس جاؤ، وہ خطا کو پہچانتے ہیں"[2]

امام احمد بن حنبل اور ایک محدث عبدالخالق دونوں مغازی کی احادیث سُننے کے لیے یعقوب بن ابراہیم کے پاس جاتے تھے اس زمانہ میں حضرت یحییٰ بن معین بصرہ میں قیام پذیر تھے۔ ایک دن امام احمد نے فرمایا "اے کاش! ابو زکریا یہاں ہوتے" عبدالخالق نے کہا "اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو آپ کیا کرتے؟" بولے "وہ خطا کو پہچانتے ہیں" امام احمد بن حنبل حضرت یحییٰ بن معین سے سماع حدیث کے اس درجہ مشتاق تھے کہ آپ فرماتے تھے۔ السماع من یحیی بن معینٍ شفاءٌ للصدور (ترجمہ: یحییٰ بن معین سے احادیث کا سُننا سینوں کے لیے پیغام شفاء ہے) ایک دفعہ امام احمد بن حنبل نے خواہش ظاہر کی کہ یحییٰ بن معین یہاں آجائیں۔ ایک شخص نے کہا "اگر وہ یہاں آ بھی جائینگے تو کیا کرینگے! وہی سُنی سنائی احادیث پھر سنائینگے" امام احمد نے فرمایا "چپ رہو! وہ حدیث میں جہاں کہیں خطا ہوتی ہے اُسے فوراً پہچان جاتے ہیں"[3]

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۷۹، [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۷۹ و ۱۸۰۔

علی بن المدینی کا بیان ہے کہ چالیس سال تک میرا یہ معمول رہا کہ میں جب کبھی بغداد آتا تھا تو امام احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے حدیث پر مذاکرہ کرتا تھا، اس مذاکرہ میں اگر کسی چیز میں میرا اور امام احمد بن حنبل کا اختلاف ہو جاتا تو ہم حضرت یحییٰ بن معین کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے رجوع کرتے تھے، وہ فوراً حدیث اُس کے اصل مخرج سے نکال دیتے تھے، اس میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔[1] عمرو الناقد کہتے ہیں "ہمارے اصحاب میں یحییٰ بن معین سے زیادہ کوئی علم اسناد کا ماہر نہیں تھا۔[2] صالح بن محمد کہتے ہیں "جن لوگوں کو میں نے پایا ہے ان میں علل حدیث" کے سب سے بڑے عالم، ابن مدینی، اور فقہ حدیث میں سب سے زیادہ کمال رکھنے والے امام احمد بن حنبل اور مذاکرہ کے وقت سب سے بڑے حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ تھے، لیکن احادیث میں مشائخ نے جو تصحیفات کی ہیں ان کے سب سے بڑے عالم یحییٰ بن معین تھے۔[3] ایک دوسری روایت میں علی بن المدینی کے الفاظ یہ ہیں "یحییٰ اعلم بالرجال والکنیٰ" ابوداؤد سے کسی نے دریافت کیا "اسماء الرجال کا بڑا عالم کون ہے علی بن المدینی یا یحییٰ؟" بولے "یحییٰ عالم بالرجال ہیں، اور علی کو اہل شام کی کوئی خبر نہیں ہے۔[4]"

احتیاط و ورع | تنقید رواۃ اور اُن کی جرح و تعدیل کا کام جس قدر مشکل ہے اُس سے زیادہ بہت بڑی اخلاقی جرأت کا طلبگار ہے۔ بسا اوقات جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بعض ایسے ایسے مشائخ علم و طریقت کو ساقط کر دینا پڑتا ہے جو عوام کی نظروں میں نہایت وقیع اور محترم ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ کسی راوی پر تنقید کرتے وقت ذاتی خصومت و مخالفت

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۳ [2] بغیر تغیرات [3] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۳ [4] ایضاً

کو مطلقاً اثرانداز نہ ہونے دینا چاہیے۔ حضرت یحییٰ بن معین اس باب میں بڑے محتاط واقع ہوئے تھے
چنانچہ ہارون بن بشیر الرازی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین کو دیکھا قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے اور دونوں
ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ یہ دعا مانگ رہے تھے "اے خدا اگر میں نے کسی ایسے شخص میں کلام کیا
ہو جو درحقیقت میرے نزدیک کاذب نہ ہو تو میری مغفرت نہ فرما" اسی احتیاط کی وجہ سے وہ
ایک ایک حدیث کو تیس تیس مرتبہ لکھتے تھے۔[1]

حضرت یحییٰ بن معین کا علم روایات اس درجہ پختہ اور یقینی تھا کہ اُن کے سامنے جو روایت
آتی تھی۔ اُس پر فوراً حکم لگا دیتے تھے وہ کسی حدیث کے متعلق نہ تو استفہام کرتے تھے اور نہ
اُس میں اُنہیں کوئی تردد پیش آتا تھا۔[2]

جلالت علم | حضرت یحییٰ بن معین کی جلالتِ علم کے سامنے بڑے بڑے ائمۂ فن کو پسینہ آجاتا تھا۔
ہارون بن معروف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شام کے ایک شیخ ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے
میں نے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کی املاء کی درخواست کی۔ اُنہوں نے اُس کو
منظور فرما لیا اور اپنی کتاب اُٹھا کر اُس کی املا کرانے لگے۔ اتنے میں دروازہ پر کنڈی کھٹکھٹائے
جانے کی آواز آئی معلوم ہوا کہ امام احمد بن حنبل تشریف لائے ہیں شیخ نے امام کو آنے کی اجازت
دیدی۔ چنانچہ آپ اندر تشریف لے آئے لیکن میں نے دیکھا کہ امام احمد بن حنبل کے آجانے سے شیخ
کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا، وہ اُسی طرح کتاب ہاتھ میں لیے املا لکھاتے رہے۔ امام احمد
کے بعد احمد الدورقی، عبداللہ بن الرومی، ابوخیثمہ زہیر بن حرب اسی طرح علی الترتیب آ آ کر اجازت

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۳۔

حاصل کر کے شریک درس ہوتے رہے لیکن شیخ کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا وہ بدستور کتاب ہاتھ میں لیے املا لکھاتے رہے۔ جب یہ سب حضرات آچکے تو پھر کنڈی کھٹکھٹائی گئی۔ اس مرتبہ معلوم ہوا کہ یحییٰ بن معین تشریف لائے ہیں، شیخ نے حضرت ابن معین کو دیکھا ہی تھا کہ ان کے ہاتھ کانپنے لگے اور کتاب نیچے گر پڑی[1]۔

ان کی علمی وجاہت وجلالت کا یہ عالم تھا کہ وہ جس کسی محدث کے پاس سماع حدیث کے لیے چلے جاتے یا اس کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آتے تو وہ اس پر بیحد مفتخر ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبدالوہاب بن عطا بغداد آئے ہوئے تھے کہ حضرت یحییٰ بن معین ان کے پاس تشریف لائے، حضرت ابن معین کے آنے سے ابن عطا کو جو فخر آمیز مسرت ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے متعلقین کے نام بصرہ خط لکھا تو اس میں یہ بھی تحریر کیا "میں بغداد آیا، یہاں یحییٰ بن معین میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ کو بوسہ دیا۔ والحمد للہ رب العلمین[2]"

حضرت یحییٰ کے عہد کے بڑے بڑے علما کسی مسئلہ میں کوئی قطعی فیصلہ اس وقت تک نہیں کرسکتے تھے جب تک کہ انہیں اس مسئلہ کے متعلق حضرت ابن معین کی رائے معلوم نہیں ہوجاتی تھی ابوسعید الحداد کہتے تھے۔

الناس کلھم عیال علی یحییٰ بن معین تمام لوگ یحییٰ بن معین کی طرف محتاج ہیں۔

پھر کہا کہ دنیا میں ان کی برابر کوئی سچا آدمی نہیں ہے وہ اس باب میں سب سے سبقت لے گئے ہیں

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۱ [2] ایضاً

رہے وہ لوگ جو ان کے بعد آئینگے اُن کی نسبت کچھ کہا نہیں جا سکتا۔[1]

تمام معاصرین اُن کے اظہارِ حق اور جرأت بیان کے معترف تھے اور اسی بنا پر اُن کی جرح و تعدیل کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ابن الرومی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین کے علاوہ کوئی شخص نہیں دیکھا جو مشائخ کی شان میں امرِ حق کا اظہار کرتا ہو دوسرے لوگ تو محض لگی لپٹی باتیں کرتے ہیں۔[2]

امام احمد بن حنبل جیسا امام وقت محدث حضرت یحییٰ سے بے تکلف استفادہ کرتا تھا۔ اور اُن کی ایک ایک بات کو اپنے لیے حرزِ جان بنا کر رکھتا تھا۔ عباس الدوری کہتے ہیں "میں نے روح بن عبادۃ کی مجلس میں امام احمد بن حنبل کو دیکھا کہ یحییٰ بن معین سے سوالات کرتے جاتے تھے کہ اے ابوزکریا! یہ حدیث کیسی ہے اور یہ کیسی ہے؟" یہ واضح رہنا چاہیے کہ امام احمد کا یہ سوال ان احادیث کی نسبت تھا جو عام طور سے لوگ سُنتے رہتے ہیں، ان سوالات کے جواب میں حضرت یحییٰ جو کچھ فرماتے امام احمد اُسے قلمبند کرتے جاتے تھے۔ امام احمد بسا اوقات حضرت یحییٰ بن معین کی نسبت فرماتے تھے۔

رَجُلٌ خَلَقَہُ اللّٰہُ لِھٰذَا الشَّانِ یظھر کذب الکاذبین۔[3] وہ ایک ایسے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ جھوٹوں کا جھوٹ ظاہر کریں۔

محمد بن رافع کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں نے امام احمد بن حنبل سے سُنا فرما رہے تھے" جو حدیث یحییٰ بن معین کے نزدیک معروف نہ ہو، سمجھ لو کہ وہ حدیث ثابت نہیں ہے۔[4] ابوحاتم کہتے تھے

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۳ [2] ایضاً [3] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۷ [4] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۶۔

"تم اگر یحییٰ بن معین کو دیکھو کہ امام احمد سے محبت کرتے ہیں تو جان لو کہ امام صاحبِ سنت ہیں لیکن اگر تم امام احمد کو دیکھو کہ وہ یحییٰ بن معین سے بغض رکھتے ہیں تو سمجھ لو کہ وہ کذاب ہیں"[1]

قبولِ روایت میں احتیاط

اس ذوق تنقید کے کمال کی وجہ سے وہ کسی روایت کو اُس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ انہیں اُس کی نسبت پوری تسلی اور تشفی نہیں ہو جاتی تھی جس حدیث میں انہیں کہیں ذرا سا شک ہوتا اُسے ترک کر دیتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ "جو شخص سمع فی الحدیث نہیں کرتا وہ کاذب ہے"۔ لوگوں نے پوچھا "سمع فی الحدیث کس طرح ہوتا ہے؟" فرمایا "اس طرح کہ جب اُسے حدیث میں کوئی شک ہو تو ترک کر دے"[2]

حدیث کی صحت معلوم کرنے میں محنت و مشقت

حضرت یحییٰ بن معین تنقید روایات میں کس درجہ دیدہ ریزی اور محنت و مشقت سے کام لیتے تھے؛ اُس کا اندازہ خود اُن کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ "میں بعض اوقات حدیث بیان کر دیتا ہوں لیکن پھر اس خوف سے جاگتا رہتا ہوں کہ کہیں میں نے اس میں غلطی نہ کر دی ہو"۔ اُن کی اس جدوجہد، کمال اور ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دروغ بیان راویوں کے اختلاط کے باعث جو غلط روایتیں مسلمانوں میں پھیل گئی تھیں اُن کی قلعی کھل گئی اور صحیح و غلط روایات میں خطِ امتیاز کھنچ گیا۔ چنانچہ یحییٰ بن معین خود فرماتے ہیں "ہم کاذبوں کی روایتیں برابر لکھتے رہے لیکن اب ہم نے اُن سے تنور بھر دیے ہیں اور اُس سے پکی پکائی روٹیاں نکالی ہیں"۔ حضرت یحییٰ بن معین کے پیکرِ صدق و صفا ہونے کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ اُن سے بغض رکھنا جھوٹا ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ محمد بن ہارون نے کہا کہ "اگر تم کسی شخص کو دیکھو

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۶ [2] ایضاً

کہ یحییٰ بن معین کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے تو سمجھ لو وہ جھوٹا ہے اور احادیث وضع کرتا ہے اور حضرت ابن معین سے اس لیے بغض رکھتا ہے کہ وہ جھوٹوں اور افتراپردازوں کی حقیقت کھول کھول کر بیان کرتے ہیں"

ادب | لیکن اسماء الرجال کے اتنے بڑے عالم اور نقاد ہونے کے باوجود حضرت یحییٰ جس کسی راوی میں کوئی عیب پاتے تھے رسوائی کے خیال سے لوگوں میں اس کی تشہیر نہیں کرتے تھے بلکہ چپکے سے اسی کو اس کے عیب پر متنبہ کر دیتے تھے تاکہ وہ اصلاح کرلے۔ خود اُن کا بیان ہے کہ عفان نے تقریباً بیس حدیثوں میں غلطی کی تھی لیکن میں نے اُن پر کسی شخص کو مطلع نہیں کیا بلکہ صرف عفان کو اُن پر تنبیہ کر دی"۔ ایک موقع پر انہوں نے فرمایا "میں نے کسی شخص میں جب کوئی غلطی پائی تو میں نے اُس کا اخفا کیا اور یہ کوشش کی کہ کسی طرح اُس کا معاملہ درست ہو جائے۔ اگر وہ میری بات مان لیتا ہے تو خیر! ورنہ پھر میں اُسے چھوڑ دیتا ہوں[۱]"۔

فقہ | حدیث کی طرح انہیں فقہ میں بھی کمال حاصل تھا بعض مسائل ایسے ہیں جن میں وہ منفرد تھے حافظ ابن حجر نے اُن کو بیان کیا ہے[۲]۔

ورع وتقویٰ | اِن علمی کمالات کے ساتھ وہ عملی کمالات کے بھی گلِ سرسبد تھے۔ نہایت اتقا اور پاکیزگی وطہارت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بسا اوقات یہ اشعار اُن کے وردِ زبان رہتے تھے۔

المالُ یذھبُ حِلُّہٗ وحَرامُہٗ | طوعاً وتبقیٰ فی غدٍ اٰثامُہٗ
لیس التقی بمُتّقٍ لالٰھہٖ | حتّٰی یطیبُ شرابُہٗ وطعامُہٗ

---

[۱] یہ سب معلومات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۴ سے ماخوذ ہیں۔ [۲] دیکھو تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۷۔

ویطیب ما تحوی وتکسب کفہ ویکون فی حسن الحدیث کلامہ

نطق النبی لنا بہ عن ربہ فعلی النبی صلاتہ وسلامہ

ترجمہ:۔ مالِ حلال وحرام سب کچھ برضا و رغبت ختم ہو جاتا ہے اور کل کے لیے اُس کے گناہ باقی رہ جاتے ہیں۔

پرہیزگار صرف وہی شخص نہیں ہوتا جو خدا سے ڈرنے والا ہو، بلکہ پرہیزگاری کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا کھانا پینا بھی طیب اور پاکیزہ ہو۔

اور جو چیز کہ اُس کا ہاتھ جمع کرتا ہے اور کما رہا ہے وہ طیب ہو۔ اور اُس کا کلام اچھی باتوں پر مشتمل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اپنے رب کی طرف سے اس کے متعلق ہدایات دے دی ہیں۔ پس اُن پر اللہ کا صلوٰۃ وسلام ہو۔

تنقیدِ حدیث کا اُن میں ایسا صحیح ذوق پیدا ہو گیا تھا کہ بعض اوقات لوگ امتحاناً اُن کے سامنے مخلط احادیث کا ایک مجموعہ پیش کرتے تو وہ فوراً بتا دیتے کہ یہ حدیث اس طرح ہے اور یہ اس طرح۔ پھر دیکھا جاتا تو واقعی وہ احادیث اسی طرح ہوتی تھیں۔

بعض لوگ اُن کی تنقید سے ناراض ہوتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم بن ہانی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابو داؤد نے حضرت یحییٰ بن معین کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے تو ابراہیم بولے "تم یحییٰ بن معین کی شان میں ایسے الفاظ بولتے ہو؟" لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے وہی لوگ تھے جن کو حضرت ابن معین کے ساتھ رشک وحسد کی وجہ سے کوئی ذاتی عناد تھا۔ ورنہ بڑے بڑے ائمۂ عصر اُن کی جلالتِ علم وعمل، ان کی بے نفسی اور خلوص وللہیت کے مدح خواں تھے۔ عجلی کہتے

ہیں "اللہ نے کوئی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو ابن معین سے زیادہ حدیث کو جاننے والا ہو۔ یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، ابن مدینی اور دوسرے علماءِ اعلام عصر کے ساتھ مجالست کرتے تھے لیکن ان بزرگوں کو ابنِ معین ہی احادیث انتخاب کر کے دیتے تھے کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ ان پر سبقت کرتا۔ ابن حبان نے اور وضاحت سے بتایا ہے "ابن معین ثقات میں سے تھے۔ دین اور فضل کے مالک تھے۔ انہوں نے سنن کو جمع کرنے میں دنیا ترک کر دی تھی۔ اُنہی پر متوجہ رہتے تھے۔ اور ان حدیثوں کا یاد کرنا ہی اُن کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ دین و ہدایت کے ایسے علَم ہو گئے کہ اخبار و روایات کی نسبت اُن کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اور آثار میں اُن کو ہی امام تسلیم کیا جاتا ہے"[1]

وفات | ستتر برس کی عمر ہونے میں ابھی دس دن کی کسر باقی تھی کہ پیک اجل آ پہنچا۔ ان کی وفات کے سلسلہ میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جو بہت کم پیش آتے ہیں اس لیے ہم ذرا کسی قدر تفصیل سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ عام طور پر مصنفینِ سیر کی رائے یہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن معین ۲۳۳ھ میں مکہ معظمہ سے حج کر کے واپس ہوتے ہوئے مدینہ آئے اور یہاں دو تین دن قیام کر کے روانہ ہو رہے تھے کہ رات کو خواب میں ایک ہاتف کو دیکھا جو کہہ رہا تھا "اے ابو زکریا! کیا تم میرے پڑوس سے اعراض کرتے ہو؟" صبح ہوئی تو ساتھیوں سے فرمایا "تم سب جاؤ میں تو مدینہ ہی واپس لوٹ رہا ہوں، چنانچہ یہ سب رفقا چلے گئے اور حضرت ابن معین تنِ تنہا مدینہ آ گئے۔ یہاں دوبارہ آئے ہوئے ان کو تین دن ہی ہوئے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ علامہ بغدادی اس تمام واقعہ سے

[1] یہ حصہ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۸۲ سے ماخوذ ہے۔

متفق ہیں لیکن اس میں صرف اتنی ترمیم کرتے ہیں کہ حضرت یحییٰ کا حج کے وقت وفات پانا صحیح نہیں بلکہ زیادہ درست یہ ہے کہ وہ حج کے ارادہ سے روانہ ہونے کے لیے مدینہ منورہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ وفات ہوگئی۔

والیِ مدینہ کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ہوئی تو اُس نے حکم دیا کہ جس چارپائی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گئے تھے، حضرت یحییٰ کا جنازہ بھی اُسی پر لیجایا جائے۔ پھر جنازہ اُٹھا تو اس شان سے کہ جنازہ کے آگے آگے ایک شخص ندا کرتا جاتا تھا "یہ اُس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ منسوب ہونے والی باتوں کو دور کرتا تھا"۔ ابراہیم بن المنذر الحزامی نے اعلان کیا "جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو مامون عن الکذب کر دینے والے کے جنازہ میں شریک ہو اُس کو یحییٰ بن معین کے جنازہ میں آنا چاہیے"۔ کون سنگدل ہوگا جو ان اعلانات کو سننے کے بعد بھی اس "عاشق" کے دھوم سے اُٹھتے ہوئے جنازہ میں شرکت نہ چاہتا ہوگا چنانچہ جنازہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع ہوگیا۔ لوگ آپس میں کہتے جاتے تھے "هٰذَا الذَّابُّ عَنْ رَسُولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم الْكَذِبَ" یہ وہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ کو دور کیا ہے۔ والیِ مدینہ نے نماز پڑھائی جنت البقیع میں دفن ہوئے جس کی خاک کو بڑے بڑے جلیل المرتبہ صحابہ وصحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجسام کا امانت دار ہونے کا شرف حاصل ہے۔

وفات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرنے کے لیے بلند مرتبت محدثین نے اُن کے مرثیے

لے تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۶ و ۱۸۷۔

لکھے جن میں سے ایک مرثیہ کے بعض اشعار یہ ہیں۔

ذهب العليم بعيب كلِّ محدث — وبكل مختلفٍ من الاسناد

وبكلّ وهمٍ في الحديث ومشكل — يعيى به علماء كل بلاد

ترجمہ:۔ اس محدث کا انتقال ہوگیا جو ہر محدث کے عیب سے اور اسانید کے اختلاف سے پوری طرح باخبر تھا۔ اور وہ اُن تمام مشکلات واوہام حدیث سے واقف تھا جن سے تمام جگہوں کے علماء عاجز آگئے تھے[1]

یحییٰ بن سعید القطان

نام ونسب یحییٰ نام، ابوسعید کنیت، ان کے دادا فروخ بنو تمیم کے غلام تھے۔

پیدائش سنہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بصرہ کے رہنے والے تھے۔

علم وفضل علم وفضل کے لحاظ سے ان کو تبع تابعین کی جماعت کا گلِ سر سبد کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام العلم" اور "سید الحفاظ" لکھتے ہیں[2] یحییٰ بن معین ایسے یگانۂ روزگار محدث کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن مہدی نے فرمایا "تم اپنی آنکھوں سے یحییٰ القطان جیسا کوئی شخص نہیں دیکھو گے"۔ علامہ نووی فرماتے ہیں "علماء نے ان کی امامت، جلالت، اور اُن کے حفظ اور علم وصلاح کی بہتات پر اتفاق کیا ہے"۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "یحییٰ القطان اپنی

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۸۶، ۱۸۷   [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۴۔

ایک ایک ادا کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر تھے[1]

حدیث | فن حدیث میں حضرت یحییٰ بن سعید کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ اہل عراق میں انہی کے دم سے فن حدیث کا چرچا ہوا۔ اُنہوں نے رواۃ کی تنقید اور اُن کی جرح و تعدیل کا خاص اہتمام کیا۔ اور پھر جو راوی ثقہ معلوم ہوئے صرف اُنہیں کی روایتوں کو رائج کیا، اور جو لوگ ضعیف ثابت ہوئے اُن کو ترک کر دیا[2]۔ امام احمد فرماتے ہیں "میں نے یحییٰ بن سعید سے کم خطا کرنیوالا کوئی نہیں دیکھا"۔ عجلی کا بیان ہے کہ یحییٰ کی حدیثیں بڑی صاف ستھری ہوتی تھیں اور وہ بجز ثقات کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے تھے[3]

اُنہوں نے جن اکابر اُمت سے استفادہ کیا تھا اُن میں سے بعض نام یہ ہیں یحییٰ بن سعید الانصاری، حنظلہ بن ابی سفیان، ابن عجلان، ابن جریج، سعید بن ابی عروبہ، ثوری ابن عیینہ، امام مالک، مسعر بن کدام، شعبہ، سلیمان التیمی، ہشام بن عروہ۔

حضرت شعبہ کے ساتھ اُن کو بڑی خصوصیت تھی۔ اپنے بیان کے مطابق کامل بیس برس تک وہ ان کی خدمت میں رہے تھے۔ اور ہر روز زیادہ سے زیادہ اُن سے تیرہ حدیثوں کی سماعت کرتے تھے۔ اس طویل ملازمتِ شیخ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اتنے بڑے محدث ہو گئے کہ کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تھا تو خود حضرت شعبہ اُن کو حَکم بناتے اور اُن کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ابنِ مہدی کہتے ہیں "ایک مرتبہ حضرت شعبہ کے سامنے کسی بات پر اختلاف ہو گیا۔ اس پر لوگوں نے کہا "آپ ہمارے اور اپنے درمیان کسی کو حَکم مقرر کر دیجیے

[1] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴ و ۱۵۵ ۔ [2] ایضاً ص ۱۵۵ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۵

حضرت شعبہ نے یحییٰ بن سعید القطان کا انتخاب کیا، چنانچہ حضرت یحییٰ تشریف لائے تو اُن کے سامنے اصل معاملہ پیش کیا گیا۔ اُنھوں نے اتفاق کی بات، فیصلہ خود حضرتِ شعبہ کے خلاف کیا لیکن حق پرستی و انصاف پسندی کی شان دیکھو، شعبہ شیخ و اُستاذ ہونے کے باوجود اس پر ذرا ناراض نہیں ہوئے، بلکہ فرمایا تو یہ کہ "اے احول (یحییٰ کی ایک آنکھ میں بھینگا پن تھا) تمہاری گمشدگی کو کون برداشت کرسکتا ہے"[1]

اُن کو حدیث سے انتہا درجہ شغف تھا، لیکن اُس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ذوقِ تنقید اتنا صحیح دیا تھا کہ صحیح و سقیم حدیثوں میں فوراً امتیاز کر لیتے تھے۔ ابن مہدی کا بیان ہے کہ میں نے حدیث کی طلب اور اُس کے قبول کرنے میں یحییٰ بن سعید القطان اور سفیان بن حبیب سے زیادہ اچھا کوئی شخص نہیں دیکھا" ابن المدینی کہتے ہیں "صرف تین شخص ایسے ہیں جنہوں نے حدیث طلب کی، اس کے ساتھ اعتنا کیا، اُس پر جمے رہے، اور ساری عمر اسی مقدس کام میں صرف کردی۔ ایک یحییٰ بن سعید القطان، دوسرے سفیان بن حبیب تیسرے یزید بن زریع"[2]

فن حدیث میں سب سے مشکل اور اہم مرحلہ علم اسماء الرجال کا ہے، اور ایک بڑی حد تک حدیث کی صحت و سقم کا دار و مدار اسی پر ہے۔ حضرت یحییٰ بن سعید کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ اُنہیں اس فن میں سب سے زیادہ کمال حاصل تھا۔ علی بن المدینی فرماتے ہیں "میں

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۳۶۔ اصل عبارت یہ ہے "من یستطیع فقدک" لیکن بعض کتابوں میں بجائے فقدک کے نقدک کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہونگے کہ تمہاری تنقید کو کون سہار سکتا ہے۔

[2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۳۸۔

نے یحییٰ القطان سے بڑا کوئی عالم علم رجال نہیں دیکھا، اسی طرح ابن مہدی سے زیادہ حدیث کے خطا و صواب کو جاننے والا کوئی نہیں ملا، پس یہ دونوں جس راوی کو ضعیف قرار دیدیتے ہیں میں اُس کو ترک کر دیتا ہوں اور جس راوی سے یہ دونوں روایت قبول کرتے ہیں میں بھی قبول کر لیتا ہوں[1]۔

حضرت یحییٰ بن سعید کے تثبت فی الحدیث پر سب کا اتفاق ہے۔ اثرم کا بیان ہے کہ میں نے مختلف مواقع پر امام احمد بن حنبل کو یہ کہتے سُنا ہے "کہ یحییٰ ابن سعید القطان کس درجہ قوی الحافظہ اور کتنے بڑے ثقہ تھے، وہ محدث تھے"۔ اور یہ فرما کر دیر تک اُن کی ثنا کرتے رہے۔ فضل بن زیاد کی روایت امام احمد سے متعلق یہ ہے کہ میں نے خود انہیں فرماتے سُنا ہے "اللہ کی قسم! ہم نے یحییٰ بن سعید القطان جیسا کوئی شخص نہیں پایا"۔ ایک اور مقولہ میں ارشاد فرماتے ہیں: "بصرہ میں حضرت یحییٰ بن سعید پر تثبت کی انتہا ہے[2]"۔

قوتِ حافظہ | علم الرجال میں کمال پیدا کرنے کے لیے قوتِ حافظہ کی سخت ضرورت ہے۔ قدرت کو جس سے جو کام لینا منظور ہوتا ہے، اُس کی فطرت میں اُسی کے مطابق قوٰی اور صلاحیتیں ودیعت رکھ دی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت قطان کا حافظہ بھی غیر معمولی طور پر قوی تھا۔ سلیمان بن الاشعث نے ایک دفعہ امام احمد سے پوچھا "کیا یحییٰ آپ کو اپنے حافظہ سے روایات سُناتے تھے؟" فرمایا "ہم نے اُن کے پاس کتاب نہیں دیکھی۔ اور وہ ہماری کتاب کی طویل طویل حدیثیں پڑھ دیا کرتے تھے"۔

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۷۔ [2] یہ سب مقولے تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۸ سے ماخوذ ہیں۔

بعض محدثین امتحاناً اُن کے سامنے تدلیس کر کے روایت کرتے تھے، لیکن وہ فوراً روایت کا سقم معلوم کر لیتے اور اُس پر متنبہ کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ امام ثوری نے ایک روایت کی سند اس طرح نقل کی "حدثنا ابو سھل عن الشعبی" حضرت یحییٰ نے فوراً کہا "یہ ابو سہل تو محمد بن سالم ہیں" ثوری یہ سُن کر حیران رہ گئے اور فرمایا "میں نے آپ جیسا کوئی نہیں دیکھا، آپ سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے"

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ محمد بن سالم جن کی کنیت ابو سہل تھی ایک ضعیف راوی تھا۔ اس کا نام محمد بن سالم مشہور و معروف تھا، مگر کنیت ابو سہل کوئی نہیں جانتا تھا حضرت ثوری نے اسناد بیان کی تو اس میں راوی کا نام لینے کے بجائے اُس کی کنیت ذکر کر دی اور خیال یہ کیا کہ حضرت یحییٰ بن سعید القطان کو راوی کی کنیت معلوم ہوگی نہیں اس لیے وہ اس اسناد پر کچھ نہ کہینگے اور شاید قبول کر لینگے۔ لیکن اُن کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ حضرت یحییٰ جو علم الرجال کے امام تھے، نام کی طرح اس راوی کی کنیت سے بھی باخبر تھے۔ چنانچہ انھوں نے سُنتے ہی فرما دیا کہ یہ ابو سہل تو محمد بن سالم ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور عجیب واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ابن مہدی کہتے ہیں، ایک مرتبہ مجھ سے حضرتِ سفیان نے فرمایا "تم کوئی ایسا آدمی لاؤ جس سے میں حدیث میں مذاکرہ کروں" یہ حضرت یحییٰ القطان کو لے کر پہنچ گئے، دونوں میں مذاکرہ دیر تک ہوتا رہا۔ جب حضرت یحییٰ یہاں سے فارغ ہو کر گھر تشریف لے گئے تو سفیان نے مجھ سے کہا کہ "ابن مہدی! میں نے تم سے کوئی انسان لانے کے لیے کہا تھا، لیکن تم بجائے انسان کے ایک جن لے آئے"۔ حافظ ذہبی

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت سفیان نے حضرت یحییٰ کے غیر معمولی قوتِ حافظہ سے مرعوب ہو کر یہ فرمایا تھا۔[1]

جلالت علم | اُن کے علمی تبحر اور کمالِ فضل کی وجہ سے زعماءِ اُمت اُن کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ بندار کہتے ہیں "وھو امام اھل زمانہ" امام نسائی فرماتے ہیں۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے اللہ کی طرف سے امانت دارتین بزرگ ہیں۔ امام مالک، شعبہ اور یحییٰ القطان[2]"۔ ابن سعد فرماتے ہیں "کان ثقۃ حجۃ رفیعا ماموناً"[3] خلیلی کا بیان ہے کہ وہ بلا کسی اختلاف کے مسلم امام تھے، اور بصرہ میں امام مالک کے اصحاب میں سب سے زیادہ جلیل القدر تھے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں" اِن سے تمام ائمہ نے احتجاج کیا ہے، اور انہوں نے کہا ہے کہ جو یحییٰ کو ترک کریگا ہم اُسے ترک کر دینگے[4]

اگرچہ بہ ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے وہ کچھ زیادہ وجیہ نہیں تھے اور دیکھنے میں ایک معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے، لیکن اُن کی علمی تمکنت ووقار کا یہ عالم تھا کہ وہ خود عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد ہی میں ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور بڑے بڑے اساطین علم حدیث جن میں علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین جیسے اکابر شامل ہوتے تھے۔ کھڑے کھڑے اُن سے حدیث کے متعلق استفسارات کرتے رہتے تھے[5] ابن عمار کا بیان ہے کہ میں حضرت یحییٰ القطان کی طرف دیکھتا تھا تو وہ بظاہر ایک بڑھئی معلوم ہوتے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۶ [2] ایضاً ص ۲۷۵ و ۲۷۶ [3] بحوالہ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۹

[4] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۲۰ [5] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۱۹۔

تھے۔ اور میں خیال کرتا تھا کہ کسی مسئلہ کی نسبت کیا کوئی تسلی بخش جواب دے سکینگے، لیکن جب وہ تقریر شروع کرتے تھے تو اعاظم فقہاء خاموش ہو کر اُسے سُنتے تھے۔[1]

تلامذہ | اُن کی شہرت سُن کر دور دور سے طلبائے علمِ حدیث اُن سے استفادہ کے لیے آتے تھے۔ جن میں بعض بڑے بڑے نامور محدثین ہوئے۔ اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

ابن مہدی، امام احمد بن حنبل، مسدد، ثوری، ابن عیینہ، یحییٰ بن معین، اسحاق بن راہویہ، ابو عبید القاسم بن سلام، ابو خیثمہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، عمرو بن علی، ابن مثنیٰ، ابن بشار۔[2]

خشیتِ ربانی | خوفِ خدا علماء کا خاص شعار ہے، حضرتِ یحییٰ القطان علم و فضل کے لحاظ سے جتنے بلند پایہ امام تھے، اُسی قدر خوفِ خدا بھی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، کوئی آیت جس میں قیامت کے دن کا ذکر، یا عذابِ الٰہی کا بیان ہوتا، سنتے تھے تو اُن پر لرزہ طاری ہو جاتا اور بعض اوقات فرطِ تاثر سے غشی بھی طاری ہو جاتی تھی۔ ابن مدینی کا بیان ہے کہ "ہم یحییٰ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے سورۂ دخان کی تلاوت شروع کر دی اُس کا سُننا تھا کہ حضرت یحییٰ پر بیہوشی طاری ہو گئی۔"[3] بندار کہتے ہیں "میں بیس سال تک برابر حضرتِ یحییٰ ابن معین کی خدمت میں آتا جاتا رہا، میں گمان نہیں کرتا کہ اُنھوں نے کبھی کوئی گناہ کیا ہو۔"[4] زہیر بن حرب کہتے ہیں "ہم ایک دفعہ حضرت یحییٰ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں محمد بن سعید الترمذی آ گئے، حضرتِ یحییٰ نے اُن سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی، اُنھوں نے تلاوت جو شروع کی تو یحییٰ

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۴۰ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۶
[4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۵۔

پر غشی چھا گئی یہاں تک کہ اسی حالت میں اُن کو گھر پہنچایا گیا۔[1] یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ حضرت یحییٰ القطان قرآن مجید کے سُننے کی تاب ہی نہیں لا سکتے تھے جب اُن کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت ہوتی تھی وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کا مُنہ زمین سے لگ جاتا تھا۔[2]

عبادت اس خشیت ربانی کی وجہ سے وہ عبادت بھی زیادہ کرتے تھے، قرآن مجید کی تلاوت سے بڑا شغف تھا۔ بیس سال تک اُن کا یہ معمول رہا کہ پوری شب میں ایک قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔[3] نماز باجماعت کے اتنے پابند تھے کہ چالیس سال کی مدت میں کبھی ایک مرتبہ بھی اُن سے جماعت فوت نہیں ہوئی۔ پنجوقتہ نمازوں کے علاوہ نمازِ چاشت کے بھی اتنے پابند تھے کہ چالیس سال تک کبھی ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ اُنہوں نے نماز چاشت مسجد میں ادا نہ کی ہو۔[4] اُن کے ہاتھ میں ایک تسبیح رہتی تھی جس سے وہ برابر ذکر اللہ کرتے رہتے تھے۔

تسلیم و رضا کمالِ عبدیت یہ ہے کہ انسان خوشی اور غم صحت اور مرض دونوں حالتوں میں خداوند تعالیٰ کی رضامندی اور اُس کی مشیت پر صابر و شاکر رہے اور کسی حالت میں بھی اپنے لبوں کو حرفِ شکایت سے آشنا نہ ہونے دے۔ اس لحاظ سے بھی حضرت یحییٰ پیکرِ تسلیم و رضا اور مجسمہ صبر و وفا تھے۔ بیماری میں اگر بسبیل عیادت اُن سے کہتا "عافاك الله" خدا آپ کو شفا عطا فرمائے۔ تو وہ اُس کے جواب میں کہتے "جو بیماری خدا کی مرضی سے آئی ہے۔ میں بھی اُس پر خوش اور رضامند

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۴۱۔
[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۵۔
[3] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴۔
[4] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴۔

ہوں گے۔[1]

متانت و سنجیدگی | خدا کی جلالت و عظمت کا تصور ہر وقت اُن پر طاری رہتا تھا، اس لیے وہ ہمیشہ بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے پوتے احمد بن محمد کا بیان ہے کہ میرے دادا کبھی نہ مذاق کرتے تھے، نہ ہنستے تھے۔ انہوں نے کبھی قہقہہ نہیں لگایا، ایسی ہی کوئی بات ہوئی تو زیادہ سے زیادہ متبسم ہو جاتے تھے، وہ کبھی حمام میں داخل نہیں ہوئے، کبھی سرمہ نہیں لگایا، اور نہ کبھی بالوں کو کسی تیل سے مہکایا۔ البتہ ہاں خضاب عمدہ قسم کا استعمال کرتے تھے۔[2]

قناعت | ان تمام اوصافِ حسنہ کا لازمی نتیجہ قناعت ہے۔ چنانچہ اُن میں یہ وصف بھی بدرجۂ اتم موجود تھا، محمد بن ابی صفوان کا بیان ہے کہ حضرت یحییٰ کے گھر میں جو غلہ آجاتا تھا وہ اُس پر ہی قناعت کرتے اور اُسی سے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ گیہوں آگئے تو وہی کھالیے، جَو مہیا ہو گئے تو اُنہی پر اکتفا کرلیا، اور کبھی فقط کھجوریں آگئیں تو اُنہی پر بس کرتے تھے۔[3]

رقتِ قلب | اُن کا قلب نہایت رقیق اور کمزور تھا، ابن معین فرماتے ہیں "یحییٰ القطان ضعیف القلب تھے۔ ایک دفعہ اُن کے پڑوسی میں اور خود اُن میں کسی بات پر نزاع ہو گیا، پڑوسی نہایت دریدہ دہن اور گستاخ زبان تھا، غصہ میں حضرت قطان کو بُرا بھلا کہہ بیٹھا۔ حضرت یحییٰ رونے لگے اور اس حالت میں بار بار فرماتے تھے "ہاں یہ سچ تو کہتا ہے، میں بھلا ہوں کون؟ اور کیا ہوں؟"

حضرت یحییٰ کے ساتھ عام طور پر لوگوں کو جو عقیدت و ارادت تھی اُس کا اندازہ اس سے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۲۰ [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۴۱ [3] ایضاً ص ۱۴۲۔

ہو سکتا ہے کہ اُن کی زندگی میں ہی۔ اور اُن کی وفات کے بعد بھی متعدد لوگوں نے ایسے خواب دیکھے جن سے حضرت یحییٰ کی بلندی مرتبت، آخرت میں اُن کا علوِ مقام، خدا کی بے پایاں مغفرت و بخشش، اور آخرت کی پکڑ سے اُن کی نہایت عزت و وقعت کے ساتھ خلاصی و رستگاری متبادر ہوتی ہے[1]۔

وفات ماہِ صفر ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

سفیان بن عیینہ

نام و نسب سفیان نام ابو محمد کنیت والد کا نام عیینہ تھا، اصل وطن کوفہ تھا، پھر مکہ میں رہنے لگے تھے۔ انکے دادا ابو میمون عمارۃ ضحاک کے بھائی محمد بن مزاحم کو غلام تھے۔ سفیان کا خاندان ہمہ خانہ آفتاب تھا، یہ سب نو بھائی تھے جن میں سے حضرت سفیان سمیت پانچ محدث ہوئے۔ سفیان ۱۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت اپنی تعلیم کے بارے میں حضرت سفیان خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے چار برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا تھا، ساتویں برس حدیثیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ پھر جب میں پندرہ سال کا ہوا تو میرے والد نے مجھ سے کہا "بیٹے! اب تم سے بچوں کے احکام منقطع ہو گئے ہیں تمہیں علم حدیث کی تکمیل کے لیے علماءِ حدیث کی خدمت میں رہنا چاہیے اور اسے خوب یاد رکھو کہ علماء سے وہی شخص استفادہ کر سکتا ہے جو اُن کی اطاعت کرے پس تم اُن کی اطاعت کرو تو

[1] اس طرح کے کئی خواب تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۴۲، ۱۴۴ پر مذکور ہیں [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۷۶

سعادت اندوز ہوگے اور اُن کی خدمت کروگے تو اُن کے علم سے استفادہ کرسکوگے۔ سفیان کہتے ہیں "میں اپنے والد کی نصیحت پر ہمیشہ کاربند رہا اور کبھی اس سے عدول نہیں کیا[1]۔"

علم و فضل | حضرت سفیان کے ذوق و شوق اور سعادتمندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم تفسیر و حدیث کے بڑے امام ہوگئے یہاں تک کہ بڑے بڑے ائمہ نے اُن کی جلالتِ شان کو تسلیم کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے تھے "اگر امام مالک اور سفیان نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا[2]۔" امام نووی لکھتے ہیں "اُن کی امامت، جلالتِ شان اور عظمت پر سب کا اتفاق ہے[3]۔" امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "میں نے ابن عیینہ سے بڑا کوئی عالم سُنن نہیں دیکھا[4]۔" ابنِ عماد الحنبلی انہیں "شیخ الحجاز و احد الاعلام" لکھتے ہیں۔ ابن ناصر الدین کہتے ہیں "سفیان امام عالیمقام اور حرم محترم کے محدث تھے[5]۔"

تفسیر | آپ تفسیر قرآن میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ عبدالرحمن بن مہدی سے کسی نے پوچھا "سفیان ثوری اور ابن عیینہ میں کیا فرق ہے؟" بولے "ان دونوں میں بھلا کیا موازنہ ہو سکتا ہے، ابن عیینہ کو معرفت قرآن، تفسیر، حدیث اور متفرق حروف کی تحقیق میں وہ مقام حاصل ہے جو ثوری کو میسر نہیں ہے۔" ابن وہب کہتے تھے "میں نے سفیان بن عیینہ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآنِ مجید کا عالم نہیں دیکھا[6]۔"

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۱۹ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۴

[4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۴ [5] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۵۲، ۱۵۳۔

حدیث | حدیث اُن کا خاص فن تھا اس کی تحصیل اُنہوں نے امام ابن شہاب زہری اور عمرو بن دینار سے خاص طور سے کی تھی ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت سفیان نے جن محدثین سے روایت کی ہے اُن میں چند نام یہ ہیں :۔

ابو اسحاق السبیعی ، زیاد بن علاقہ ، ابراہیم ، موسیٰ ، اور محمد بنی عقبہ ، اسمٰعیل بن اُمیہ ایوب بن ابی تمیمۃ السختیانی ، یزید بن ابی بردہ ، حمید الطویل ، ابو حازم بن دینار ، سلیمان التیمی ، سلیمان الاحول ، صالح بن کیسان ، صالح بن صالح بن حی ، صفوان بن سلیم ، ان کے علاوہ بیشمار محدثین ہیں جن سے حضرت سفیان نے روایت کی ہے[۱]۔

ابن عیینہؒ نے حدیث کی تحصیل اتنی کم عمری میں شروع کردی تھی کہ امام زہری فرماتے تھے "میں نے حدیث کا طالب سفیان سے کم عمر نہیں دیکھا[۲]" سولہ برس کی عمر سے انہوں نے امام زہری کی ملازمت شروع کردی تھی پھر اپنی محنت ، ذاتی شوق اور ذہانت وقوتِ حافظہ کی وجہ سے تلامذۂ زہری میں انہوں نے وہ مقام حاصل کیا کہ سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہوگئے ۔ ابنِ مدینی کا بیان ہے کہ زہری کے اصحاب میں ابنِ عیینہ سے بڑھ کر کوئی اور معتمد اور ثقہ نہیں ہے[۳]۔

اجلۂ علماء کا اعتراف | حضرت سفیان کو حدیث میں جو مرتبۂ عظیم حاصل ہے بڑے بڑے ائمۂ فن نے اس کا اعتراف کیا ہے ۔ بشر بن المفضل کہتے تھے "اب زمین پر کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہا ہے جو سفیان بن عیینہ کے مثل ہو" امام شافعی کا ارشاد ہے " امام مالک اور سفیان دونوں حدیث میں

[۱] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۱۸ [۲] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۷۶ [۳] ایضاً

ترین ہیں" یحییٰ بن سعید نے ابن مدینی سے بیان کیا کہ "اب ابن عیینہ کے سوا اساتذۂ حدیث میں کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ اس پر ابن مدینی نے پوچھا "اے ابو سعید! کیا سفیان حدیث میں امام ہیں؟ فرمایا" وہ تو چالیس برس سے امام ہیں" عجلی کا قول ہے۔" سفیان کوفی ہیں معتمد ہیں حدیث میں ثبت ہیں، اُن کی حدیثیں حسن ہوتی ہیں اور اُن کا شمار حکمار اصحاب حدیث میں ہے" عثمان دارمی کہتے ہیں۔" ایک مرتبہ میں نے ابن معین سے دریافت کیا کہ آپ کو عمرو بن دینار کے شاگردوں میں ابن عیینہ زیادہ پسند ہیں یا ثوری؟ کہا "عمرو بن دینار کی معرفت ابن عیینہ کو ثوری سے زیادہ حاصل ہے" پھر دریافت کیا "حماد بن زید کے متعلق کیا رائے ہے؟" بولے "ابن عیینہ کو اُن سے بھی زیادہ علم ہے" اس کے بعد اُنھوں نے حضرت شعبہ کی نسبت دریافت کیا تو فرمایا" ابن عیینہ اُن سے بھی بڑے عالم ہیں"۔ ابن مہدی کہتے ہیں" ابن عیینہ اہل حجاز کی حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے"۔ ابو حاتم الرازی کا بیان ہے کہ" ابن عیینہ ثقہ امام ہیں اور امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک اور ابن عیینہ سب سے زیادہ ثقہ او رمعتبر ہیں[1]

فقہ | حضرت سفیان فقہ میں بھی مجتہدانہ نظر رکھتے تھے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں

مارأیت احدًا من الفقہاء اعلم بالقرآن والسنن منہ[2]	میں نے فقہا میں سے کسی شخص کو ابن عیینہ سے زیادہ قرآن وسنن کا عالم نہیں دیکھا۔

لیکن اس کے باوجود احتیاط کا یہ عالم تھا کہ فتویٰ دینے سے اجتناب کرتے تھے! امام شافعی فرماتے ہیں۔

---

[1] یہ سب اقوال تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۰، ۱۲۱ اور تاریخ بغدادی ج ۹ سے ماخوذ ہیں۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۱

مَارأیتُ احدًا من الناس فیہ جزالۃ العلم ما فی ابن عیینہ وما رأیتُ احدًا أنفَ عن الفتیا منہ[1]

میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس میں علم کی بہتات ایسی ہو جیسی ابن عیینہ میں ہے اور میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو ابن عیینہ سے زیادہ فتوے سے اجتناب کرنے والا ہو۔

مرجع خلائق — ان کمالاتِ علم و فضل کی وجہ سے حضرت ابنِ عیینہ عوام و خواص کے مرجع ہو گئے تھے مسعر بن کدام نے ان سے جبکہ یہ ابھی نوعمر ہی تھے درس حدیث کی فرمائش کی اُنہوں نے عذر کرتے ہوئے کہا "میں تو ابھی نوعمر ہوں" مسعر بولے "تمہارے پاس امام زہری اور عمرو بن دینار موجود ہیں[2]" پھر حضرت سفیان نے درس شروع کیا تو لوگوں کی کثیر تعداد اس کی سماعت کے لیے حاضر ہونے لگی چنانچہ حافظ ابن حجر نے آپ کے تلامذہ کے نام ایک صفحہ میں لکھے ہیں جن میں بعض بڑے بڑے امام وقت بھی ہیں لیکن آپ کی فروتنی اور انکسارِ نفس کا یہ عالم تھا کہ اس مجمع کثیر کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتے تھے۔

خَلَتِ الدِّیَارُ فَسُدْتُ غیرَ مُسَوَّدِ ومِنَ الشَّقَاءِ تَفَرُّدِی بِالسُّؤْدَدِ[3]

ترجمہ:- دیار خالی ہو گئے ہیں اس لیے میں بغیر کسی کے سردار بنائے ہوئے خود سردار بن گیا ہوں اور یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں سرداری میں تنہا ہوں۔

دور دراز کے لوگوں کو آپ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق رہتا تھا کہ آپ مکہ میں اقامت گزین ہو گئے تھے اور ہر سال حج کرتے تھے تو اس موسم میں دور دراز سے اور لوگ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۰ [2] خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۷۶۔ [3] ایضاً ص ۱۷۸۔

بھی بکثرت حج کرنے کرتے تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

والباعث لھم لقی ابن عیینہ　　اور ان کے لیے بڑا باعث ابن عیینہ سے ملاقات کا جذبہ

فیزدحمون علیہ فی ایام الحج۔　　تھا چنانچہ حج کے زمانہ میں ان کے پاس لوگوں کا بہت ہجوم ہوتا[1]

زہد و ورع | علمی کمالات کے ساتھ زہد و اتقاء کے لحاظ سے بھی سب معاصرین میں ممتاز تھے ابو یوسف الغسولی بیان کرتے ہیں "میں ایک مرتبہ حضرت سفیان کے پاس گیا تو دیکھا کہ ان کے سامنے جو کی دو ٹکیاں رکھی ہوئی ہیں۔" مجھ کو دیکھ کر فرمانے لگے "چالیس سال سے میری غذا یہی ہے"[2]

ابن حبان کہتے ہیں "سفیان معتبر حفاظ حدیث اور ارباب ورع و دین میں سے ہیں" لالکائی کا بیان ہے "سفیان اپنے تثبت اور اتقان کی وجہ سے تزکیہ سے مستغنی ہیں"[3]

عبادت | عبادت گذار بھی بہت تھے خصوصاً حج کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں ان کے والد ایک مرتبہ اپنے ساتھ کوفہ سے مکہ معظمہ حج کے لیے لائے تھے۔ اس کے بعد تو ان کا تانتا بندھ گیا یہاں تک کہ انھوں نے ستر حج کیے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر مرتبہ حج کرنے کے بعد دعا کرتے تھے کہ "اے اللہ تو اس حج کو آخری حج نہ بنا" ان کی یہ دعا قبول ہوتی تھی اور اس کے بعد بھی انہیں حج کا موقع ملتا تھا۔ آخری مرتبہ حج کرنے کے بعد انہیں پھر یہ دعا مانگتے ہوئے شرم آئی چنانچہ انہیں اس کے بعد حج کا نہیں ملا۔[4]

جلالت شان | حضرت سفیان کی اس جلالت شان کی وجہ سے خلیفۂ وقت تک ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ ابو الربیع کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ ہارون الرشید امیر المومنین سے ملا تو اس نے

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۴　[2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۲۲　[3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۵۔

پہلے ہاشمی علوئین کا حال پوچھا پھر کہنے لگا "سید الناس کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا "امیر المؤمنین! آپ کے سوا اور کون سید الناس ہے؟ بولا "سفیان بن عیینہ سید الناس ہیں"۔[1]

مقولے | حضرتِ سفیان کم بولتے تھے لیکن جب بولتے تھے تو اُن کی باتیں حکمت و پند کا گنجینہ ہوتی تھیں چنانچہ اُن کے بعض مقولے یہ ہیں۔

(۱) جس آدمی کی عقل زیادہ ہوتی ہے اُس کا رزق کم ہوتا ہے۔

(۲) زہد دراصل صبر ہے اور موت کا انتظار۔ اور علم اگر تم کو نفع نہ پہنچائے تو وہ نقصان پہنچائیگا۔[2]

وفات | ۳۰۔ جمادی الاخریٰ ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ ابن مناذر نے مرثیہ کہا جس میں ایک شعر یہ ہے۔

من کان یبکی رجلاً هالکاً ۔ فلیبك للاسلام سفیانا

ترجمہ:۔ جو شخص کسی مرنے والے پر روئے اُسے چاہیے کہ اسلام کی خاطر سفیان پر بھی اشک بہائے۔

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۱۷۹ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۳

محمد بن الحسن الشیبانی

نام و نسب محمد نام ابو عبداللہ کنیت، والد کا نام حسن تھا قبیلۂ بنو شیبان کے غلام تھے، اس لیے شیبانی کہلاتے تھے۔ دمشق کے اطراف میں ایک گاؤں ہے جس کا نام حرستا تھا۔ امام محمد کے والد یہیں کے رہنے والے تھے، یہ شامی لشکر میں ملازم تھے۔ اسی سلسلہ میں کچھ مدت تک واسطہ میں قیام کرنا پڑا، یہیں امام محمد ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے[1]

تعلیم و تربیت کوفہ میں تعلیم و تربیت پائی، اس زمانہ میں کوفہ نحو و ادب، تفسیر و حدیث اور فقہ کا گہوارہ تھا۔ امام محمد میں شوق و ذوق اور تحصیل علوم کی استعداد فطری تھی۔ پھر ان کے والد نے انتقال کے وقت تیس ہزار درہم چھوڑے تھے۔ امام محمد نے یہ سب روپیہ اپنی تعلیم پر خرچ کر دیا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں "میں نے پندرہ ہزار درہم نحو اور شعر و ادب کی تعلیم پر خرچ کیے۔ اور پندرہ ہزار درہم حدیث اور فقہ کی تعلیم پر"[2]

علم و فضل امام محمد نے باپ کا چھوڑا ہوا تمام اثاثہ اپنی تعلیم پر خرچ کر دیا، لیکن اس کے بدلہ میں اُن کو اقلیم علم و فضل کی وہ کشور کشائی ملی جو دنیا کے کم سعادتمند لوگوں کے حصہ میں آتی ہے اُن کی علمی فضیلت کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ امام شافعی فرماتے ہیں "میں نے امام محمد سے ایک اونٹ کے بوجھ کی برابر علم حاصل کیا ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کی اتنی راہیں

[1] کتاب الانساب للسمعانی ص ۳۴۲ [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۳۔

نہ لکھتیں جتنی کہ اب لکھی ہیں[1]۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، شعر، بلاغت اور نحو ان تمام علوم میں اُن کو یکساں کمال حاصل تھا۔ اور اُن پر یہ مصرع پورے طور پر صادق آتا ہے۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

تفسیر قرآنِ مجید کے حقائق و معانی کے درک و فہم میں اُن کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ امام شافعی فرماتے ہیں "میں نے امام محمد سے بڑا کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا" اسی طرح کا ایک مقولہ ابو عبید سے منقول ہے[2]۔

حدیث حدیث میں انہوں نے حضرت مسعر بن کدام، سفیان ثوری، عمرو بن ذر، مالک بن مغول، امام مالک بن انس، ابو عمرو الاوزاعی، زمعہ بن صالح، اور بکیر بن عامر، وغیرہم سے استفادہ کیا تھا۔ لیکن امام مالک سے اُن کو بڑی خصوصیت تھی۔ خود اُن کا بیان ہے کہ میں تین سال سے کچھ اوپر تک امام مالک کی صحبت میں رہا ہوں اور میں نے اُن سے سات سو سے زیادہ حدیثیں سُنی ہیں۔ امام مالک کے ساتھ اس خصوصیت کے رکھنے کے باعث امام محمد امام مالک کی روایتوں کے بہترین حافظ اور امانتدار سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ وہ جب کبھی اپنی مجلس میں امام مالک کی روایتیں بیان کرنے کا اہتمام کرتے تھے لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ جگہ ناکافی ثابت ہوتی تھی۔ امام محمد طبعاً اس چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ان لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا "تم لوگ اپنے اصحاب کے حق میں کتنے بُرے ہو میں جب امام مالک کی روایتیں بیان کرتا ہوں تو تمہارا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ جگہ تنگ ہو جاتی ہے لیکن جب میں خود تمہارے اصحاب کی روایات

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳ [2] ایضاً ص ۳۲۲ [3] تاریخ بغدادی ج ۲ ص ۱۷۵۔

بیان کرتا ہوں تو تم بادلِ ناخواستہ ہی اُس درس میں شریک ہوتے تھے۔ بغداد کے قیام میں مستقلاً درسِ حدیث دیتے تھے۔

تلامذہ | اُن کے تلامذہ کی تعداد بہت وسیع ہے اور اُن میں وقت کے بڑے بڑے امام شامل ہیں جن میں سے چند کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:۔

امام شافعی، ابو سلیمان الجوزجانی، ہشام بن عبید اللہ الرازی، ابو عبید القاسم بن سلام، اسمٰعیل بن توبہ، علی بن مسلم الطوسی۔ ابو حفص کبیر، محمد بن سماعۃ، عیسیٰ بن ابان، محمد بن مقاتل، موسیٰ بن نصیر

فقہ | اگرچہ وہ مذہب اور لغت کے تمام علوم میں یکساں کمال رکھتے تھے لیکن ان کی زیادہ تر شہرت فقیہ کی حیثیت سے ہے۔ فقہ میں وہ امام ابو حنیفہ اور قاضی ابو یوسف رحمہا اللہ کے شاگرد تھے۔ مہارتِ فن اور وسعتِ نظر کی وجہ سے اُن سے خواہ کتنا ہی مشکل کوئی مسئلہ پوچھا جاتا وہ بڑی خندہ پیشانی اور کشادگیِ قلب کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ امام شافعی کا بیان ہے "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس سے کوئی مشکل مسئلہ پوچھا جائے اور اُس کے تیوروں پر بل نہ پڑے، البتہ ہاں امام محمد اس سے مستثنیٰ ہیں[1]" ایک دوسرے مقولے میں فرماتے ہیں "میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو حلال اور حرام، اور علل اور ناسخ و منسوخ کے علم میں محمد بن الحسن سے بڑھ کر ہو، اگر لوگ انصاف کی نظر سے دیکھیں تو اُن کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ انہوں نے محمد بن الحسن ایسا کوئی نہیں دیکھا۔ میں نے کبھی کوئی فقیہ ایسا نہیں دیکھا جو فقہ میں امام محمد سے زیادہ مہارت و بصیرت رکھتا ہو۔ اور اُس کی زبان فقہ کے مسائل پر گفتگو کے وقت تیزی سے چلتی ہو۔ امام محمد کو فقہ اور اُس کے اسباب پر عبور حاصل

---

[1] خلیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۳ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵۴۔

ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے مشکل مسائل کے حل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی جن سے اکابر تک عاجز رہتے تھے۔

تفقہ کی پرکھ میں امام شافعیؒ سے زیادہ اور کس کا قول درخور تسلیم و پذیرائی ہو سکتا ہے۔ ایک موقع پر کسی نے اُن سے دریافت کیا "آپ نے امام مالکؒ کو دیکھا ہے اور ان سے سماعت بھی کی ہے۔ اور دوسری جانب آپ نے امام محمد بن الحسنؒ کے ساتھ بہت دنوں تک رفاقت کی ہے۔ آپ کے نزدیک ان دونوں میں کون بڑا فقیہ ہے؟" ارشاد ہوا "محمد بن الحسن افقہ نفساً منہ" محمد بن الحسن باعتبار نفس کے اُن سے بڑے فقیہ ہیں[1]۔ ابو عبید کہتے ہیں "میں ایک دفعہ امام محمد بن الحسنؒ کے پاس آیا تو دیکھا کہ امام شافعیؒ اُن کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور کوئی مسئلہ دریافت کر رہے ہیں۔ امام محمدؒ نے اُس سوال کا جواب دیا تو امام شافعیؒ نے اُس کو بہت پسند کیا اور فوراً لکھ لیا[2]۔"

نکتہ شناسی امام محمدؒ اگرچہ فربہ اندام تھے لیکن نہایت ذکی تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "میں نے امام محمدؒ کے علاوہ کوئی فربہ اندام شخص اس غضب کا ذکی نہیں دیکھا۔ ان کے کمالِ تفقہ میں اس ذکاوت کا بڑا دخل تھا جس کی وجہ سے وہ مشکل سے مشکل مسئلہ میں عجیب و غریب نکات پیدا کر دیتے تھے۔ مجاشع بن یوسف کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ مدینہ میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، وہ اُس زمانہ میں فتویٰ دیتے تھے۔ اتنے میں امام محمد بن الحسنؒ جو اُس وقت نوجوان تھے، آئے اور پوچھنے لگے کہ آپ اُس ناپاک (جنبی) آدمی کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس کو

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۲ و ۳۲۳ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔

پانی سوائے مسجد کے اور کہیں نہ ملے، اور پھر پانی بھی مسجد کے اندرونی حصّہ میں ہو۔ امام مالک بولے۔ "یہ جنبی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا" امام محمد نے فرمایا "نماز کا وقت آگیا ہے اور پانی سامنے ہی موجود ہے، ایسی حالت میں اس کو کیا کرنا چاہیے؟" امام مالک نے پھر وہی جواب دیا، اور اس پر امام محمد نے وہی فرمایا، جو پہلے فرما چکے تھے۔ آخرکار امام مالک نے کہا " اچھا تو آپ بتلائیے، آپ اس اشکال کا حل کس طرح کرینگے؟" امام محمد بولے" اس جنبی کو تیمم کر کے مسجد میں داخل ہونا چاہیئے اور پھر وہاں سے پانی لے کر غسل کرنا چاہیے" یہ سُن کر امام مالک نے پوچھا " آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" ارشاد ہوا۔"من اهل هٰذہ" یہاں کے لوگوں میں سے ہوں" امام مالک نے فرمایا" اہل مدینہ میں تو کوئی ایسا نہیں ہے جس کو میں نہ جانتا ہوں"۔ امام محمد بولے " کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کو آپ نہیں جانتے"۔ اس گفتگو کے بعد امام محمد اُٹھ کر مجلس سے چلے آئے تو امام مالک سے لوگوں نے بیان کیا کہ یہ صاحب محمد بن الحسن صاحب ابی حنیفہ تھے۔ امام مالک نے فرمایا" بھلا امام محمد کس طرح جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ابھی اُنہوں نے یہ کہا ہے کہ میں مدینہ کے لوگوں میں سے ہوں۔ لوگوں نے عرض کی "نہیں حضرت! اُنہوں نے هٰذہ کہہ کر زمین کی طرف اشارہ کیا تھا اور مراد یہ تھی۔ میں اس زمین کے لوگوں میں سے ہوں" امام مالک کو یہ سُن کر سخت تعجب ہوا اور اُنہوں نے فرمایا" هٰذا اشدُّ علَیَّ من ذاك"[1]

امام محمد کے کمالِ تفقہ کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ امام شافعی ایسا مسلمہ روزگار امام فقہ صاف لفظوں میں اعتراف کرتا تھا کہ "آمن الناسِ علیَّ فی الفقہِ محمد بن الحسن" ایک مرتبہ ایک

---

[1] یعنی یہ تو میرے لیے اور بھی زیادہ پشیمانی کی بات ہے (تاریخ بغدادی ج ۲ ص ۱۷۵

شخص امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوا اور کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام عالیمقام نے اس کا جواب دے دیا تو وہ شخص بولا "اس مسئلہ میں فقہاء تو آپ کے خلاف ہیں"۔ آپ نے فرمایا "تم نے کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ البتہ ہاں اگر تم نے محمد بن الحسن کو دیکھا ہے تو اُن کی بات اور ہے۔ وہ آنکھوں اور دلوں میں سما جاتے تھے[1]"

قضاء اس کمالِ تفقہ کے باعث ہی ہارون رشید نے اُن کو رقہ کا قاضی بنا دیا تھا۔ ایک مدت تک وہ اس فرضِ منصبی کو انجام دیتے رہے، لیکن معلوم نہیں کیا سبب ہوا کہ بعد میں معزول کر دیے گئے[2]۔

فصاحت تمام علمی اور دماغی کمالات کی کنجی حسنِ بیان و تقریر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بڑے بڑے اربابِ کمال گمنامی کے گوشہ میں پڑے رہتے ہیں اور اُن کو اُبھرنے اور نمایاں ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ امام محمد کی ذات ستودہ صفات اس کمال سے بھی حصّہ وافر رکھتی تھی۔ اُن کو عربیت کے تمام علوم پر ایسا ہی عبور تھا، جیسا تفسیر، حدیث اور فقہ پر۔ اُن کی تقریر فصاحت و بلاغت کے تازہ و شگفتہ پھولوں کا سدا بہار گلدستہ ہوتی تھی۔ امام شافعی فرماتے ہیں "میں نے امام محمد سے بڑا کوئی فصیح نہیں دیکھا۔ وہ جب کلام کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ قرآن اُن کی زبان میں نازل ہوا ہے[3]۔"

جوشِ تقریر جب کسی اہم موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو نہایت جوش و خروش اور پوری قوت کے ساتھ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی مسئلہ پر امام شافعی سے مذاکرہ کر رہے تھے کہ تقریر کرتے کرتے جوش و خروش سے بھرپور ہو گئے۔ یہاں تک کہ اُن کی رگیں پھول گئیں، آواز بلند ہو گئی، باریک کپڑے زیبِ

۱؎ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۶، ۲؎ ایضاً ص ۱۷۰، ۳؎ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵۴۔

تن تھے۔ اُن کا کوئی مٹن ایسا نہ تھا جو ٹوٹ نہ گیا ہو۔[1]

درس | امام محمد نے نوعمری میں ہی وہ کمال پیدا کر لیا تھا کہ خلائق کا مرجع بن گئے تھے۔ ابھی بیس سال کے ہی تھے کہ کوفہ کی مسجد میں درس دیتے تھے۔[2]

حسن و جمال | معنوی حسن کے ساتھ قدرت نے اُن کو ظاہری اور صوری حسن و جمال سے بھی بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ علامہ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں "وکان من اجمل الناس واحسنہم" اُن کے حسن و جمال کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ امام محمد کے والد اُن کو تعلیم کی غرض سے لے کر امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو امام صاحب نے امام محمد کا غیر معمولی حسن و جمال دیکھ کر فرمایا "تم اپنے لڑکے (محمد) کا سر مونڈ دو اور بوسیدہ کپڑے پہناؤ تاکہ اُن کو دیکھنے والے فتنہ میں مبتلا نہ ہوں" امام محمد کے والد نے فوراً حکم کی تعمیل کی لیکن لعل ہوتا ہے تو گدڑی میں بھی چمکتا ہے۔ اس ہیئت و لباس نے امام محمد کے حسن کو اور چمکا دیا۔

رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

خود امام ہمام کے الفاظ یہ ہیں "فزدت عند الخلق جمالاً"[3]

علمی انہماک | کوئی علمی کام اطمینان کے ساتھ اُس وقت تک انجام پذیر نہیں ہو سکتا جب تک خانگی معاملات سے یکسو ہو کر ہمہ تن اس میں انہماک نہ ہو مشہور مقولہ ہے "العلم لا یعطیک بعضہ حتی لا تعطیہ کلک" اس بنا پر امام محمد نے اپنے گھر کا تمام انتظام ایک منیجر کے سپرد کر رکھا تھا اور اہل خانہ کو ہدایت کر دی تھی کہ تم کو جس کسی چیز کی ضرورت ہو میرے وکیل سے لے لینا، پھر

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۲ ص ۱۷۷ [2] ایضاً ص ۱۷۴ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳

آپ نے فرمایا "فَإِنَّهُ أَقَلُّ لِهَمِّي وَأَفْرَغُ لِقَلْبِي"[1]

تصنیفات | ان کی یکسوئی اور خانگی امور سے اس فارغ البالی کا ہی نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے درس و تدریس اور افتاء و قضا کی چند در چند مصروفیتوں کے باوجود متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں جو آج تک اسلامی فقہ کی بنیاد کا کام دے رہی ہیں۔ امام عالیمقام کی مشہور تصنیفات یہ ہیں:۔

المبسوط، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الکبیر، السیر الصغیر، الزیادات جو عموماً ظاہر الروایۃ والاصول کے نام سے معروف ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ فقہ میں الرقیات، الہارونیات، الکیسانیات، الجرجانیات۔ اور حدیث میں کتاب الآثار، اور مؤطا امام محمد بھی آپ کی تصنیف ہیں[2]۔ مولانا عبدالحیی لکھنوی مرحوم نے مؤطا امام محمد کے مقدمہ میں ان تصنیفات پر بڑی تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے اور التقدمۃ شرح المقدمۃ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کی تصنیفات کی تعداد نو سو ننیانوے ہے اور یہ سب کتابیں وہ ہیں جو علوم دینیہ میں لکھی گئیں۔ ابو علی الحسن بن داؤد کہتے ہیں کہ اہل بصرہ کو چار کتابوں پر فخر و ناز ہے، کتاب البیان والتبیین للجاحظ، کتاب الحیوان، کتاب سیبویہ اور کتاب الخلیل فی العین لیکن ہم اہل کوفہ کو ان ستائیس ہزار حلال و حرام کے مسائل پر ناز ہے جو ایک کوفہ کے ہی جلیل القدر عالم یعنی امام محمد بن الحسن نے بیان کیے ہیں۔ یہ سب مسائل قیاسی اور عقلی ہیں اور اس قدر ضروری ہیں کہ لوگوں کو ان سے بے خبر نہ رہنا چاہیے۔ امام محمد کی تصنیفات کی عظمت و وقعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ کسی شخص نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا "آپ کو ایسے ایسے دقیق مسئلے کہاں سے معلوم ہوئے؟" فرمایا "محمد بن الحسن کی کتابوں سے"[3]

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۷۔ [2] الفوائد البہیہ ص ۱۶۳۔ [3] بغدادی ج ۲ ص ۱۷۷

امام شافعی فرماتے ہیں "امام محمد بن الحسن میرے نزدیک ہمیشہ عظیم المرتبت رہے ہیں۔ میں نے ان کی کتابوں پر ساٹھ دینار خرچ کیے ہیں۔"[1]

علمی وقار و خودداری

امام محمد اگرچہ خلیفہ ہارون رشید کی مجلس میں آمد و رفت رکھتے تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنے علمی وقار اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ابو عبید کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم سب امام محمد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ہارون رشید آگئے۔ ہم سب ان کی تعظیم کے لیے سروقد کھڑے ہو گئے لیکن امام جس طرح بیٹھے تھے اسی انداز سے بیٹھے رہے۔ خلیفہ سے ملاقات کرنے کے لیے باری باری سے لوگ آتے جاتے رہے یہاں تک کہ امام کی باری آئی تو آپ سے خلیفہ نے دریافت کیا کہ میری تعظیم کے لیے سب لوگ کھڑے ہوئے لیکن آپ کیوں کھڑے نہیں ہوئے؟ آپ نے جواب دیا کہ آپ نے مجھ کو جس طبقہ میں شریک کر دیا ہے، میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ میں پھر اس طبقہ سے باہر آؤں۔ آپ مجھ کو ارباب علم میں شمار کرتے ہیں، اب میں اسے پسند نہیں کرتا کہ میں اس زمرے سے نکل کر نوکروں اور خدمت گزاروں کے طبقہ میں شامل ہوں۔ اور آپ کے ابن عم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جو شخص یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں تو اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔ ان لوگوں سے آپ کی مراد علماء ہیں، جو لوگ حق خدمت ادا کرنے اور بادشاہ کے اعزاز کو بڑھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں وہ دشمن کے لیے باعث ہیبت و رعب ہیں۔ اور جو شخص بیٹھا رہا اس نے سنت کا اتباع کیا جو تم سے چھین لی گئی ہے۔ تو ایسا شخص تو تمہارے لیے باعث زینت ہے۔" ہارون رشید نے

[1] بغدادی ج ۲ ص ۱۷۸۔

یہ سن کر کہا کہ آپ نے اے محمد! بالکل درست فرمایا" اس گفتگو کے بعد ہارون نے کہا "حضرت عمر فاروقؓ نے بنو تغلب سے اس شرط پر مصالحت کی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہیں بنائینگے، لیکن وہ اس شرط پر عامل نہ رہ سکے، اور انہوں نے اپنی اولاد کو عیسائی بنالیا، تو کیا اب اس نقض عہد کی وجہ سے اُن کا خون مباح ہے؟" آپ نے فرمایا "ان لوگوں نے حضرتِ عمرؓ کے بعد اپنی اولاد کو عیسائی بنا کر شرطِ صلح کی خلاف ورزی کی، لیکن حضرتِ عثمانؓ نے جو آپ کے ابنِ عم تھے اس کو انگیز کرلیا، حالانکہ ظاہر ہے کہ جو علم اُن کے پاس تھا وہ آپ کے پاس نہیں ہے، اور پھر اس کے بعد بھی اس پر عمل درآمد ہوتا رہا، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرتِ عمرؓ کے بعد بھی خلفاء نے اس صلح کو باقی رکھا۔ اب اگر آپ ان لوگوں کو قتل نہ کریں تو آپ سے اس کی نسبت کوئی بازپرس نہیں ہوسکتی۔ آخر میں فرمایا "جو میرے نزدیک حق تھا وہ میں نے عرض کردیا، اب جو کچھ آپ کی رائے ہو وہی اعلیٰ ہے۔" ہارون نے یہ تقریر دلپذیر سن کر کہا "نہیں! ہم وہی کرینگے جو مجھ سے پیشرو خلفاء نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ وہ مشورہ کرتے تھے پھر جو رائے زیادہ صائب ہوتی تھی حضرتِ جبریلؑ اس کو بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے تھے۔ اب آپ کو لازم ہے کہ اُس شخص کے (یعنی میرے) لیے دعا کریں جس کے ضعیف کاندھوں پر خدا نے حکومت کی ذمہ داری کا بوجھ رکھ دیا ہے، اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کا حکم کیجیے۔" پھر کہا کہ میں نے آپ کے لیے کچھ عطیہ کا حکم کردیا ہے، آپ اُس کو اپنے ساتھیوں پر تقسیم کردیجیے۔ چنانچہ آپ کو مال کثیر دیا گیا جو آپ نے اُسی وقت تقسیم کردیا۔[۱]

---

[۱] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۱۷۳ و ۱۷۴

فیاضی | امام محمد زندگی نہایت شان و شوکت کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بڑے فیاض اور کشادہ دست بھی تھے اور خصوصاً علماء اور طلبا پر کافی خرچ کرتے تھے۔ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں۔

وکان کثیر البر بامام الشافعیؒ — وہ امام شافعی کے ساتھ بڑا سلوک کرتے تھے۔ ان کا

فی قضاء دیونہ والانفاق علیہ — قرضہ اُتارتے تھے، اُن پر اپنا مال خرچ کرتے تھے

من مالہ واعارۃ الکتب حتی — کتابیں عاریت پر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بیان

یقال انہ دفع لحمل بعیر — کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ایک اونٹ لدی ہوئی

کتباً۔[1] — کتابیں اُن کو دیں۔

امام شافعی سے تعلق و محبت | جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔ امام محمد کو امام شافعی سے گہرا تعلق خاطر اور رابطۂ محبت تھا۔ ایک معاملہ میں بعض شوافع نے امام محمد پر یہ الزام لگایا ہے کہ اُنھوں نے امام شافعی کی چغلی ہارون رشید سے کی تھی لیکن علامہ ابن العماد الحنبلی اس کی پُرزور تردید کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ امام محمد نے تو اس واقعہ میں امام شافعی کی جان بچائی ہے پھر بھلا وہ چغلی کس طرح کر سکتے تھے۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ علوی خاندان کے دس شخصوں کی نسبت ہارون کو یہ رپورٹ پہنچی کہ وہ خلافت کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور ہارون کو خلیفۂ جائز تسلیم نہیں کرتے۔ ہارون نے ان لوگوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا، چنانچہ یہ سب جن میں امام شافعی بھی شامل تھے گرفتار کر کے رقہ[2] سے بغداد بھیج دیے گئے لیکن اتفاق سے ہارون

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔

[2] بغداد سے ۲۰۰ میل شمال مغرب میں دریائے فرات کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ رقہ کا طول البلد شرقی ۳۹ درجہ ۱۲ دقیقہ اور عرض البلد شمالی ۳۵ درجہ ۵۹ دقیقہ ہے۔ (مؤلف)

خود رقہ میں فروکش تھا، اس لیے انہیں پھر بغداد سے رقہ لایا گیا۔ ان کی جب خلیفہ کے سامنے پیشی ہوئی تو اس وقت امام محمد بن الحسن جو اب تک عہدۂ قضا پر مامور تھے، خلیفہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ امام کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان ملزمین میں امام شافعی بھی ہیں تو انہیں ذاتی طور پر اس کا بڑا صدمہ ہوا لیکن فوری طور پر اس وقت کچھ کر نہ سکتے تھے اس لیے خاموش اور موقع کے منتظر رہے۔ ایک ایک ملزم باری باری سے خلیفہ کے سامنے پیش ہوتا تھا اور سزا کے قتل پا کر ہلاک ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ امام شافعی کی باری آئی تو ہارون نے حسب معمول ان سے بھی یہی سوال کیا کہ آپ نے خلافت کے برخلاف علم بغاوت بلند کیا ہے؟ امام نے جواب دیا " حاشا وکلا! ہرگز نہیں میں نہ طالبی ہوں اور نہ علوی، مجھ کو تو خواہ مخواہ ان لوگوں کے ساتھ مجرم قرار دے دیا گیا ہے اور ان میں شامل کر لیا گیا ہوں، میں بنی عبد المطلب بن عبد مناف میں سے ہوں اور میرا کام علم اور فقہ میں منہمک رہنا ہے اور یہ جو قاضی (امام محمد) آپ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہارون رشید نے کہا " اچھا تو آپ ہی محمد بن ادریس الشافعی ہیں؟ " بولے ہاں! اے امیر المومنین " پھر ہارون امام محمد کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ کیا یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں صحیح ہے؟ امام محمد نے جواب دیا " جی ہاں! یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں بالکل صحیح ہے بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ ہیں " ولہ محل من العلم کبیر " خلیفہ نے یہ سن کر کہا " اچھا تو اب یہ آپ کے سپرد ہیں۔ امام شافعی کا بیان ہے کہ امام محمد نے مجھ کو لے لیا اور وہی میری رہائی کا سبب بنے[1]۔

ابن العماد الحنبلی نے یہ پورا واقعہ علامہ ابن عبد البر سے نقل کیا ہے، اور اس کے بعد لکھتے ہیں

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۴۔

"قیامت کے دن تک ہر شافعی کا فرض ہے کہ وہ برملا امام محمد بن الحسن کے اس احسان کا شکر گذار ہے اور ان کے لیے دعاءِ مغفرت کرے۔"[1]

وفات | ۱۸۹ھ میں بمقام رے انتقال کیا، اتفاق سے اُسی دن مشہور امام نحو کسائی کی بھی وفات ہوئی تھی۔ ہارون رشید کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "آج نحو اور فقہ دونوں دفن ہو گئے"[2] یزیدی نے مرثیہ لکھا تو اُس میں دونوں کی وفات پر ایک ساتھ ہی اظہار رنج و غم کرتا ہے۔

اَسِیتُ علیٰ قاضی القضاۃِ محمد ۔۔۔ فاذریتُ دمعی والعیون هجوعُ

وقلتُ اذا ما الخطب اشکل من لنا ۔۔۔ بایضاحہٖ یوماً وانت فقیدُ

واقلقنی موتُ الکسائی بَعْدَہٗ ۔۔۔ وکادت بی الارض الفضاءُ تمیدُ

هما عالمانا اودیا وتخرّما ۔۔۔ فما لهما فی العالمین ندیدُ

ترجمہ:- میں نے چیف جسٹس امام محمد کی وفات کے غم میں اُس وقت زار و قطار آنسو بہائے جبکہ تمام دنیا سو رہی تھی مصیبت جب زیادہ ہولناک ہو گئی تو میں نے عالم تصور میں اُن سے کہا کہ اب آپ کے بعد ہماری مشکلوں کو کون حل کریگا۔ امام محمد کی وفات کے بعد کسائی کی موت نے مجھے بےچین کر دیا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ وسیع زمین مجھ پر لرزہ براندام ہو جاتی، یہ دونوں ہمارے عالم تھے جو وفات پا گئے اور ہم سے چھین لیے گئے۔ اب دنیا میں اُنکی کوئی نظیر نہیں۔

---

[1] خطیب بغدادی ج۲ ص ۱۸۱ [2] ایضاً ص ۱۸۲۔

یزید بن ہارون السلمیؒ

نام و نسب یزید نام، ابو خالد کنیت۔ دراصل بخاریٰ کے رہنے والے تھے قبیلہ بنو سلم کے غلام تھے اس لیے سلمی کہلاتے ہیں۔

ولادت ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔

علم و فضل علم حدیث میں کمال رکھتے تھے اس میں اُنہوں نے اپنے عہد کے کثیر علماء سے استفادہ کیا جن میں چند نام یہ ہیں۔

یحییٰ بن سعید الانصاری، سلیمان التیمی، عاصم الاحول، عبداللہ بن عون، محمد بن عمرو اور دونوں حماد، شعبۃ بن الحجاج۔ ان سے روایت کرنے والوں میں بڑے بڑے ائمہ کے اسماءِ گرامی شامل ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

امام احمد بن حنبل، علی بن المدینی، ابو خیثمہ، ابوبکر بن ابی شیبہ۔

قوتِ حافظہ ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے تھے مجھ کو چوبیس ہزار حدیثیں اسناد کے ساتھ یاد ہیں اور اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔ علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے یزید بن ہارون سے زیادہ کوئی قوی الحافظہ شخص نہیں دیکھا، ایک دوسری روایت میں اُن کے الفاظ یہ ہیں مارأیت احدًا احفظ عن الصغار والکبار من یزید بن ھارون" یحییٰ بن یحییٰ فرماتے تھے عراق کے حفاظ

۱؎ یزید بن ہارونؒ کے حالات اور کتابوں میں بھی ملتے ہیں لیکن نہایت مختصر ہیں۔ اس لیے میں نے ان کے یہ تمام حالات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴، از ص ۳۳۷ تا ص ۳۴۵ اور تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲، ۲۹۳ سے اخذ کیے ہیں۔

حدیث چار ہیں۔ دو شیخ اور دو ادھیڑ عمر کے۔ زیادہ سن رسیدہ (شیخ) تو ہشیم اور یزید بن زریع ہیں، اور ادھیڑ عمر کے (کہل)، وکیع اور یزید بن ہارون ہیں لیکن آخر میں فرماتے ہیں "واحفظ الکھلین یزید بن ھارون"

آخر عمر میں ان کی بصارت جاتی رہی تھی اس لیے وہ اپنی کتاب پڑھ نہیں سکتے تھے اُن کی ایک لونڈی تھی جو تعلیم یافتہ تھی۔ انہیں جب کبھی کسی حدیث میں کچھ اشکال ہوتا تھا وہ مزید توثیق و تصدیق کے لیے اپنی جاریہ سے حدیث پڑھوا لیتے تھے۔ بعض لوگ اس پر طعن کرتے تھے، اور جاریہ سے پڑھوانے کو اُن کے عدم تثبت کی دلیل قرار دیتے تھے لیکن علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "ایک سے زیادہ ائمہ حدیث نے حضرت یزید بن ہارون کی غیر معمولی قوتِ حفظ کا اعتراف کیا ہے، اور یہ تسلیم کیا ہے کہ انہیں اپنی حدیثیں خوب یاد تھیں، البتہ ہاں! یہ کہا جا سکتا ہے کہ بڑھاپے میں زیادتیِ عمر، پھر نابینائی اور افراطِ ضعف کے باعث وہ خود اپنے حافظہ پر پورا اعتماد نہیں کرتے تھے، اور اس بنا پر انہیں کسی حدیث میں کوئی اشکال اور تردد ہوتا تھا تو اس کی توثیق وہ جاریہ سے کرا لیتے تھے۔ پس اُن کا ایسا کرنا تو اُن کے کمالِ احتیاط کی دلیل ہے نہ کہ اُن کے ناقابلِ اعتبار و استناد ہونے کی۔[1]

اس حالت سے قبل خود اُن کو اپنے حافظہ پر بڑا وثوق و اعتماد تھا، ایک مرتبہ اُن سے کسی نے کہا کہ ہارون آپ کے پاس اس لیے آ رہا ہے کہ وہ چند حدیثوں کے الفاظ میں ردوبدل کر کے آپ کے

---

[1] حافظ ذہبی ایسا نقادِ فن بھی لوگوں کے اس طعن کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے "ما بھذا من باس فیزید حجۃ حافظ بلا مثنویۃ" اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یزید حجت اور حافظ حدیث ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں۔ (دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۳)

حافظہ کا امتحان لے۔ کہنے والے نے ابھی بات پوری نہ کی تھی کہ ہارون خود مکان میں داخل ہو گیا حضرت یزید نے اُس کی آواز سُن کر فرمایا" ہارون مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ تم میری قوتِ حفظ کا امتحان لینے کی غرض سے مجھ پر بعض مشتبہ احادیث پیش کرنا چاہتے ہو، تو تم اپنی جیسی کوشش کر دیکھو۔ خدا مجھ کو کھڑا نہ کرے اگر میں اپنی احادیث کو اچھی طرح یاد نہ رکھ سکوں۔ ایک اور موقع پر اُنھوں نے فرمایا" میں بیس ہزار احادیث یاد رکھتا ہوں جس کا جی چاہے اُن میں کوئی ایک حرف کم و بیش کرکے دیکھ لے"۔

درسِ حدیث انھوں نے بغداد اور واسط میں حدیث کا مستقل درس دیا تھا جس میں بڑے بڑے علماء شریک ہو کر کسبِ سعادت کرتے تھے۔

تفقہ فقہ میں اُن کو بڑی دستگاہ تھی۔ ابو عبداللہ سے کسی نے پوچھا" کیا یزید بن ہارون فقیہ تھے؟" انھوں نے فرمایا" ہاں! اُن کی ذہانت، فطانت، ذکاوت اور فہم کے کیا کہنے ہیں" سائل نے کہا "اچھا ابنِ علیہ سے متعلق کیا کہتے ہو" بولے" وہ فقیہ تو ضرور تھے لیکن مجھ کو اُن کی نسبت اتنا علم نہیں ہے جتنا کہ یزید بن ہارون کی نسبت ہے۔

زہد و عبادت ان علمی کمالات کے ساتھ عبادت بھی حد سے زیادہ کرتے تھے، وہ نماز نہایت خشوع و خضوع سے ادا کرتے تھے۔ احمد بن سنان کا بیان ہے کہ میں نے کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا جو یزید بن ہارون سے زیادہ اچھے طریقہ پر نماز ادا کرتا ہو وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی ستون ہے جو بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا ہوا ہے، وہ مغرب اور عشا اور ظہر اور عصر کے درمیان بھی نماز پڑھتے رہتے تھے، وہ اور ہشیم دونوں دن اور رات کی نماز کی درازی میں مشہور ہیں۔ چاشت

کے وقت سولہ رکعات پڑھتے تھے۔

انہیں اس کا بڑا خیال رہتا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو۔ وہ خود فرماتے ہیں "مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں کسی غلطی کے صادر ہو جانے کی وجہ سے میں اُن خوارج کا مصداق نہ بن جاؤں جن کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "یقرؤون القرآن لا یجاوز حناجرھم یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ"

عاصم بن علی کا بیان ہے کہ میں اور یزید بن ہارون مدت تک ابن الربیع کے پاس رہے ہیں۔ اس اثناء میں میں نے تقریباً چالیس سال تک یزید بن ہارون کو دیکھا کہ وہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے تھے اور تمام رات نماز میں کھڑے ہی کھڑے گذار دیتے تھے، ایک شخص نے حضرت یزید سے پوچھا "آپ رات میں کتنی دیر سوتے ہیں؟" بولے "اگر میں رات کے کسی حصہ میں سوتا ہوں تو خدا میری آنکھوں کو نیند سے محروم کردے۔"

خوفِ خدا اُن پر بحکم "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" خوفِ خدا کا بڑا غلبہ تھا۔ یہاں تک کہ خود اُن کے اپنے بیان کے مطابق خوفِ خدا میں رونے کے باعث اُن کی دونوں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں "ذھب بھما بکاء الاسحار"

علمی وقار و تمکنت باخبر اصحاب پر پوشیدہ نہیں ہے کہ امام احمد بن حنبل کے عہد میں خلق قرآن کا فتنہ اس زور شور سے اُٹھا تھا کہ اس نے قصرِ خلافت تک کو متزلزل کر دیا تھا۔ خود مامون الرشید جو معتزلہ کے زیر اثر تھا اور اکثر مسائل میں اُنہی کے مسلک کی تائید کرتا تھا خلق قرآن کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے اس عقیدہ کی تبلیغ و اشاعت کرے لیکن حضرت یزید بن ہارون کی علمی تمکنت و وقار کے سبب

وہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کرسکا یحییٰ بن اکثم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مامون نے ہم سے کہا "لولا مکان یزید بن ھارون لاظہرت القرآن مخلوق" اگر یزید بن ہارون کے وقار کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں قرآن کے مخلوق ہونے کا اظہار کر دیتا۔ اس پر کسی مصاحب نے پوچھا "اے امیر المومنین! یہ یزید بن ہارون کون ہیں جن سے اس قدر خوف کیا جاتا ہے؟" مامون نے کہا "میں اُن سے اس لیے نہیں ڈرتا کہ اُن کے ہاتھ میں کوئی سلطنت ہے، یا وہ کسی جگہ کے بادشاہ ہیں، البتہ مجھ کو خوف یہ ہے کہ اگر میں نے اپنے عقیدہ کا اظہار کر دیا۔ اور اُنہوں نے میری تردید کی تو لوگوں میں اختلاف پیدا ہو کر ایک فتنہ کھڑا ہو جائیگا، اور میں فتنہ سے ڈرتا ہوں۔ وہ شخص بولا "اچھا! میں اس بات کی تحقیق کرتا ہوں۔ چنانچہ یہ شخص واسط آیا، اور ایک مسجد میں جہاں حضرت یزید بن ہارون تشریف رکھتے تھے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا" امیر المومنین آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں اس بات کا ارادہ کرتا ہوں کہ قرآنِ مجید کے مخلوق ہونے کا اظہار کر دوں۔ یزید بن ہارون بولے "تم امیر المومنین پر تہمت طرازی کرتے ہو، وہ لوگوں کو کسی ایسی بات پر آمادہ نہیں کر سکتے جس کو وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو ذرا بیٹھو، یہاں تک کہ مجلس کا وقت ہو جائے۔ جب لوگ جمع ہو جائیں تو اس بات کا پھر اعادہ کرنا" چنانچہ دوسرے دن جب لوگ حضرت یزید بن ہارون کی مجلس میں اکٹھے ہوئے تو یہ شخص کھڑا ہوا اور اُس نے حضرت یزید کی طرف مخاطب ہو کر کہا "ابو خالد! امیر المؤمنین آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں قرآنِ مجید کے مخلوق ہونے کا اعلان کرنا چاہتا ہوں" یزید بن ہارون بولے "تم امیر المومنین پر تہمت باندھتے ہو وہ کسی ایسی بات پر لوگوں کو آمادہ نہیں کر سکتے جس کو لوگ بالکل نہ جانتے ہوں

ورجس کا قائل کوئی ایک شخص بھی نہ ہوا ہو" اس گفتگو کے بعد اس شخص نے مامون کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا "امیر المومنین! آپ جو کچھ فرماتے تھے، بالکل بجا اور درست تھا۔ اس معاملہ میں بے شبہ آپ عالم تھے۔

یزید بن ہارون کو معلوم تھا کہ مامون رشید کا رجحان خلق قرآن کی طرف ہے لیکن اس کے باوجود اُن کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ وہ بے خوف ہو کر اعلان کرتے تھے "قسم ہے اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے"۔

اپنی تعریف سننے سے نفرت

انہیں اپنی تعریف سُننے سے طبعًا نفرت تھی۔ علی بن الجندی الحرانی اس عہد میں ایک پُرگو شاعر تھا، اُس کو حضرتِ یزید سے قلبی عقیدت وارادت تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے حاضر ہو کر آپ کی مدح میں ایک طویل قصیدہ پڑھا جس میں تشبیب کے بعد وہ کہتا ہے:۔

اِلیٰ یزید بن ھارون الّذی کملت ۔۔۔ فیہ الفضائل او اشفیٰ علیٰ ختنٍ

حتیٰ اتیت امام الناسِ کُلّھِمُ ۔۔۔ فی العلم والفقہِ والاثار والسننِ

والدین والزھدِ والاسلام قد علموا ۔۔۔ والخوفِ للّٰہِ فی الاسرار والعلنِ

برًا، تقیًا، نقیًا، خاشعا، ورعًا ۔۔۔ مبرأ من ذوی الاٰفاتِ والابن

مازال مذ کانَ طفلًا فی شبیبتہٖ ۔۔۔ حتیٰ علاہ مشیب الراسِ والذقن

مبارکًا ھادیًا، للناسِ محتسبًا ۔۔۔ علی الانام بلا مَنٍّ ولا ثمنِ

اذا بدا خلت بدرًا عند طلعتہٖ ۔۔۔ نورًا حباہُ بہِ الرحمٰنُ ذوالمننِ

یظل منعفرًا لِلّٰہِ مبتھلًا ۔۔۔ یدعو الالٰہَ بقلبٍ دائم الحزنِ

ان اشعار کے بعد شاعر نے حضرت یزید بن ہارون کے شیوخ کے اسماء گرامی نظم کیے ہیں جن کے اخیر میں طلباءِ علوم کو خطاب کر کے کہا ہے۔

یا طالب العلم، لا تعدل بما حدثاً	قد کنت فی غفلۃ عنہ وفی ددن
بقیۃ الناس من ھذا یعاد لہ؟	فی سالف الدھر او فی غابر الزمن
یلقی الیہ رفاق الناس عابدۃ	علی الحامل والاقتاب والسفن
من الجزیرۃ اِرسالاً متابعۃ	ومن خراسان، اھل الریف والمدن
ومن حجاز ھناک العیر قاصدۃ	ومن عراق، ومن شام ومن یمن
یاتون عندہ عزیز العلم محتسباً	تری الحدیث لدیہ غیر محتزن
یزید اصبحت فوق الناس کلھم	شیئاً خصصت بہ، یا واسع العطن
ساویت شعبۃ والثوری قد علموا	وابن المبارک لم یصبح علی عین

شاعر نے یہ قصیدہ نہایت دلسوزی اور محبت سے لکھا تھا، اس کو گوشِ التفات سے نہ سننا کج خلقی پر محمول کیا جاتا۔ اسی لیے حضرت یزید بن ہارون نے نہایت توجہ سے یہ قصیدہ سنا لیکن انکسارِ نفس کا یہ عالم تھا کہ شاعر وہ اشعار جن میں آپ کی مدح کی گئی تھی پڑھتا تھا تو آپ اس کو ان اشعار کے پڑھنے سے روک دیتے تھے، اور اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹنے لگتے تھے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اعمال میں سب سے زیادہ مشکل کام امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ہے لیکن یزید بن ہارون اس میدانِ دشوار گذار کے بھی باہمت شہسوار تھے۔ چنانچہ مامون کا جو واقعہ اوپر گذرا ہے اُس سے اس کی پرزور تائید ہوتی ہے، محمد بن احمد اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ یزید بن ہارون

اُن بزرگوں میں سے تھے جو امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔

مرجع خلائق | حضرتِ یزید بن ہارون اپنے علمی و عملی کمالات کے باعث عوام و خواص کے مرجع تھے۔ بعض اوقات تو اُن کے پاس مسائل دریافت کرنے والوں کا اتنا ہجوم ہو جاتا تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ ابوبکر یحییٰ بن ابی طالب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم یزید بن ہارون کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، لوگ اُن پر جھکے ہوئے ہر طرف سے سوالات کی بوچھار کر رہے تھے لیکن وہ خود خاموش تھے۔ اور کسی کو کوئی جواب نہیں دیتے تھے جب سب خاموش ہو گئے تو آپ نے فرمایا "ہم واسط کے رہنے والے ہیں (واسط کے لوگ تغافل میں ضرب المثل ہیں)

خضاب | بڑھاپے میں اکثر مائل بہ سرخ خضاب کا استعمال کرتے تھے۔

وفات | ۲۰۶ھ میں اس پیکرِ علم و عمل نے دنیائے فانی کو الوداع کہا۔

لیث بن سعد

نام و نسب | لیث نام، ابو الحرث کنیت، اصل میں اصفہان کے رہنے والے تھے قیس بن رفاعہ کے غلام ہونے کی وجہ سے جو قبیلۂ فہم سے تعلق رکھتا تھا فہمی کہلاتے ہیں۔

ولادت | علامہ جلال الدین سیوطی نے حسن المحاضرہ میں لیث بن سعد کی تاریخ پیدائش ۹۴ھ لکھی ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "میرے نزدیک یقینی یہ ہے کہ وہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے[1] قرقشندہ

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸۔

کا گاؤں اُن کی جائے پیدائش ہے۔[1]

طلبِ علم حضرت لیث بن سعد غلام تھے لیکن تحصیل علم کا قدرتی شوق رکھتے تھے، اُنہوں نے امام زہری کا زمانہ پایا تھا۔ ان کے فیضانِ درس سے مکہ کا کوچہ کوچہ قال رسول اللہؐ کی دلنواز صداؤں سے گونج رہا تھا۔ لیث نے بھی اُدھر کا رُخ کیا اور حضرت زہری کے فیوض سے سیراب ہوئے وہ خود فرماتے ہیں "میں نے ابنِ شہاب الزہری کے علم کا بہت بڑا حصہ لکھا ہے۔ اور میں برید (ڈاک) پر سوار ہو کر اُن سے ملنے کے لیے رصافہ جایا کرتا تھا۔ پھر مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرا یہ فعل، خدا کے لیے نہ ہو، تو میں نے وہاں جانا ترک کر دیا۔[2]

شیوخ امام زہری کے علاوہ حضرتِ لیث نے جن اساطینِ علم و درایت سے استفادہ کیا اُن کی فہرست بہت طویل ہے اُن میں سے چند نام یہ ہیں۔ عطا بن ابی رباح، عبداللہ بن ابی ملیکہ نافع مولیٰ ابنِ عمر، یحییٰ انصاری، ابو الزبیر۔ ان بزرگوں کے التفاتِ خاص نے انہیں علم و عمل کا ایک ایسا پیکر لطیف بنا دیا کہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے بزرگ اور امام ہو گئے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں "علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت لیث بن سعد فقہ اور حدیث میں بہت بلند مرتبہ اور امامت کا درجۂ عالی رکھتے تھے اور اپنے زمانہ میں وہ اہل مصر کے امام تھے۔"[3]

شرحبیل بن جمیل کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں یزید بن ابی حبیب ایک بلند پایہ محدث و مفسر اور اُن کے ساتھی مصر میں مقیم تھے، حضرتِ لیث کی جوانی کا عہد تھا۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس نو عمری کے باوجود یزید بن ابی حبیب اور مصر کے دوسرے عمر

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۸۵ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۷۴

علماء لیث کا بڑا احترام کرتے، اُن کو مجلسوں میں مقدم رکھتے۔ اور اُن کے علم و فضل اور ورع کا اعتراف کرتے تھے۔

حدیث: حضرتِ لیث کو قریب قریب تمام علومِ مروجہ سے طبعی مناسبت تھی۔ اور وہ اُن کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے لیکن اُن کا سب سے زیادہ محبوب فن حدیث تھا۔ علامہ ابن سعد تحریر کرتے ہیں "لیث بن سعد ثقہ اور کثیر الحدیث تھے اور اُن کی احادیث صحیح بھی ہوتی تھیں"۔ امام احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ وہ اُن کو "کثیر العلم صحیح الحدیث" کہا کرتے تھے۔ مشہور نقادِ حدیث حضرت یحییٰ بن معین اُن کو ثقہ سمجھتے تھے۔ عثمان الدارمی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ابن معین سے پوچھا آپ کو لیث زیادہ پسند ہیں یا یحییٰ بن ایوب؟ بولے لیث زیادہ پسند ہیں اور یحییٰ ثقہ ہیں۔ ابن المدینی کہتے ہیں "ثقۃٌ ثبتٌ"۔[1]

ابن بکیر کا بیان ہے "میں نے بڑے بڑے علماء کو دیکھا ہے لیکن لیث ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا" اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے لیث سے زیادہ کامل کوئی نہیں دیکھا۔ انہوں نے حجاز و عراق کے سفر اور وہاں کے طویل قیام میں احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا کہ ایک دفعہ اُن سے کسی نے کہا "آپ بعض مرتبہ ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جو آپ کی کتابوں میں نہیں ہیں" فرمایا "کیا وہ ہر چیز جو میرے سینہ میں محفوظ ہے، کتابوں میں بھی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اس قدر بڑا دفتر ہو جاتا کہ یہ سواری اُس کو نہیں اُٹھا سکتی تھی"۔[2]

فقہ: حدیث کی طرح فقہ میں بھی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ابن وہب کہتے ہیں "قسم ہے اس

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۱ و ۴۶۲۔ [2] ایضاً ص ۴۶۳

ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ہم نے لیث سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا[۵]۔ علامہ نووی فرماتے ہیں "حضرت لیث کی مہارتِ فقہ پر علماء کا اجماع ہے۔ امام شافعی سے منقول ہے کہ وہ حضرت لیث کو امام مالک سے بڑا فقیہ مانتے تھے، لیکن فرماتے تھے کہ ان کے اصحاب نے انہیں ضائع کردیا اور یہ بھی فرماتے تھے کہ لیث امام مالک سے زیادہ آثار کا اتباع کرنے والے ہیں[۶]۔ امام احمد کا بیان ہے کہ لیث فقیہ البدن تھے[۷]۔ امام شافعی کا بیان ہے "مجھ کو کسی سے جدا ہونے کا اتنا ملال نہیں ہوا جتنا کہ حضرت لیث بن سعد کی جدائی کا ہے۔ ابن وہب نے لوگوں اور احادیث کے اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد کہا "اگر لیث اور امام مالک سے میری ملاقات نہ ہوتی تو میں گمراہ ہوجاتا[۸]۔

فتویٰ اس کمال تفقہ کے باعث اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے مفتی بھی تھے[۹]۔ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید نے کسی بات سے متاثر ہوکر قسم کھالی کہ میرے لیے دو جنتیں ہیں۔ بعد میں اس کو خیال آیا کہ یہ قسم تو بڑی سخت ہے، میں کس طرح اس سے عہدہ برا ہوسکتا ہوں اس نے ایک غلام بھیج کر حضرت لیث بن سعد کو بلایا، اس وقت ہارون کی بیوی زبیدہ بھی پردہ کے پیچھے موجود تھی۔ حضرت لیث کو پورا واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے ہارون سے کہا "تم تین مرتبہ اس بات کی قسم کھاؤ کہ میں خدا سے خوف کرتا ہوں" ہارون کے تین مرتبہ قسم کھانے کے بعد حضرت لیث نے فرمایا "جاؤ! اب تمہاری قسم درست ہوگئی۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے "وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ" ترجمہ:۔ جو لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے خوف

---

[۵] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸ [۶] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸ [۷] ایضاً ص ۲۰۹

[۸] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۳۔ [۹] تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۷۴

کرینگے اُن کے لیے دو جنتیں ہیں" ہارون اس عجیب نکتہ سنجی سے بہت خوش ہوا، اور کئی جاگیریں بطور انعام حضرتِ لیث کو عطا کیں[1]۔

جامعیت | اپنے علمی و عملی کمالات کی وجہ سے حضرت لیث محاسن و فضائل کا ایک گلدستہ سدا بہار تھے۔ ابن بکیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے لیث سے زیادہ کامل کوئی نہیں دیکھا وہ فقیہ البدن، اور عربی اللسان تھے، قرآن مجید خوب پڑھتے تھے۔ نحو کے بڑے اچھے عالم تھے، اشعار بہت یاد تھے، حدیث کے امام تھے اور مذاکرہ و مباحثہ کا بہت عمدہ سلیقہ رکھتے تھے، راوی کا بیان ہے کہ بکیر حضرت لیث کے فضائل و کمالات کا شمار کرتے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے دس کمالات شمار کرائے[2]۔ مناظرہ میں کمال کا یہ عالم تھا کہ جس جلسہ میں کسی سے مناظرہ کرتے تھے اُس پر پوری طرح چھا جاتے تھے[3]۔

علماء کا اعتراف | تمام بڑے بڑے علماء اُن کی عظمت و برتری کا برملا اعتراف کرتے تھے۔ امام نووی کا بیان ہے "واقوال العلماء فی فضلہ کثیرۃ مشہورۃ" لیث مدینہ میں قیام پذیر تھے کہ کسی بات پر یحییٰ بن سعید الانصاری نے اُن سے کہا "آپ ایسا نہ کیجیے، کیونکہ آپ امام ہیں، لوگوں کی نظریں آپ کی طرف لگی رہتی ہیں۔ امام مالک بن انس نے انہیں ایک خط لکھا تو اُس میں وہ لکھتے ہیں، آپ اپنی امامت فضل اور منزلت اور مرجوعۂ خلائق ہونے کے اعتبار سے لوگوں کے نزدیک ایک مسلّم شخصیت کے مالک ہیں[4]۔ دراوردی کا بیان ہے "ایک دفعہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹۔

[3] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۲ [4] ایضاً ص ۴۶۳۔

لیث، یحییٰ بن سعید اور ربیعہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ حضرت لیث کی جلالتِ شان کے باعث ان دونوں سے ٹھیک بات بھی نہیں ہوتی تھی، اور یہ دونوں لیث کا بڑا احترام کرتے تھے[1]

خلفاء کی تعظیم علماء تو علماء خلفاء تک اُن کی بارگاہِ عقیدت و ارادت میں سرِ نیاز خم کرتے تھے حضرت لیث عراق میں تشریف لائے تو خلیفہ مہدی نے اپنے وزیر سے جس کا نام یعقوب تھا، کہا تم اس شیخ (لیث) کی خدمت میں حاضر رہو میرے نزدیک یہ ثابت ہوچکا ہے کہ اب اُن سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے[2]۔

علامہ ابن خلکان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لیث مصر کے عہدۂ قضا پر مامور تھے[3]۔ لیکن حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ابوجعفر منصور نے اُن سے درخواست کی کہ آپ میری طرف سے مصر کے والی ہو جائیے تو اُنہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا اے امیر المومنین میں موالی میں سے ہوں اس لیے اس بارِ گراں کے اُٹھانے سے عاجز ہوں۔ ابوجعفر بولا "آپ میں تو کوئی ضعف نہیں ہے۔ البتہ آپ کا ارادہ کمزور ہے۔ بہرحال حضرت لیث نے نیابتِ خلافت کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کردیا۔ تاہم اگرچہ وہ صورتاً نائب نہیں تھے لیکن اُن کا رعب و داب، اور جلالت و شوکت کسی نائب سے کم نہیں تھی۔ مصر کا گورنر اور قاضی دونوں اُن کے زیرِ فرمان رہتے تھے۔ انہیں کسی کے متعلق اگر کوئی ناروا بات معلوم ہوتی تو وہ فوراً خلیفہ کو لکھ بھیجتے اور وہ معزول کردیا جاتا تھا[4]۔ ابنِ عماد حنبلی، ابن الاہدل کا قول نقل کرتے ہیں کہ لیث بن سعد نے اگرچہ ولایتِ مصر

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۲ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۰۹ [3] ابن خلکان ج ا ص ۴۳۸ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲

کے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن قضاءِ مصر کو قبول کر لیا تھا[1]۔ ہمارے نزدیک صحیح یہی ہے اس
طرح دونوں مختلف اقوال میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے۔

سخاوت حضرت لیث اُن اکابرِ اُمت میں سے تھے جن کو خداوند تعالیٰ نے اقلیم علم کی فرمانروائی کے
ساتھ دولت و ثروت کی افراط سے بھی نوازا تھا چنانچہ علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اُن
کی سالانہ آمدنی اسی ہزار دینار تھی لیکن طبیعت اس درجہ مستغنی اور سیر چشم و فیاض تھی کہ علماء و فضلا
اور اربابِ حوائج پر سب خرچ کر دیتے تھے اور یہ رقم سال بھر تک اتنی بھی نہیں رہتی تھی کہ اس
پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی[2]۔ علماء کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ابن لہیعہ کے مکان میں
آگ لگ گئی تو حضرتِ لیث نے اُن کو ایک ہزار دینار مرحمت فرمائے۔ ایک دفعہ منصور بن
عماران سے ملاقات کی غرض سے آئے، چلنے لگے تو حضرتِ لیث نے اُن کو ایک ہزار دینار
نذر کیے[3]۔ قتیبہ بن سعید کو سندس کی ایک قمیص دی تھی جو اُن کے پاس بہت عرصہ تک رہی[4]
کوئی شخص اگر اُن سے کسی چیز کا سوال کرتا تو وہ اُس سے تنگ دل ہونے کی بجائے اُس
کا سوال بڑی فیاضی سے پورا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت ایک پیالہ لے کر شہد مانگنے
آئی تو آپ نے شہد کا برتن ہی اُس کے حوالہ کر دیا[5]۔ کھانا تنہا کبھی نہیں کھاتے تھے۔ عبد اللہ
بن صالح کا بیان ہے کہ میں حضرت لیث کے ساتھ کامل بیس سال تک رہا ہوں اس مدت
میں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ صبح کا یا شام کا کھانا اُنہوں نے بغیر ایک جماعت کے تنہا کھایا ہو[6]

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۸۵ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸ و تہذیب التہذیب [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸
[4] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۳ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸ [6] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۴۔

امام مالک سے اُن کو خاص تعلق خاطر تھا۔ چنانچہ حضرت لیث انہیں سو دینار سالانہ مستقلاً دیتے تھے۔ اور اس کے علاوہ اُنہیں جب کبھی کوئی اہم ضرورت پیش آتی تھی تو اُس میں بھی بڑی فراخ دلی سے اُن کی امداد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام مالک نے انہیں لکھا کہ میں اپنی بیٹی کی رخصتی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کچھ "عصفر" بھیج دیجیے۔ حضرت لیث نے تعمیل ارشاد میں "عصفر" کی تیس گٹھریاں بھیج دیں۔ یہ عصفر اس درجہ وافر تھا کہ اُس سے تمام کپڑے رنگ لینے کے بعد بقیہ کو فروخت کیا گیا تو پانچ سو دینار میں فروخت ہوا[1]۔

ایک دفعہ امام مالک نے لکھا "مجھ پر کچھ قرض ہو گیا ہے" حضرت لیث نے فوراً پانسو دینار خدمتِ اقدس میں پیش کر دیئے[2]۔ امام مالک انہیں کبھی کوئی چیز بطور ہدیہ ارسال کرتے تھے تو وہ اُس کے جواب میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور بھیج دیتے تھے۔ ایک مرتبہ امام نے انہیں مدینہ کی بعض نئی اور عمدہ چیزیں تحفۃً بھیجیں، آپ نے اُس کے بدلہ میں ایک ہزار دینار بھیج دیئے[3]۔

تحدیث بالنعمۃ حضرت لیث جس طرح دوسروں پر خوب خرچ کرتے تھے، تحدیثاً بالنعمۃ خود اپنے اوپر بھی بہت خرچ کرتے تھے۔ لباسِ فاخر پہنتے تھے، اور بود و ماند میں پُر تکلف طریقہ سے رہتے تھے۔ سلیمان بن حرب ایک مرتبہ حضرت شعبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم نے اُن کے گدھے، زین اور لگام کا اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اٹھارہ سے بیس درہم تک کی قیمت کی تھیں۔ اس پر محمد بن معاویہ نیشاپوری بولے کہ ایک دفعہ لیث ہمارے سامنے سے گذر رہے تھے اُس وقت ہم نے اُن کے کپڑوں، سواری، انگوٹھی، ان سب کی قیمت کا اندازہ

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸ [3] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۷۳۔

گیا تو معلوم ہوا کہ یہ چیزیں اٹھارہ ہزار سے بیس ہزار درہم تک کی ہیں[1]۔

قتیبہ کا بیان ہے ہم اسکندریہ سے حضرت لیث کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے تو اُس وقت اُن کے ساتھ تین کشتیاں تھیں جن میں سے ایک کھانے پینے کے سامان سے پُر تھی ایک میں اُن کے اہل و عیال تھے اور ایک کشتی میں اُن کے مہمان بیٹھے ہوئے تھے[2]۔

وقارِ علم کے تحفظ کا خیال

حضرت لیث اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ علماء کے لیے علم کے وقار کو محفوظ رکھنے کی خاطر ازبس ضروری ہے کہ وہ معاشی اعتبار سے اربابِ ثروت و دولت کے دست نگر نہ ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ منصور بن عمار آپ کے پاس تشریف لائے تو آپ نے انہیں ایک ہزار دینار عطا کیے اور ساتھ ہی فرمایا

صُنْ بِهٰذِهِ الْحِكْمَةَ الَّتِي آتَاكَ اللّٰهُ تَعَالٰى[3] — اللہ تعالیٰ نے تم کو جو حکمت عطا فرمائی ہے تم ان دنانیر کے ذریعہ اس کی حفاظت کرو۔

اُن کے پاس جو طلباء حدیث دور دراز سے آتے تھے حضرت لیث کا معمول تھا کہ واپسی کے وقت اس درجہ سامان اور کھانا وغیرہ اُن کے ساتھ کر دیتے تھے جو اُن کے وطن تک پہنچنے کے لیے کافی ہو سکے[4]۔

دوست نوازی

اُن کے دوست احباب جو اُن کے پاس جمع ہوتے تھے اُن کو خوب کھلاتے پلاتے تھے وہ اپنے احباب کے لیے عموماً فالودہ تیار کراتے تھے اور پھر دیناروں کی شرط لگا کر فرماتے تھے کہ جو شخص اپنے ساتھیوں سے زیادہ کھائیگا اُس کو اتنے دینار ملینگے[5]۔ غرض یہ ہے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹ [2] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۲ [3] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸ [4] کتاب الانساب ص ۴۴۴ [5] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۸

کہ وہ اپنے علمی و عملی کمالات کے باعث نظیری کے اس شعر کے پورے مصداق تھے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ابن حبان فرماتے ہیں "وہ ثقہ ہیں، اور فقہ، زہد و اتقاء، علم و فضل اور جود و سخا کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے سرداروں میں سے ہیں۔ ابن ابی مریم کا بیان ہے کہ "میں نے اللہ کی مخلوق میں لیث سے افضل کوئی نہیں دیکھا کوئی خصلت جو تقرب الی اللہ کا سبب ہو، ایسی نہ تھی جو اُن میں موجود نہ ہو" ابو یعلی الخلیلی کہتے ہیں "لیث بے خوف تردید اپنے وقت کے امام تھے"[1] علامہ ابن سعد انہیں "سریاً من الرجال نبیلاً سخیاً" لکھتے ہیں[2]۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "وہو امامٌ حجۃٌ کثیر التصانیف ومناقب اللیث عدیدۃ"[3] علامہ سمعانی لکھتے ہیں۔

امامُ اھل مصر فی الفقہ والحدیث معاً — وہ فقہ اور حدیث دونوں میں اہلِ مصر کے امام تھے

فاقَ اھل زمانہ بالسخاوۃ والبذل[4] — اور سخاوت و بذل میں اہل زمانہ سے فائق۔

وفات ۱۵ شعبان المعظم ۱۷۵ھ جمعہ کی شب میں بمقام فسطاط انتقال کیا۔ اس وقت آپ کی عمر اکیاسی برس کی تھی[5] جب لوگ دفن سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے کسی کو یہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا

ذھب اللیث فلا لیث لکم
ومضی العلم قریباً وقُبر

ترجمہ:۔ لیث چلے گئے، اب وہ تمہیں نہیں مل سکتے، اُن کے ساتھ علم بھی چلا گیا اور دفن ہو گیا۔

لیکن ہر چند لوگوں نے تلاش کیا، پڑھنے والے کا پتہ نہیں چلا[6]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۶۴ [2] ایضاً ص ۴۶۱ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹ [4] کتاب الانساب ص ۴۴۳
[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۹ [6] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۳۹۔

عبداللہ بن وہبؒ

نام ونسب | عبداللہ نام، ابومحمد کنیت۔ ریحانۃ مولاۃ ابوعبدالرحمٰن یزید بن انیس الفہری کے غلام تھے۔ فہر بن مالک کی طرف ہی قریش کا انتساب ہوتا ہے، اس لیے انہیں قریشی بھی کہا جاتا ہے[1] ۱۲۵ھ میں بماہ ذی القعدہ مصر میں پیدا ہوئے[2]۔

تعلیم | اپنے بیان کے مطابق انہوں نے سترہ برس کی عمر میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی[3]۔ انہوں نے تابعین کرام کی جماعت میں حضرت ہشام بن عروہ اور عبیداللہ بن عمرو کو دیکھا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ ان سے استفادہ نہیں کر سکے، ان میں سے اول الذکر کی نسبت خود ان کا بیان یہ ہے کہ میں نے ہشام بن عروہ کو مسجد میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر میں ان کے مکان پر حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ سو رہے ہیں، اس وقت میں نے ان کو بیدار کرانا مناسب خیال نہیں کیا اور حج کرنے چلا گیا، وہاں سے واپس لوٹا تو ان کی وفات حسرت آیات کی خبر سنی، رہ گئے حضرت عبیداللہ تو میں نے ان کو دیکھا ضرور ہے لیکن اس وقت جبکہ وہ نابینا ہو گئے، اور غالباً اسی بنا پر انہوں نے حدیث کی روایت ترک کر دی تھی[4]۔

علم وفضل | تاہم انہوں نے جن مشائخ وقت اور ائمۂ روزگار سے علم حاصل کیا ان کی باطنی توجہ

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی ص ۴۴۲ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۹۔ [3] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۲
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰۔

اور خود ان کی محنت و شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی علوم و فنون کے ممتاز عالم ہو گئے۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام الحافظ" اور "احد الائمۃ الاعلام" لکھتے ہیں۔ ابن خلکان لکھتے ہیں۔ "کان احد ائمۃ عصرہ" ابنِ عماد الحنبلی اُن کو "الامام الحبر" کے لقب سے یاد کرتے ہیں[1]۔ حضرت سفیان ابن عیینہ نے ایک مرتبہ انہیں دیکھا تو اُن کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "یہ عبداللہ بن وہب ہیں جو مصر کے شیخ ہیں" ابن عدی کا قول ہے "ابن وہب جلیل المرتبۃ اور ثقات ناس میں سے ہیں[2]"

حدیث حدیث میں ان کو خاص درک اور کمال حاصل تھا، ابو زرعہ کا بیان ہے کہ "میں نے ابنِ وہب کی تیس ہزار حدیثوں کو خوب اچھی طرح سے جانچا، لیکن مجھ کو اس مجموعہ میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملی جس کی اصل نہ ہو، اور وہ ثقہ تھے"۔ امام نسائی فرماتے ہیں "ابنِ وہب ثقہ ہیں، میں نہیں جانتا کہ اُنھوں نے کسی ثقہ سے کوئی منکر حدیث روایت کی ہو[3]"

ابن وہب نے جن محدثین سے حدیث کا فن حاصل کیا تھا۔ امام مالک کا نام ان میں سرفہرست ہے، لیکن شاگرد کے کمال کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ امام مالک ایسا اُستاذ انہیں خط میں "مفتی اہلِ مصر" لکھتا تھا۔ اور مختلف مسائل میں اُن سے استفسار کرتا رہتا تھا۔ حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ صرف عبداللہ بن وہب کی خصوصیت تھی ورنہ امام مالک ان کے علاوہ کسی اور شخص کو اس طرح خطاب نہیں کرتے تھے۔ ایک

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۱

مرتبہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ وضو کرتے وقت پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنے کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا "مجھے نہیں معلوم"۔ عبداللہ بن وہب اس وقت موجود تھے، انہوں نے کہا "اس بارہ میں ہمارے پاس ایک روایت موجود ہے" اس کے بعد انہوں نے وہ پوری روایت مع اسناد کے پڑھ کر سنادی۔ امام مالک نے اس کو معتبر قرار دیا، چنانچہ اس دن کے بعد اگر کوئی ان سے یہ مسئلہ دریافت کرتا تھا تو وہ اسے انگلیوں میں خلال کرنے کا حکم کرتے تھے، اور عبداللہ بن وہب کی روایت کا حوالہ دے کر یہ بھی فرماتے تھے کہ میں نے اب تک اس کو کسی اور سے نہیں سنا ہے[1]۔

حضرت ابن وہب امام مالک کے علوم کے مخصوص حامل تھے۔ ہارون بن عبداللہ کا بیان ہے کہ مدینہ کے لوگ امام مالک کی کسی روایت یا ان سے منقول کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے تھے تو انہیں ابن وہب کے آنے کا انتظار رہتا تھا، جب وہ تشریف لے آتے تو سب جمع ہو کر ان سے رفع شکوک کرتے تھے[2]۔

عبداللہ بن وہب کو حدیث میں جو مرتبۂ بلند حاصل تھا، اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن القاسم الفقیہ کا بیان ہے کہ "اگر سفیان بن عیینہ زندہ نہ ہوتے تو لوگ شدِّ رحال کر کے حضرت ابن وہب کے ہی پاس جایا کرتے کسی شخص نے علم اتنا مدون نہیں کیا جتنا کہ انہوں نے کیا ہے[3]۔

شیوخ | انہوں نے امام مالک کے علاوہ جن بزرگوں سے روایت کی ہے ان میں سے چند

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۱ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۰۷ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰

کے نام یہ ہیں:۔ یونس بن زید، ابن جریج، حنظلہ بن ابی سفیان، حیوۃ بن شریح، اسامہ بن زید اللیثی ابوصخر حمید بن زیاد، عمرو بن الحارث، سفیان، لیث بن سعید۔

تلامذہ | جنہوں نے اُن کے دامانِ فیض سے خوشہ چینی کی، اُن کی فہرست بڑی طویل ہے۔ چند اکابر تلامذہ یہ ہیں:۔ ابن مہدی، احمد بن صالح، سعید بن ابی مریم، ربیع بن سلیمان المرادی، یونس بن عبد الاعلیٰ۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ لیث بن سعد، ابن وہب کے شیخ ہیں، لیکن وہ بھی اُن سے روایت کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

فقہ | ابن وہب، امام مالک کی صحبت میں بیس سال رہے تھے[1] اس لیے حدیث کے ساتھ اُن کو فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ ابن یونس کا بیان ہے کہ "ابن وہب فقہ اور حدیث اور عبادات تینوں کے جامع تھے یحییٰ بن بکیران کو ابن القاسم سے بڑا فقیہ مانتے تھے[2]۔ ابومصعب حضرت ابن وہب کی تعظیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ امام مالک کے جو مسائل اُن کے ذریعہ منقول ہیں سب صحیح ہیں۔ حارث بن المسکین کا بیان ہے کہ ابن وہب فقہ، حدیث اور عبادات کے جامع تھے۔ ان کو علماء سے طبعًا بڑی محبت تھی اور امام مالک سے اُنہوں نے بڑا فیض اُٹھایا تھا[3]۔

فتویٰ | امام مالک اگرچہ انہیں "فقیہ مصر" لکھتے، اور اُن کے مفتی ہونے کی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے لیکن خود ابنِ وہب ازراہِ ورع واحتیاط فتویٰ دینے سے اجتناب کرتے تھے۔ محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن وہب، ابن القاسم سے بڑے فقیہ تھے لیکن اُن کا ورع انہیں

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰، ۲۸۱ [3] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۲، ۷۳

افتاء سے باز رکھتا تھا۔[۱]

جلالت شان | عبداللہ بن وہب کی شانِ جامعیتِ علم کو تمام بڑے بڑے علماء تسلیم کرتے تھے۔ ابوزید بن ابی الغمر کا بیان ہے ہم نے ابن وہب کا نام علم کا دفتر رکھ دیا تھا[۲] حارث کہتے ہیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں عبداللہ بن وہب کے پاس آیا ہوں اور میں نے اُن سے کسی مسئلہ میں استفادہ نہ کیا ہو، لوگ اُن کو علم کا دیوان کہتے تھے۔[۳] ابن سعد کا بیان ہے کہ عبداللہ بن وہب کثیر العلم اور ثقہ تھے[۴]۔ علامہ سمعانی لکھتے ہیں "یہ وہی ہیں جنہوں نے اہل حجاز، اور اہل مصر کا علم محفوظ کر لیا تھا[۵]" اُن کی جلالتِ شان کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے مشائخ وقت اُن کو دیکھتے تھے تو فرطِ ادب سے اُن کے سامنے خم ہو جاتے تھے[۶]۔

عہدۂ قضاء سے انکار | اُن کے علمی و فقہی کمالات کی بنا پر خلیفۂ وقت نے اُن سے درخواست کی کہ مصر کے عہدۂ قضاء کو قبول فرمالیں، اُنھیں اس کی خبر ہوئی تو روپوش ہو کر خانہ نشیں ہو گئے اسی اثناء میں ایک دن اسد بن سعد نے ان کو اپنے گھر کے صحن میں وضو کرتے ہوئے دیکھ لیا، کہنے لگا "کیا آپ اسے پسند نہیں کرتے کہ باہر نکل کر لوگوں میں اللہ کی کتاب اور سنت نبوی کے مطابق حکم کریں؟" آپ نے یہ سُن کر سر اُٹھایا، اور جواب دیا "کیا تمہاری عقل بس یہیں تک پہنچی ہے کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ قیامت میں علماء انبیاء کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے اور قضاۃ کا حشر سلطان کے ساتھ ہوگا"[۷]

[۱] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۳، [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۹ [۳] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۳۔ [۴] کتاب الانساب للسمعانی ص ۴۴۲ [۵] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۳۔ [۶] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۹

خوفِ خدا | قرآنِ مجید میں خشیتِ ربانی کو علماء کا خاص شعار بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء اس کے مطابق حضرت عبداللہ بن وہب میں بھی خوفِ خدا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک دفعہ غسل کے لیے حمام میں داخل ہوئے وہاں کوئی قاری وہ آیۃ تلاوت کر رہا تھا جس میں فرمایا گیا ہے "واذ یتحاجون فی النار" آپ پر اس آیت کا اتنا شدید اثر ہوا کہ فوراً غشی طاری ہو گئی[1]۔ بلکہ آپ کی وفات بھی اسی خوفِ خدا کے ایک واقعہ کے سلسلہ میں ہوئی ہے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے آپ کے سامنے خود اُن کی تصنیف "کتاب اہوالِ یوم القیامۃ" کا کوئی حصہ پڑھ کر سُنایا، آپ اُس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ برداشت نہ کر سکے، بیہوش ہو کر گر پڑے۔ بات چیت بالکل بند ہو گئی، یہاں تک کہ اسی حالت میں چند روز کے بعد انتقال پر ملال ہو گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر سُن کر اُن کا قلب شق ہو گیا تھا، واللہ اعلم[2]

خوفِ خدا کی زیادتی کے باعث وہ اعمالِ خیر اور زہد میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ جن اعمال کو وہ اللہ کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی کا ذریعہ سمجھتے تھے اُن کو اگرچہ کسی نے نہ کیا ہو، وہ خود اُن اعمال پر شدت کے ساتھ عمل پیرا ہو جاتے تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:-

وکان ثقۃ حجۃ حافظا مجتہدا لا یقلد احدا اذا تعبد وتزھد[3]	ابن وہب معتبر حجت، حافظ، اور مجتہد تھے وہ عبادت اور زہد میں کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔

ان کو جہاد اور حج کا بڑا شوق تھا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چھتیس حج کیے تھے[4]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۱ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۳، [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰ [4] ایضاً

تصنیف | حضرت عبداللہ بن وہب نے جو کچھ علم حاصل کیا تھا، وہ ضیاع کے خوف سے اس کو مدون بھی کرتے رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مؤطا امام مالک کے طرز پر ایک موطا لکھی اس کے علاوہ فقہ میں بھی انہوں نے کئی کتابیں مرتب کیں، علامہ ابن خلکان کا بیان ہے:۔ "ولہ مصنفات فی الفقہ معروفۃ"[1] ایک کتاب جو قیامت کے احوال پر ہے اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ عبدالرحمن بن القاسم کہتے ہیں کسی شخص نے علم کی تدوین اتنی نہیں کی جتنی کہ ابن وہب نے کی ہے[2]

وفات | ماہ شعبان ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات کا عبرت انگیز واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے، حضرت سفیان بن عیینہ کو یہ خبر وحشت اثر ملی تو انہوں نے فرمایا "انا للہ وانا الیہ راجعون ابن وہب کی وفات سے مسلمانوں کو عموماً اور مجھ کو خصوصاً صدمہ عظیم پہنچا ہے[3]

عبدالرحمٰن بن مہدی

نام ونسب | عبدالرحمن نام، ابوسعید کنیت، والد کا نام مہدی تھا، بصرہ کے رہنے والے اور قبیلۂ ازد کے غلام تھے، موتیوں کی تجارت کرتے تھے اسی بنا پر ان کو لولوی کہا جاتا ہے بعض لوگ انہیں بنو تمیم کی ایک شاخ بنی العنبر کی طرف منسوب کر کے عنبری کہتے ہیں ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے[1]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۷۲، [3] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۰ و ۲۴۸

علم وفضل | علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار کبار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ حافظ ذہبی انہیں "الحافظ الکبیر والامام العلم الشہیر" لکھتے ہیں۔ علی بن المدینی کا بیان ہے کہ ابن المھدی سب سے بڑے عالم تھے۔ اگر میں رکن حطیم اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر قسم کھاؤں تب بھی میں یہی کہونگا کہ میں نے اُن جیسا یا اُن سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا، چونکہ غلام تھے اس لیے اُن کو بصرہ کے شریف وممتاز غلاموں میں سے سمجھا جاتا تھا۔[۲]

علم کی نسبت اُن کا نظریہ | علامہ ابن جوزی نے اُن کا ایک طویل مقولہ نقل کیا ہے جس سے علم کی حقیقت، اور اُس کی وقعت واہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں "کوئی شخص اگر کسی ایسے شخص سے ملاقات کرے جو اُس سے زیادہ عالم ہو تو وہ دن اُس کے لیے غنیمت کا دن ہے۔ اور اگر کسی ایسے شخص سے ملے جو علم میں اُس کا ہمپایہ ہو تو اُس کو چاہیے کہ اُس سے مذاکرہ کرے۔ اور پھر اُس سے فائدہ اُٹھائے، اور اگر اُس کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہو جو علم میں اُس سے کم مرتبہ ہے تو اُسے چاہیے کہ تواضع سے پیش آئے اور اُس کو کچھ سکھائے۔ اور جو شخص ہر سُنی ہوئی بات کو نقل کر دیتا ہو، یا ہر کس وناکس کی روایت کو قبول کر لیتا ہو اُسے علم کا امام نہیں کہا جا سکتا، اور نہ وہ امام ہو سکتا ہے جو شاذ روایتوں کے بیان کرنے میں بھی احتیاط سے کام نہ لیتا ہو۔"[۳]

حدیث | فنِ حدیث میں اُن کو بڑی مہارت تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں اُن کو حدیث کی طرف توجہ نہیں تھی۔ ابو عامر العقدی کا بیان ہے کہ "عبدالرحمٰن بن مہدی پہلے پہل وعظ وقصہ گوئی کی طرف مائل تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے کہا "آپ کو ان واعظوں اور قصہ گو

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۱ [۲] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۵ [۳] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲

حضرات سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، میرے اس کہنے کا اُن پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ حدیث کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوگئے[1] پھر اُنہوں نے اس میں وہ کمال پیدا کیا کہ سرآمدِ علماءِ حدیث بن گئے۔

علماء کا اعتراف | بڑے بڑے محدثین اُن کی اس فضیلت کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں "ابنِ مہدی اپنے زمانہ میں اصحابِ حدیث کے امام تھے، اور حدیث کے تمام علوم و معارف میں انہی پر اعتماد تھا[2]" صدقۃ بن الفضل کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ یحییٰ بن سعید القطان کے پاس آیا، اور حدیث سے متعلق بعض سوالات کیے، اُنہوں نے جواب دیا کہ تم عبدالرحمٰن بن مہدی کی ملازمت کرو، اور اس کے ساتھ ہی اُن کی روایت کی ہوئی چند حدیثیں بھی مجھ کو سنائیں، چنانچہ میں ابن مہدی کے پاس آیا، اور اُنہوں نے مجھ سے حدیثیں بیان کیں[3] علی بن مدینی بار بار کہتے تھے کہ اگر مجھ کو رکن اور مقام کے درمیان کھڑا کرکے بھی قسم لیجائے تو میں یہی کہونگا کہ میں نے ہرگز ابن مہدی سے بڑا کوئی عالم حدیث نہیں دیکھا[4]" ابو الربیع الزہرانی کا بیان ہے کہ میں نے ابن مہدی سے بڑھ کر ——— کسی شخص کو حدیث کا مبصر نہیں پایا[5]۔

علامہ سمعانی کتاب الانساب (ص ۴۹۶) میں لکھتے ہیں "عبدالرحمٰن بن مہدی پختہ کار حافظ، صاحبِ تقویٰ، اور جامع حدیث تھے اُنہوں نے تفقہ پیدا کیا، کتابیں تصنیف کیں اور حدیث کا درس دیا۔ وہ بجز ثقات کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے، اور اُنہوں نے ایک ایسی جماعت سے روایتیں نقل کی ہیں جس نے صحابہ کو پایا تھا۔"

---

[1] بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۰ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵ [3] بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۱
[4] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵ [5] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۰

قوتِ حافظہ اُن کی قوتِ حافظہ نہایت قوی تھی جو سُنتے تھے یاد رکھتے تھے اور مجال نہیں تھی کہ اس میں کوئی غلطی یا خطا واقع ہو جائے۔ اسی بنا پر لوگ اُن کی مہارتِ حدیث کو حافظہ سے تعبیر کرتے تھے[1] محمد بن یحییٰ کہتے ہیں "میں نے عبد الرحمن بن مہدی کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی میں نے اُن سے جو کچھ سُنا ہے زبانی سُنا ہے۔ وہ اپنی یاد سے روایت کرتے تھے[2]۔

احتیاط زبانی روایت کرنے میں اکثر غلطی کا احتمال رہتا ہے لیکن ابن مہدی اس معاملہ میں بیحد محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ روایت باللفظ کریں۔ اسماعیل بن اسحاق القاضی کا بیان ہے کہ علی بن مدینی غایت درجہ محتاط تھے۔ ایک دن انہوں نے عبد الرحمن بن مہدی کا امتحان لینے کی غرض سے اُن کے سامنے کوئی حدیث خلط ملط کر کے پیش کی لیکن انہوں نے فوراً پہچان لیا، اور کہا کہ یہ حدیث فلاں شخص سے اس طرح مروی ہوگی۔ بعد میں ہم نے اس کی تحقیق کی تو واقعی وہ حدیث اُسی طرح نکلی[3] ابو عبد اللہ سے کسی نے پوچھا "کیا عبد الرحمن بن مہدی حافظ تھے؟" بولے "ہاں! حافظ تھے اور وہ بڑی احتیاط کرتے تھے۔ وہ تحدیث باللفظ کو زیادہ پسند کرتے تھے[4]۔

تنقید شب و روز کی ممارست، اور صحیح قوتِ فیصلہ کی وجہ سے اُن میں تنقید حدیث کا ایک ایسا ملکہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بیک نظر صحیح کو سقیم سے جُدا کر لیتے تھے۔ خود اُن کا مقولہ تھا کہ کسی شخص کے لیے امام ہونا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ صحیح اور غیر صحیح میں امتیاز کرنے کی صلاحیت

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۱ [2] بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۷ [3] بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۵۔

[4] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۰

نہ رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ فرماتے تھے "حدیث کا پہچاننا بڑا مشکل کام ہے"[1] محمد بن ابی بکر المقدمی کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی جو کچھ سُنتے تھے اُسے اور جو نہیں سُنتے تھے اُسے دونوں کو خوب اچھی طرح پرکھ سکتے تھے۔ اور اس وصف میں میں نے اُن سے بڑا کوئی اور عالم نہیں دیکھا وہ یقیناً امام ثبت تھے اور یحییٰ بن سعید سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔[2]

ایک شخص نے اُن سے پوچھا "آپ صحیح حدیث کو غیر صحیح سے کس طرح متمیز کر لیتے ہیں؟" فرمایا "جس طرح طبیب مجنوں کو پہچان لیتا ہے"[3] علی بن مہدی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص عبدالرحمٰن بن مہدی کے پاس آیا اور دریافت کرنے لگا "اے ابو سعید! آپ فرماتے ہیں یہ راوی قوی ہے اور یہ ضعیف، اور یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ تو آپ کو یہ امتیاز کس طرح ہو جاتا ہے؟" ابن مہدی بولے "اگر تم کسی صراف کے پاس جا کر چند درہم اُس کو دکھاؤ اور وہ کہے کہ یہ درہم کھرے ہیں اور یہ کھوٹے۔ تو کیا تم اُس سے بھی پوچھو گے کہ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا، یا معاملہ اُس کے سپرد کر کے اُس پر بھروسہ کرو گے؟" سائل نے جواب دیا "میں تو معاملہ اُس کے ہی سپرد کر دوں گا" ابن مہدی نے فرمایا "بس ہم لوگوں کا حال بھی یہی ہے۔ کثرتِ مجالست، مذاکرہ اور بار بار کے غور و خوض کے بعد ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم صحیح حدیث کو غیر صحیح سے فوراً پہچان لیتے ہیں"[4]

ناقدین حدیث کا اُن پر اعتماد

اُن کی مہارتِ فن، وسعتِ نظر، اور صحیح قوت تنقید کے باعث اُس عہد کے تمام بڑے بڑے ناقدین حدیث اُن پر اعتماد کرتے، اور دوسروں پر اُن کی فوقیت

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲ [2] ایضاً ص ۳۰۳ [3] ایضاً ص ۳۰۲

[4] بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۶ [5] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵

کو تسلیم کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل تو یہاں تک فرماتے تھے کہ ابنِ مہدی کی پیدائش ہی حدیث کے لیے ہوئی ہے[1] ابن حبان انہیں خراجِ ستائش اس طرح پیش کرتے ہیں" وہ ثقہ تھے۔ اور حدیث کے پختہ کار حفاظ میں سے اور دین کے ارباب ورع میں سے تھے۔ انہوں نے حدیثیں حفظ کیں، جمع کیں، تفقہ حاصل کیا، تصنیف کا کام انجام دیا، اور حدیثوں کی روایت کی، اور وہ سوائے معتبر راویوں کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے تھے[2] خلیلی کا قول ہے کہ "وہ بخوفِ تردید امام ہیں" امام شافعی فرماتے ہیں" مجھ کو نہیں معلوم کہ دنیا میں اُن کی کوئی نظیر ہے یا نہیں"۔ علامہ ابن سعد کا ارشادِ حق بنیاد ہے کہ "وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے[3] علی بن مدینی فرماتے ہیں "یحییٰ بن سعید فنِ رجال میں بڑے ماہر تھے۔ اور عبدالرحمٰن بن مہدی علم حدیث میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے" انہی کا ایک اور مقولہ ہے کہ یحییٰ بن سعید اور ابن مہدی یہ دونوں اگر کسی راوی کے ترک پر متفق ہو جائیں تو میں اُسے چھوڑ دونگا لیکن اگر ان میں اختلاف ہو تو پھر میں ابن مہدی کا قول اختیار کرونگا، کیونکہ وہ زیادہ معتدل ہیں، اور یحییٰ میں تشدد ہے" ابو حاتم کہتے ہیں" حماد بن زید کے اصحاب میں ابن مہدی سب سے زیادہ صاحب تثبت ہیں۔ وہ امام ثقہ ہیں۔ اور یحییٰ بن سعید سے اثبت اور وکیع سے اتقن ہیں" ابن عمار کا بیان ہے کہ ابن مہدی وکیع سے زیادہ حدیث کے اختلافات کو جانتے اور پہچانتے تھے" ابو عبداللہ کہتے ہیں" کسی روایت کے بارہ میں وکیع اور عبدالرحمٰن دونوں کا اختلاف ہو جائے تو عبدالرحمٰن کا قول لینا چاہیے کیونکہ وہ اثبت اور قرآن مجید سے زیادہ قریب رہنے والے ہیں۔ امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ حضرت سفیان ثوری کی تقریباً

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۱ [3] ایضاً

پچاس حدیثوں میں عبدالرحمٰن بن مہدی اور وکیع بن الجراح کا اختلاف ہوا، پھر ہم نے تحقیق و تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ عام صواب عبدالرحمٰن کی طرف تھا" حضرت یحییٰ بن سعید سے کسی نے کہا۔ "ابوسعید! فلاں شخص کہتا ہے کہ ابن مہدی روایات کے قبول کرنے میں محتاط نہیں تھے، وہ کسی شیخ سے سماع حدیث کرتے تھے، اور کتاب اُن کی آستین میں ہوتی تھی" (یعنی اُس کو قلمبند نہیں کرتے تھے) یحییٰ کو یہ سُن کر غصہ آگیا اور کہنے لگے "عبدالرحمٰن کا سوتے سوتے سُننا بھی مجھ کو دوسروں کی اِملا سے زیادہ محبوب ہے"[1]

شیوخ اُنھوں نے جن شیوخ سے حدیث کا سماع کیا اُن میں چند نام یہ ہیں :-

ایمن بن نابل، یہ صغار تابعین میں سے ہیں، جریر بن حازم، عکرمہ بن عمار، خالد بن دینار، مہدی بن میمون، مالک، شعبہ، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، ہشام بن سعد، ہمام بن یحییٰ، مثنیٰ بن سعید الضبعی، ابراہیم بن نافع المکی، منصور بن سعد[2]۔

اگرچہ اُنھوں نے ان سب سے فیض حاصل کیا تھا، لیکن حضرت سفیان اور حضرت اعمش کی احادیث کے باب میں اُن کا علم نہایت وسیع تھا۔ ابو عبید کہتے ہیں۔ وکان معیناً بحدیث سفیان۔ علی بن مدینی کا بیان ہے کہ میں کوفہ آیا تو حضرتِ اعمش کی احادیث جمع کرنے میں مشغول ہوگیا پھر اسی سلسلہ میں بصرہ آکر حضرت ابن مہدی کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا حضرت! اب کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ کو اعمش کی احادیث سُنائے؟ ابن مہدی یہ سن کر غضبناک ہو گئے اور فرمایا" اس طرح کی باتیں اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں ہیں اور ہاں! ایسا ہے کون جس نے

---

[1] یہ سب معلومات خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۳ و ۲۴۴ سے ماخوذ ہیں۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۷۹

علم کے تمام گوشوں پر احاطہ کر لیا ہو۔ اور وہ سب اُس کے سینہ میں محفوظ ہو۔ تم جیسا شخص ایسی بات کہتا ہے! اچھا! تمہارے پاس لکھنے کے لیے کچھ ہے؟" میں نے کہا "جی ہاں" فرمایا "تو پھر لکھو" میں نے عرض کی "آپ لکھوانے سے قبل مجھ سے مذاکرہ کر لیجیے، ممکن ہے جو کچھ آپ لکھوائیں وہ میرے پاس موجود ہی ہو"۔ جواب دیا "نہیں! تم لکھو، میں تم کو وہی حدیثیں لکھواؤنگا جو تمہارے پاس نہ ہونگی"۔ ابن مدینی کہتے ہیں "اس کے بعد انہوں نے مجھ کو تیس ایسی حدیثیں لکھوائیں جن میں سے ایک بھی میری سُنی ہوئی نہ تھی"[1]۔

تلامذہ | اُن کے داماں علم سے وابستہ ہو کر جنہوں نے فیض حاصل کیا اُن میں اُن کے صاحبزادے موسیٰ، احمد، اور اسحاق وعلی کے علاوہ عبداللہ بن مبارک، ابن وہب، یحییٰ بن معین، یحییٰ بن یحییٰ، ذہلی، ابوخیثمہ، احمد بن سنان شامل ہیں۔

شوقِ حدیث | حضرت ابن مہدی کو احادیث جمع کرنے کا جو شوق تھا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ اُن سے کسی نے پوچھا "خدا آپ کا ایک گناہ معاف کر دے۔ آپ کو یہ زیادہ محبوب ہے، یا یہ کہ اس کے بدلہ میں آپ ایک حدیث حفظ کر لیں" بولے "حفظِ حدیث"[2]

درس | معلوم ہوتا ہے اُنہوں نے طلب علم کے زمانہ ہی میں درس دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں "میں ابھی امام مالک کے حلقۂ درس میں شامل ہوتا ہی تھا کہ لوگ مجھ سے حدیثیں لکھتے تھے"[3]

اُن کی مجلسِ درس نہایت باوقار و پُررعب ہوتی تھی۔ احمد بن سنان کہتے ہیں "کوئی شخص ابنِ مہدی کے درس میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ قلم بھی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ نہ کوئی

---

[1] بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۵ [2] ایضاً ص ۲۴۲ [3] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۸۰

کھڑا ہوتا تھا۔ سب حاضرین مجلس نہایت خاموشی کے ساتھ اُن کی تقریر سُننے میں محو رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ نماز میں ہیں[1]۔

فقہ | حدیث کی طرح اُن کو فقہ میں بھی کمال تھا۔ ابن عماد الحنبلی لکھتے ہیں۔ کان فقیہاً مفتیاً عظیم الشان[2]۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "وہ یحییٰ القطان سے بڑے فقیہ تھے[3]" کسی شخص نے اُن سے پوچھا "کیا عبدالرحمٰن بن مہدی فقیہ نہیں تھے؟" فرمایا "وہ فقہ میں بڑا کمال رکھتے تھے یہاں تک کہ یحییٰ سے بھی زیادہ وسیع النظر تھے۔ حضرت یحییٰ کوفیوں کے اقوال کی طرف زیادہ رجحان رکھتے تھے۔ اور ابن مہدی بعض مذاہب حدیث کی پیروی کرتے اور اہل مدینہ کی رائے کو زیادہ وقعت دیتے تھے[4]" ایک مرتبہ سلیمان جوحج کے مسائل میں بڑی وسیع اور دقیق نظر رکھتے تھے حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی کے پاس آئے اور اُن کو چھیڑنے کے لیے کہنے لگے "اب کوئی ایسا شخص نہیں رہا ہے جو حج کے مسائل میں ہماری مفید رہنمائی کرے" ابن مہدی نے یہ سُن کر امتحاناً پوچھا "آپ اُس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے حج کے تمام ارکان سوائے طواف بیت اللہ کے ادا کرلیے لیکن طواف سے قبل بیوی سے مباشرت کر بیٹھا" سلیمان نے جواب میں ایک حدیث پڑھی جس کا مفاد یہ تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی آئندہ سال حج کی قضا کریں۔ اور اُس میں اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ پہلے حج میں جس جگہ مجتمع تھے[5] وہاں متفرق ہوجائیں اور جہاں جُدا تھے وہاں اکٹھے ہوجائیں۔ ابن مہدی بولے "اس بات کے لیے کوئی روایت کہیے کہ کب مجتمع ہوں اور کب متفرق؟" سلیمان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۵ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲
[4] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۱ [5] یعنی جہاں مباشرت کی تھی۔

اس موقع پر خاموش ہو گئے۔ پھر ابن مہدی نے ارشاد فرمایا "اچھا! تم اب لکھو" انہوں نے لکھنا شروع کیا تو حضرت عبدالرحمٰن نے اس ایک نشست میں ہی تیس مسئلے لکھا دیے اور ہر مسئلہ کے لیے ایک ایک یا دو دو حدیثیں بھی قلمبند کرائیں۔[1] ان کے کمالِ تفقہ کی وجہ سے معاذ بن معاذ کہتے تھے "بصرہ میں اب ایک شخص کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو "قضا" کی صلاحیت رکھتا ہو کسی نے ان سے پوچھا "وہ ایک شخص کون ہے؟" جواب دیا "عبدالرحمٰن بن مہدی"[2]

مرجع خلق | اپنے علمی تبحر، وسعتِ نظر، اصابتِ رائے اور ثقاہت کی بنا پر لوگ خیل در خیل اپنے دینی اور دنیوی معاملات میں اُن کی ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایوب بن المتوکل کا بیان ہے "ہمیں جب کبھی کسی دینی یا دنیوی معاملہ میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو ہم عبدالرحمٰن بن مہدی کے گھر چلے جاتے تھے"[3] اور یوں بھی لوگ اُن سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ محمد بن حسان الازرق نے ایک مرتبہ اُن سے کوئی روایت نقل کی تو اُن کا نام لینے کے بعد کہا "وکان قرۃ عین" وہ آنکھوں کی ٹھنڈک تھے[4]

عبادت | ابن مہدی جس طرح آسمانِ علم و فضل کے آفتابِ درخشندہ تھے زہد و عبادت میں بھی ابنائے عصر سے امتیاز رکھتے تھے۔ وہ صحیح معنی میں زاہدِ شب زندہ دار تھے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے۔ کان ابی یحیی اللیل کلہ[5] ان کا معمول تھا کہ شب میں نصف قرآن اور دو راتوں میں پورا قرآن مجید ختم کر دیتے تھے[6] ایک دفعہ وہ رات بھر عبادتِ الٰہی میں جاگتے رہے۔ فجر کا وقت

---

[1] بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۵، ۲۴۶ - [2] ایضاً ص ۲۴۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲
[4] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۲۴۷ [5] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۰۵ [6] ایضاً

نزدیک آیا تو اتفاق سے اُن کی آنکھ لگ گئی، اور نیند کا ایسا شدید غلبہ ہوا کہ نماز ہی قضا ہوگئی۔ بیدار ہونے پر انہیں اس کا سخت ملال ہوا، اُن کے صاحبزادہ کا بیان ہے کہ اُنھوں نے اس کوتاہی کی مکافات کرنے کے لیے اس بات کا عہد و پیمان کیا کہ وہ دو ماہ تک اپنے جسم اور زمین کے درمیان کسی چیز کو حائل نہ ہونے دینگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جسم کا حصہ زیریں زخمی ہوگیا[۱]"

زہد و ورع: اُن کے زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی چیز میں ذرا بھی شک ہو جاتا تو خواہ وہ کتنی ہی پُر منفعت ہو، اسے بے تامّل ترک کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے "اگر تم کسی چیز کو اللہ کی خوشنودی اور اُس کا ثواب حاصل کرنے کے لیے ترک کروگے تو وہ گھوم گھام کر آخر کار تم کو ہی ملیگی"۔ چنانچہ اس کے بعد وہ خود اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں "میں اور میرا بھائی دونوں ایک تجارت میں شریک تھے۔ اس میں ہم کو غیر معمولی نفع ہوا لیکن جب تقسیم منافع کا وقت آیا تو میرے دل میں اُس مال کی نسبت کوئی شبہ پیدا ہوگیا اور میں نے "دع ما یریبك الی ما لا یریبك" کے مطابق اُس سے اپنے بھائی کے حق میں دستبرداری دیدی۔ لیکن خدا کی شان دیکھیے میری وفات سے پہلے ہی وہ سب مال مجھ کو اور میرے بیٹے کو مل گیا۔ اور اُس کی صورت یہ ہوئی کہ میرے شریکِ تجارت بھائی نے اپنی تین لڑکیوں کی شادی میرے لڑکوں سے اور میں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی بھائی کے لڑکے سے کردی تھی۔ اس کے بعد اتفاق یہ ہوا کہ بھائی کا انتقال ہوگیا اور میرے والد ماجد اُس کے ترکہ کے وارث ہوئے۔ پھر جب والد کی وفات ہوئی تو وہ سب مال میری میرے فرزند کی طرف منتقل ہوگیا[۲]"

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲   [۲] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۳۔

ایک مرتبہ انھوں نے کسی زمین کے بیچنے کا ارادہ کیا تو اُس کی قیمت فی جریب ڈھائی سو دینار قرار پائی۔ اس پر دلال نے کہا "آپ کو اس ویران زمین کی اتنی قیمت مل رہی ہے، اگر میں اور آپ کا غلام دونوں مل کر اس میں کھاد ڈال دیں اور اس طرح اسے درست کرلیں تو آپ کو ایک جریب پر پچاس دینار اور زیادہ مل جائینگے اور پھر پوری زمین کی قیمت میں آپ کو چار ہزار دینار ملینگے۔ یہ رقم بہت کافی ہے، آپ اجازت دیجیے کہ ہم ابھی نہیں بلکہ درست کرنے کے بعد اس زمین کو فروخت کریں"۔ ابن مہدی کو یہ سن کر غصہ آگیا، اور فرمایا "کیا: صرف چار ہزار دینار! اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی "لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث فاتقوا اللہ یا اولی الالباب۔ نہیں ہرگز نہیں اس طرح تو مجھ کو چار ہزار چھوڑ ایک لاکھ بھی ملیں، میں اُسے بھی قبول نہیں کرونگا"[1]

حصولِ ثواب کا شوق اجر و ثواب حاصل کرنے کا شوق اس درجہ تھا کہ فرماتے تھے "اگر مجھ کو اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ اللہ کی معصیت کا ارتکاب ہوگا، تو میں اس بات کی تمنا کرتا کہ شہر کا ایک ایک شخص مجھ کو بُرا کہے، اور میری غیبت کرے۔ بھلا اُس نیکی سے بڑھ کر انسان کے لیے کیا چیز ہوسکتی ہے کہ جس کو اُس نے نہ خود کیا ہو، اور نہ اُس کا اُسے علم ہو، اور اس کے باوجود قیامت کے دن جب اُس کا صحیفۂ اعمال کھولا جائے تو وہ نیکی اُس میں موجود ہو"[2]

عقائد میں تشدد اپنے عقائد و خیالات میں نہایت تشدد تھے۔ اُن کا مقولہ تھا "اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو جو لوگ قرآنِ مجید کو مخلوق مانتے ہیں میں اُن کی گردن اڑا کر دجلہ میں غرق کردیتا"[3]

---

[1] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۳ [2] ایضاً ص ۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۲۔

خضاب | پینتالیس یا چھیالیس[1] سال کی عمر میں بال سفید ہونے شروع ہو گئے تھے، آپ اُن پر خضاب لگاتے تھے[1]۔

وفات | بصرہ میں بماہ جمادی الاخریٰ ۱۹۸ھ، تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ولید بن مسلم

نام ونسب | ولید نام ابو العباس کنیت والد کا نام مسلم تھا، بنو اُمیہ کے شاہی غلام (رقیق الامارۃ) تھے اس لیے اموی لکھے جاتے ہیں وطن دمشق تھا۔

ولادت | ۱۱۹ھ میں ہوئے

علم وفضل | ولید اگرچہ غلام کے گھر میں پیدا ہوئے تھے، لیکن انہوں نے اسلامی سوسائٹی کے ماحول سے متاثر ہو کر اور اپنی ذاتی محنت وشوق سے باعتبار علم وفضل وہ مرتبۂ بلند حاصل کیا جو کسی خوش نصیب کو ہی میسر ہو سکتا ہے، علامہ نووی لکھتے ہیں "علماء کا اُن کی جلالت شان، علم میں اُن کے رتبۂ بلند، اور توثیق پر اتفاق ہے[2]" حافظ ذہبی انہیں "الامام الحافظ" لکھتے ہیں۔ ابن ناصر الدین کا بیان ہے کہ "ولید امام حافظ، اور دمشقیوں کے عالم تھے[3]"

حدیث | انہوں نے حدیث کا سماع وقت کے ائمۂ حدیث سے کیا تھا جن میں سے چند نام یہ ہیں: یحییٰ بن الحارث الذماری، ثور بن یزید، محمد بن عجلان، ہشام بن حسان، ابن جریج

[1] بغدادی ج ۱۰ ص ۱۴۲۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۴۷ [3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۴۴

مثنیٰ بن الصباح، امام اوزاعی، یزید بن ابی مریم، صفوان بن عمرو۔ اور اُن سے جنہوں نے روایت کی ان کی تعداد بہت زیادہ ہے بعض مشہور یہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابن المدینی، ہشام بن عمار، ابوخیثمہ، علی بن محمد، موسیٰ بن عامر۔

حدیث میں اُن کا مرتبہ نہایت بلند تھا، ابوالیمان کہتے ہیں "میں نے ولید بن مسلم ایسا کوئی نہیں دیکھا" صدقہ بن الفضل المروزی کا بیان ہے "طویل طویل حدیثوں کو یاد رکھنے میں میں نے ولید سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں دیکھا۔ انہیں ابواب کی حدیثوں پر حدیثیں یاد تھیں[1]" ابراہیم بن المنذر بیان کرتے ہیں "ایک مرتبہ مجھ سے علی بن المدینی نے فرمائش کی کہ میں ان کو حضرت ولید بن مسلم کی بعض احادیث سناؤں، میں نے کہا "سبحان اللہ! آپ کے سماع سے میرے سماع کو کیا نسبت ہو سکتی ہے؟" وہ بولے "ولید جب شام آئے تو اُن کے پاس علم کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، اور میں اُس سب سے فیضیاب نہیں ہو سکتا تھا" میں نے اُن کو کچھ حدیثیں سنائیں تو بہت متعجب ہوئے اور کہنے لگے "واقعی ولید بالکل ٹھیک کہتے تھے"۔

وہ احادیث کی بغیر تنقید و تحقیق کے روایت نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف انہی روایات کو لیتے تھے جن پر اُن کو اچھی طرح اعتماد اور جن کی صحت کا یقین ہو جاتا تھا، اور یہی دراصل ایک محدث کا سب سے پہلا اور اہم فریضہ ہے، اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے محدث محدث کہلاتا ہے۔ ولید بن مسلم اسی صفت کی بنا پر محدث کہلاتے تھے۔ ابوحاتم سے محمد بن ابراہیم نے دریافت کیا "آپ ولید بن مسلم کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟" بولے "وہ صالح الحدیث تھے"

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۹۔

امام احمد بن حنبل نے ابوزرعۃ الدمشقی سے کہا تین بزرگ واقعی اصحابِ حدیث ہیں، مروان بن محمد، ولید بن المسلم، اور ابومسہر۔ یعقوب بن سفیان کہتے ہیں وہیں اپنے اصحاب سے سنتا تھا کہ لوگوں کا علم صرف دو شخصوں کے پاس ہے، اسماعیل بن عیاش، اور ولید بن المسلم، لیکن ولید کو تو میں جانتا ہوں کہ وہ نہایت قابلِ تعریف طریقہ سے اپنے طریقہ پر اخیر وقت تک چلتے رہے۔ وہ اہل علم کے نزدیک پسندیدہ، قابلِ اعتماد و اعتبار، صحیح، اور صحیح العلم تھے[1]

انہوں نے حدیث کے لیے ابنِ جابر کی سترہ سال تک مصاحبت و ملازمت کی تھی۔

امام اوزاعی سے اُن کو بڑا اختصاص تھا، وہ اگر کسی شیخ سے کوئی روایت سُننی بھی چاہتے تھے تو پہلے امام اوزاعی سے اس کی نسبت استفسارِ حال کر لیتے تھے[2]

احتیاط | وہ اگرچہ قوی الحافظہ تھے لیکن پھر بھی حدیث کے معاملہ میں صرف حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جو کچھ سنتے تنقیح و تحقیق کے بعد اُسے لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ شدہ شدہ ان کے مسودات ستر کتابوں کی شکل میں ہو گئے۔ اُن کی یہ کتابیں نوع بنوع احکام کی احادیث کا مجموعہ تھیں جو شریعت کے ایک جامع دستور کا کام دے سکتی تھیں۔ چنانچہ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ جو شخص ولید بن مسلم کی کتابوں کو لکھ لیگا اُس میں عہدۂ قضا کی صلاحیت و اہلیت پیدا ہو جائیگی[3]

تاریخ | حدیث کے علاوہ اُن کی تاریخی معلومات بھی وسیع تھیں، اور اس موضوع پر بھی اُنہوں نے کتابیں تصنیف کی تھیں، حافظ ذہبی لکھتے ہیں "اُنہوں نے کثرت سے کتابیں لکھیں اور تاریخی تصنیفات بھی کیں۔ اور اُن کو اس موضوع سے بڑی دلچسپی تھی[4]۔ ابوزرعۃ الرازی کا بیان ہے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۲، [2] ایضاً ص ۱۵۲، [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۹ [4] ایضاً ۲۷۸

کہ ولید مغازی کے علم میں وکیع سے بڑے عالم تھے۔[1]

جلالت علم بعض ناقدین حدیث نے کہا ہے کہ ولید کبھی کبھی ضعیف راویوں سے احادیث روایت کر دیتے تھے، اور کبھی وہ تدلیس بھی کرتے تھے۔ یعنی جس شخص سے روایت سنتے تھے اس کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ اس سے اوپر کے شیخ کا نام لے کر کسی غیر واضح صیغہ کے ساتھ حدیث کی روایت کرتے تھے۔ لیکن ان پر یہ گرفت محض فنی ہے ورنہ ان کی جلالتِ علم اور کمالِ فضل پر سب کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبی فنِ تنقیدِ رجال کے امام ہیں، فرماتے ہیں "ولید کے علم اور ان کے حفظ میں کوئی نزاع نہیں ہے، البتہ وہ مدلس تھے اس لیے جب تک سماع کی تصریح نہ کریں ان سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔"[2] علامہ ابن سعد انہیں "ثقہ کثیر الحدیث" لکھتے ہیں۔[3]

عقل و فرزانگی فہم و خرد کے لحاظ سے بھی وہ ارباب کمال میں نہایت ممتاز تھے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "میں نے اہل شام میں ان سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں دیکھا۔"[4]

اخلاق و عادات کمال علم و فضل کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات بھی نہایت کریمانہ اور بزرگانہ تھے۔ ہشام بن عروہ سے کسی نے ان کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے کہا "ولید بہت بڑے عالم، صاحب زہد و ورع، اور متواضع و منکسر الطبع تھے۔"[5]

وفات ۱۹۴ھ میں حج سے فارغ ہو کر آ رہے تھے کہ دمشق پہنچنے سے قبل ایک موضع ذی المروۃ میں بیمار ہوئے۔ اپنے ایک دوست حرملہ بن عبد العزیز کے مکان پر قیام کیا اور وہیں مرغ روح

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۲ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۲
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۹ [5] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۵۵۔

قفس عنصری سے پرواز کرکے آشیانۂ قدس میں پہنچ گیا۔[1]

حماد بن زید

نام ونسب | حماد نام، ابو اسمٰعیل کنیت تھی۔ والد کا نام زید تھا، جریر بن حازم کے خاندان کے غلام تھے، ان کے دادا درہم سجستان کی جنگ میں گرفتار کرکے غلام بنا لیے گئے تھے۔[1]

ولادت | ۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں ہی آنکھوں کی نعمت سے محروم ہو گئے تھے اور اس بنا پر ضریر (نابینا) کہلاتے تھے۔

علم وفضل | انہوں نے علم کی تحصیل طفولیت میں ہی شروع کردی تھی یحییٰ کا بیان ہے "ایوب کے پاس حماد کے سوا کوئی اور حدیثوں کی کتابت نہیں کرتا تھا"، ابن ابی خثیمہ کہتے ہیں "ایک شخص نے عبیداللہ بن عمر سے دریافت کیا" حماد لکھنا بھی جانتے تھے یا نہیں"؟ بولے "ایک مرتبہ میں بارش کے دن میں حضرتِ حماد کے پاس آیا تو میں نے خود دیکھا کہ وہ لکھتے جاتے اور پھر پھونکیں مار مار کر اُسے خشک کرتے جاتے تھے"۔[2]

نابینا ہو جانے سے صورتاً جو تھوڑا بہت نقص پیدا ہو گیا تھا حماد نے اُس کی مکافات اس طرح کی کہ اپنی ذاتی محنت وکوشش اور شوق والتفات سے علمِ حدیث کے نمایاں شیخ بن گئے، چنانچہ حافظ ذہبی انہیں "الامام الحافظ المجود شیخ العراق" لکھتے ہیں۔ علامہ نووی

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۱ [3] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱

لکھتے ہیں "وہ امام عالیمقام ہیں جن کی جلالت وعظمت پر سب کا اتفاق ہے"۔ علامہ ابن سعد فرماتے ہیں "حماد ثقہ، معتمد، برہانِ حق، اور کثیر الحدیث تھے"۔

ائمہ علم کا اعتراف اُن کے عہد کے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے اُن کی جلالت وعظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ابنِ مہدی کا بیان ہے "اپنے اپنے زمانہ کے ائمہ چار ہیں:۔ ثوری، مالک، اوزاعی، حماد بن زید" یحییٰ بن یحییٰ کہتے ہیں "میں نے حماد سے زیادہ کوئی حافظ روایات نہیں دیکھا" یحییٰ بن معین کہتے ہیں "حماد بن زید سے زیادہ ثابت فی الحدیث کوئی نہیں ہے" امام احمد بن حنبل ان لفظوں میں حماد کے کمال علم وعمل کی داد دیتے ہیں:۔

هو من ائمة المسلمين من اهل الدين وهو احبّ اليّ من حماد بن سلمة

وہ مسلمانوں کے ائمہ میں سے ہیں اور بڑے دیندار ہیں، اور مجھ کو حماد بن سلمہ سے زیادہ پسند اور محبوب ہیں

ابن مہدی کا ایک دوسرا قول ہے "میں نے حماد سے بڑا کوئی شخص عالمِ سنت نہیں دیکھا اور نہ علم میں حماد، مالک اور سفیان سے افضل واعلیٰ کوئی شخص دیکھا"۔ ایک روایت میں ابنِ مہدی کے الفاظ اس طرح نقل کیے گئے ہیں "کہ میں نے حماد سے بڑا کوئی عالم دیکھا ہی نہیں یہاں تک کہ سفیان اور مالک کو بھی حماد سے بڑا عالم نہیں پایا"۔ ابو عاصم کا بیان ہے "حماد بن زید کی حیات میں اُن کی سیرت واخلاق کے لحاظ سے دنیا میں اُن کا کوئی مثل موجود نہ تھا"۔ یزید بن زریع انہیں "سید المسلمین" کہہ کر پکارتے ہیں۔ محمد بن مصفیٰ کا بیان ہے کہ میں نے بقیۃ سے سُنا، وہ کہتے تھے "ما رأيتُ بالعراق مثل حماد

لہ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۶۷ ٭ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱

بن زیدؒ میں نے عراق میں حماد بن زید ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا" وکیع فرماتے ہیں "ہم حماد کو بجز مسعر کے اور کس کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں" یزید بن زریع سے کسی نے پوچھا "آپ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ میں کس کو افضل قرار دیتے ہیں؟" فرمایا "حماد بن زید تو حماد بن زید ہی ہیں رہے حماد بن سلمہ تو وہ رجل صالح تھے" عبداللہ بن معاویۃ الجمحی کہتے ہیں "ہم نے حماد بن زید سے حدیثیں سُنی ہیں، اور حماد بن سلمہ سے بھی لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو دینار اور درہم میں ہوتا ہے"[1]

حافظہ | اُن کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ عجلی کہتے ہیں "حماد بن زید کو چار ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ اور اُن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی"[2]

احتیاط | اس درجہ علم وفضل اور قوت حافظہ کے باوجود حدیث روایت کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں "حماد بن زید، حماد بن سلمہ اور دوسرے ثقات سے زیادہ ثابت فی الحدیث ہیں لیکن ابن زید اس وصف میں مشہور ہیں کہ وہ اسانید کو مختصر کر دیتے ہیں اور کبھی مرفوع کو موقوف بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنی احتیاط کی وجہ سے بڑی شکی تھے۔ وہ عظیم المرتبت تھے، اُن کے پاس کتاب نہیں تھی جس کی طرف وہ رجوع کر سکتے پس کبھی وہ سلسلۂ اسناد کو صحابی سے آگے بڑھا کر حدیث کو مرفوع کر دیتے تھے اور کبھی مرفوع کو موقوف وہ حدیث بیان کرتے وقت خوفزدہ ہو جاتے تھے"[3]

فقہ | حدیث کے ساتھ فقہ میں بھی امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ابو اُسامہ کہا کرتے تھے

---

[1] یہ اقوال تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۱، ۲۱۲ سے ماخوذ ہیں [2] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱
[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۲ [4] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۱۔

"تم جب حماد بن زید کو دیکھو گے تو کہو گے کہ ان کو کسریٰ نے ادب اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فقہ سکھایا ہے[1]" ابن مہدی کا بیان ہے "میں نے بصرہ میں حماد سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا[2]"

عقلمندی دنیوی معاملات میں بھی بڑی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ خالد بن خراش کا بیان ہے "حماد بن زید عقلاء روزگار اور دانشوران زمانہ میں سے تھے[3]" ابن الطباع کا قول ہے "میں نے حماد بن زید سے بڑا کوئی عقلمند نہیں دیکھا[4]"

وفات ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

ابن جریج القرشی

نام ونسب عبدالملک نام، ابوالولید یا ابوخالد کنیت، والد کا نام عبدالعزیز تھا، ان کے دادا جریج ام حبیب بنت جبیر کے جو عبدالعزیز بن عبداللہ کی بیوی تھی، غلام تھے۔ ابوالولید اپنے دادا کی نسبت سے ہی ابن جریج کہلاتے ہیں اور ان کے ہی ولاء کے تعلق سے انہیں قرشی یا اموی کہا جاتا ہے۔

پیدائش ۸۰ھ میں مکہ میں پیدا ہوئے، لیکن آبائی وطن روم تھا۔

تعلیم وتربیت ابن جریج کو شروع سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا، لیکن شروع شروع میں عربی شعروشاعری اور علم انساب کی طرف مائل رہے، کہولت کی عمر میں انہوں نے حدیث کی طرف

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۲ [2] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰ [3] ایضاً [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۲

توجہ کی تو اس شان کے ساتھ کہ تمام چیزوں سے قطع تعلق کرکے ہمہ تن حدیث میں مشغول ہو گئے اور اس سلسلہ میں پورے اٹھارہ برس تک حضرت عطا ابن ابی رباحؒ کے دامن علم و فضل سے وابستہ رہے۔ اُن کے آغازِ شباب تک بعض بعض صحابہؓ حیات تھے، اگر ان کو اُس وقت حدیث کی طرف توجہ ہوتی تو کئی ایک صحابہؓ سے سماع حدیث کا شرف حاصل کر سکتے تھے[1] غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ نووی اُن کو تبع تابعین میں شمار کرتے ہیں[2]۔

علم و فضل | علم و فضل کے لحاظ سے ابن جریج کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ حافظ ذہبی انھیں الامام الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں[3]، امام نووی فرماتے ہیں "علماء سلف و خلف کے اقوال ابن جریج کی ثنا اور اُن کے مناقب کے ذکر میں ناقابل شمار ہیں[4]" امام احمد بن حنبل ان کو علم کا ظرف[5] اور عطا ابن رباح اہل حجاز کا سردار کہتے تھے[6]۔

حدیث | انھوں نے حدیث کا فن سیکھنے کے لیے حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق حضرت عطا ابن ابی رباح کی معیت و ملازمت کا شرف سترہ سال تک حاصل کیا، اس کے بعد سات سال تک وہ حضرت عمرو بن دینار کی خدمت میں رہے[7]۔ اِن دو بزرگوں کے علاوہ انھوں نے وقت کے جن یگانۂ روزگار ائمۂ حدیث سے استفادہ کیا، اُن میں امام زہری، حضرت نافع، عمرو بن شعیب، میمون بن مہران، مجاہد، زید بن اسلم، صالح بن کیسان، ایوب السختیانی وغیرہ شامل ہیں۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۲۶ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۹۷ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰
[4] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۹۷ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰ [6] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۹۷
[7] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۴۔

حضرت عطاء کی طویل مصاحبت و ملازمت کی وجہ سے ابن جریج ان کے علوم و فنون کے سب سے زیادہ معتبر ترجمان اور شارح سمجھے جاتے تھے۔ امام احمد فرماتے ہیں "ابن جریج اثبت الناس فِي عطاءٍ" اور خود اُستاد کو بھی شاگرد پر بڑا اعتماد تھا، چنانچہ اُن سے کسی نے پوچھا "ہم آپ کے بعد کس سے سوال کیا کریں؟" تو فرمایا "ابن جریج سے، اگر وہ زندہ رہیں" پھر فرمایا "ابن جریج اہل حجاز کے بہترین نوجوان ہیں" ابن المدینی کا بیان ہے "میں نے اسانید کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف چھ آدمیوں میں دائر سائر ہیں، اُن میں ایک ابن جریج بھی ہیں[۱]"۔

امام ذہلی فرماتے ہیں "جب ابن جریج حَدَّثنی یا سَمِعتُ کہیں تو اُن کی حدیث قابلِ احتجاج ہے۔ اُن کا شمار امام زہری کے اصحاب کے طبقۂ اولیٰ میں ہے[۲]" سلیمان بن النضر کہتے ہیں "میں نے ابن جریج سے زیادہ کوئی شخص صادق اللہجہ نہیں دیکھا" یحییٰ بن سعید امام نقد و جرح ہیں وہ بھی انہیں "صدوق" مانتے ہیں[۳]۔

تصنیف ابن جریج کے لیے یہ امر کچھ کم باعثِ فخر نہیں ہے کہ وہ اُن بزرگانِ اُمت میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے تدوین احادیث کی خدمت انجام دی، اور احادیث کا جو ذخیرہ اب تک صرف زبانوں پر تھا، وہ کتابوں کے سینہ میں محفوظ ہو گیا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "اسلام میں سب سے پہلے جس نے تصنیف کی وہ ابن جریج اور ابن ابی عروبہ ہیں[۴]" ابن خلکان میں ہے "اَنّہ اوّل من صنّفَ الکتبَ فی الاسلام[۵]" حضرت عمر بن

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۴ [۲] ایضاً ص ۴۰۶ [۳] ایضاً ص ۴۰۴ و ۴۰۵ [۴] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۹۷
[۵] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۶

عبدالعزیز کی تحریک سے اس عہد میں علماء حدیث کو تدوین حدیث پر توجہ ہو چکی تھی مختلف مقامات کے ائمہ اعلام نے اپنے اپنے شہروں کی احادیث کو جمع کیا۔ ابن جریج چونکہ حجاز میں تھے۔ اس لیے انہوں نے اہل حجاز کی احادیث مدوّن و مرتب کیں، انہوں نے جس کاوش اور محنت سے یہ عظیم الشان کام انجام دیا انہیں خود اس پر ناز تھا، چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا "کسی نے میری طرح علم مدوّن نہیں کیا۔"

حضرت ابن جریج کو شروع سے یہ خیال رہتا تھا کہ وہ جو کچھ حاصل کریں اس کو اس طرح اپنی زندگی میں محفوظ کر جائیں کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ ولید بن مسلم بیان کرتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ امام اوزاعی اور دوسرے علماء سے پوچھا "آپ نے علم کس کے لیے حاصل کیا ہے؟" سب نے باتفاق جواب دیا "اپنے نفس کے لیے" اس مجمع میں صرف ایک ابن جریج ایسے تھے جنہوں نے فرمایا "میں نے علم لوگوں کے لیے حاصل کیا ہے" ان کی کتابیں گویا علم کی ایک گراں قدر امانت تھی جو وہ امت کے سپرد کر گئے تھے، چنانچہ یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں "ہم ابن جریج کی کتابوں کا نام "کتب الامانت" رکھتے تھے[1]

بعض لوگوں نے ان پر تدلیس کا الزام لگایا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بعض اوقات جس شیخ سے حدیث سنتے ہیں اس کا نام نہیں لیتے بلکہ اس شخص کا نام لے دیتے ہیں جس سے ان کے راوی نے حدیث سنی ہے، اور روایت میں صیغہ ایسا بولتے ہیں جس سے متبادر ہوتا ہے کہ خود انہوں نے اصل راوی سے حدیث کا سماع کیا ہے۔ اس بنا پر یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ ابن جریج اگر کسی روایت

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۴۔

تو حدثنی کہہ کر نقل کریں تو سمجھو کہ اُنھوں نے خود سماع کیا ہے، اور اگر وہ اخبرنی کہیں تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اُنھوں نے اپنے شیخ پر اس حدیث کی قرأت کی ہے لیکن جب وہ قال کہہ کر کسی حدیث کو بیان کریں تو وہ ہوا کے مشابہ ہے لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ محض ایک فنی گفتگو ہے ورنہ حضرت ابن جریج کی صداقت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، چنانچہ حافظ ابن حجر جنہوں نے واقعہ بالا نقل کیا ہے وہ خود فرماتے ہیں: "وکان ثقۃ کثیر الحدیث"[1] اور اُنھوں نے یحییٰ بن سعید کا بھی قول نقل کیا ہے: "کان ابن جریج صدوقاً"

فقہ | اُن کو فقہ میں بھی یکساں کمال حاصل تھا۔ حافظ ذہبی انہیں "فقیہ الحرم" کے معزز خطاب سے یاد کرتے ہیں، امام نووی تحریر کرتے ہیں "تم یاد رکھو کہ ابن جریج ہمارے پرانے سلسلہ کے شیخ اور امام ہیں، کیونکہ امام شافعی نے ایک واسطہ سے فقہ انہی سے حاصل کیا ہے"[2] ابن حبان کہتے ہیں "ابن جریج اہل حجاز کے فقیہ، قاری، اور ثقہ لوگوں میں سے تھے"[3]

قرأت | قرأت میں بھی اُن کو بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ حافظ ذہبی، عبد الرزاق کی روایت سے لکھتے ہیں "وہ قراء کے بادشاہوں میں سے تھے"[4] ابن حبان کا قول ابھی اوپر گذر چکا ہے۔

عبادت | ان تمام علمی کمالات کے باوصف وہ نہایت درجہ عابد مرتاض تھے۔ جب نماز پڑھتے تھے تو پیکرِ خشوع وخضوع بن جاتے تھے۔ عبد الرزاق کا بیان ہے کہ میں نے اُن سے بہتر طریقہ پر کسی کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا[5]۔ ابن عاصم کہتے ہیں "ابنِ جریج بڑے عبادت گذار تھے۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۵ [2] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۹۸ [3] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۰۶

[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۲ [5] تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۹۷۔

وہ تین دن کے علاوہ ہمیشہ مہینہ بھر روزے سے رہتے تھے۔ اُن کے فیضانِ صحبت سے اُن کی بیوی بھی بڑی عابدہ ہو گئی تھیں[1]۔

سخاوت | اس کے ساتھ ہی نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دست تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے پاس ایک سوال کرنے والا آیا۔ آپ نے بے تکلف اُس کو ایک دینار عطا فرما دیا[2]۔

نفاست طبع | خوشبو کا اکثر استعمال کرتے تھے، شروع میں سیاہ خضاب استعمال کرتے تھے پھر اسے ترک کر کے سرخ خضاب استعمال کرنے لگے تھے[3]۔

رقت طبع | طبعاً نہایت زود انفعال اور سریع التاثر تھے۔ ایک مرتبہ یمن میں معن بن زائدہ کے ساتھ قیام پذیر تھے کہ عمر بن ابی ربیعہ کے مندرجہ ذیل دو شعر ان کو یاد آ گئے۔

با اللہ قولی لہ من غیر معتبۃ ۔۔۔ ماذا اردت بطول المکث فی یمن

ان کنت حاولت دنیا اونعمت بھا ۔۔۔ فما وجدت لترک الحج من ثمن

فوراً حج کا عزم کر لیا، اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے[4]۔

وفات | ۱۰۔ ذی الحجہ ۱۶۰ھ میں ستر سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ اخیر عمر میں بصرہ میں فروکش ہو گئے تھے اور یہیں درسِ حدیث کا شغل رکھتے تھے[5]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۲ [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ و شذرات الذہب

[4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۲۶ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۱

علی بن مُسہِر

نام ونسب | علی نام، ابوالحسن کنیت والد کا مُسہِر تھا، کوفہ کے رہنے والے تھے اور قریش سے غلامی کا تعلق رکھتے تھے[1]

علم وفضل | علم وفضل کے لحاظ سے جلیل المرتبت، تبع تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے حدیث کا سماع اسماعیل بن ابی خالد، ابواسحاق الشیبانی، محمد بن قیس، داؤد بن ابی ہند، اعمش، ہشام بن عروہ، ابومالک الاشجعی رحمہم اللہ سے کیا تھا۔ خود ان سے ایک جماعت کثیر نے احادیث سُنیں، اُن میں سے چند نام یہ ہیں:۔ زکریا بن عدی، اسماعیل بن الخلیل خالد بن المخلد، ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہم۔

ثقاہت | علامہ نووی فرماتے ہیں "ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے"[2] امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے اُن کی روایتوں کی تخریج کی ہے[2] امام احمد انہیں صالح الحدیث اور ابومعاویہ سے زیادہ ثبت وثقہ بتاتے ہیں[3]۔ عثمان دارمی کا بیان ہے "میں نے مشہور نقادِ رواۃ حضرت یحییٰ بن معین سے پوچھا "آپ کو علی بن مسہر زیادہ محبوب ہیں یا ابوخالد الاحمر؟" فرمایا "ابنِ مسہر" پھر دریافت کیا "اچھا! ابن مسہر زیادہ محبوب ہیں یا اسحٰق بن الازرق؟" جواب دیا "ابنِ مسہر" پھر دریافت کیا "اور ابن مسہر اور یحییٰ بن ابی زائدہ ان دونوں میں آپ کس کو ترجیح دیتے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۶۷ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۵۱ [3] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۸۳

ہیں؟ ارشاد ہوا "دونوں ثقہ ہیں"[1]

فقہ | حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی کمال تھا۔ احمد عجلی فرماتے ہیں، وہ حدیث وفقہ دونوں کے جامع تھے[2]

قضا | مہارتِ فقہ کے باعث ہی انہیں ارمینیہ کا عہدۂ قضا دیا گیا تھا لیکن یہاں اُن کے ساتھ ایک نہایت حسرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ ارمینیہ کے عہدِ قضا میں ایک مرتبہ اُن کی آنکھیں آشوب کر آئیں وہ ایک معالجِ چشم کے پاس گئے۔ اُن سے پہلے جو شخص یہاں کا قاضی تھا اُس نے از راہِ رشک وحسد اس معالج کو معقول رقم دے کر کہا "ان کو نابینا بنا دے" یہ کمبخت روپیہ کے لالچ میں آگیا اور اُس نے علاج کے بہانہ ان کو نابینا کر دیا۔ چنانچہ وہ کوفہ تشریف لائے تو اُن کی قوتِ بینائی سلب ہو چکی تھی[3] لیکن اُن کا حافظہ اس درجہ قوی تھا کہ وہ اس واقعہ کے بعد اپنے حفظ سے کام لے کر احادیث روایت کرتے تھے۔ علامہ ابن سعد انہیں ثقہ، کثیر الحدیث بتاتے ہیں[4]، حافظ ذہبی انہیں الامام الحافظ لکھتے ہیں[5]۔

وفات | ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔ ابن نمیر کا بیان ہے کہ وہ مع اپنی کتابوں کے دفن کیے گئے[6]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۸۳ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۵ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۶۸
[4] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۸۳ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۶۷ [6] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۸۳

ابو معشر السندی

نام ونسب: نام نجیح، کنیت ابو معشر اصل کے اعتبار سے حمیری تھے، مدینہ میں رہتے تھے، اس لیے مدنی کہلاتے ہیں۔ والد کا نام عبدالرحمن تھا، ابو معشر بنو ہاشم کے غلام تھے۔ ان کی غلامی کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یزید بن مہلب اور یزید بن عبدالملک میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں وہ یمامہ میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ بچپن میں ان کو کوئی چرا لایا، اور مدینہ میں فروخت کر دیا۔ بعد میں ام موسیٰ بن المہدی نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔[1]

علم: حافظ ذہبی انہیں "الفقیہ صاحب المغازی" لکھتے ہیں، اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں "وکان من اوعیۃ العلم" وہ علم کا ظرف تھے۔[2]

حدیث: حدیث میں انہوں نے سعید بن المسیب، محمد بن کعب القرظی، ابو بردۃ بن ابی موسیٰ الاشعری، ہشام بن عروہ، موسیٰ بن یسار، نافع، ابن المنکدر، اور محمد بن قیس وغیرہم سے روایت کی ہے۔ خود ان سے بہتیرے لوگوں نے روایت کی جن میں خود ان کے فرزند محمد، عبدالرزاق، ابو نعیم، محمد بن بکار، منصور بن ابی مزاحم شامل ہیں۔

اخیر عمر میں وہ چند در چند بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ بسا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۱ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۶

اوقات ریح خارج ہو جاتی تھی اور انہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس بنا پر اُن کا حافظہ بھی خراب ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یحیی بن معین اور یحیی بن سعید القطان نے ان کو ضعیف الروایۃ اور ناقابلِ استناد قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی بھی اُن کو ناقص الحافظہ بتاتے ہیں[1] پھر غالباً وہ امی بھی تھے یعنی لکھنا بھی نہیں جانتے تھے[2] تاہم حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی نے بعض اقوال ایسے نقل کیے ہیں جن سے اُن کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔ "کان بصیراً بالمغازی صدوقاً" یزید بن ہارون کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ ابوجزء نصر بن طریف سے سُنا وہ کہہ رہے تھے کہ ابومعشر زمین و آسمان کی تمام مخلوق سے زیادہ جھوٹے ہیں لیکن انجام کار ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یزید کو پست و خوار کر دیا۔ اور ابومعشر کو رفعت عطا فرمائی"[3] ابوزرعۃ الدمشقی نعیم سے نقل کرتے ہیں کہ ابومعشر بڑے عاقل اور حافظ تھے ہشیم کا بیان ہے کہ میں نے کوئی مدنی نہ اُن کے مشابہ دیکھا اور نہ اُن سے زیادہ عقلمند پایا[4]۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں[5] امام نسائی نے اُن سے استشہاد کیا ہے"۔ البتہ امام احمد بن حنبل اور دوسرے اکابر حدیث نے کہا ہے کہ وہ اسناد صحیح طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے، اور اسی بنا پر لقب بالضد کے طور پر اُن کو "السندی" کہا جاتا تھا۔

بہرحال ابومعشر احتجاج کے قابل ہوں یا نہ ہوں اور اُن کا مرتبہ اسناد کے بارہ میں کچھ ہی ہو، اسلام نے غلاموں کو سماجی معاملات میں آزادوں کے ساتھ جو برابری دی ہے اُس کے اثبات کے لیے یہی کیا کم ہے کہ ابومعشر ان تمام اور سخت تنقیدات کے باوجود دربارِ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۱ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۲۰

خلافت میں بڑے عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے، مہدی جب عراق گیا تو انہیں بھی ہمراہ لے گیا، اور ان کو ایک ہزار دینار دلوائے اور ان سے کہا کہ آپ یہیں ہمارے دربار میں رہیں تاکہ ہمارے اردگرد جو لوگ ہیں وہ آپ سے فقہ حاصل کر سکیں[1]۔

لکنت | زبان میں لکنت بھی تھی۔ محمد بن کعب کو محمد بن قعب کہتے تھے۔

حلیہ | سفید فام تھے، آنکھیں نیلگوں تھیں اور فربہ اندام تھے۔

وفات | رمضان ۱۶۶ھ میں وفات پائی۔

عبد العزیز بن عبد اللہ الماجشون

نام و نسب | عبد العزیز نام، کنیت ابو عبد اللہ یا ابو الاصبغ، والد کا نام میمون تھا، اور کنیت ابو سلمہ اصل میں فارس کے رہنے والے تھے۔ ان کے رخسارے شراب کی طرح سرخ تھے اس لیے انہیں "میگوں" کہا جاتا تھا جس کو اہل مدینہ نے بگاڑ کر "ماجشون" کر دیا[2]۔ ابو سلمہ آل ہدیر کے غلام تھے[3]۔

علم و فضل | عبد العزیز علم و فضل کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ ذہبی انہیں الامام العلم لکھتے ہیں اور آگے چل کر فرماتے ہیں "وہ علماءِ ربانیین میں سے تھے"[3]۔ ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ "ماجشون علماءِ ربانیین اور فقہاءِ مصنفین میں سے ہیں"[4]۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۸۷ [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۷
[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۶ [4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۵۹۔

حدیث | انہوں نے حدیث میں امام زہری، محمد بن المنکدر، زید بن اسلم، عبداللہ بن دینار، صالح بن کیسان، یحییٰ بن سعید الانصاری، ہشام بن عروہ، وہب بن کیسان رحمہم اللہ اور بعض دوسرے ائمۂ حدیث سے استفادہ کیا تھا۔ خود ان سے جن لوگوں نے روایت کی اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چند اسماء یہ ہیں۔ لیث بن سعد، ابن وہب، زبیر بن معاویہ، ابن مہدی وکیع، ابو عامر العقدی، ابو داؤد الطیالسی، علامہ ابن سعد لکھتے ہیں "عبد العزیز الماجشون ثقہ اور حدیث کی کثرت سے روایت کرنے والے تھے[1] لیکن وہ شروع شروع میں حدیث کی روایت سے گریز کرتے تھے۔ جب بغداد میں لوگوں نے اصرار کیا تو انہوں نے باقاعدہ حدیث کا درس شروع کر دیا۔ چنانچہ خود اُن کا بیان ہے کہ اہل بغداد نے مجھ کو محدث بنا دیا" اور یہی وجہ ہے کہ ابن سعد لکھتے ہیں "اُن سے اہل عراق نے بہ نسبت اہل مدینہ کے زیادہ روایت کی ہے" امام ابو داؤد، نسائی، ابو زرعہ، اور ابو حاتم سب اُن کو صدوق اور ثقہ بتاتے ہیں[1]۔

فقہ | انہیں فقہ میں بھی بڑا کمال تھا۔ حافظ ذہبی۔ حافظ ابن حجر، اور ابن العماد الحنبلی انہیں فقیہ لکھتے ہیں۔ اہل حرمین کے مسلک کی شدت کے ساتھ پیروی کرتے تھے اور اُس کے بڑے زبردست حامی تھے[2]۔

فتویٰ | اس کمال تفقہ کے باعث افتاء میں وہ لوگوں کے مرجع تھے۔ یہاں تک کہ ابن وہب بیان کرتے ہیں "میں نے حج کے وقت ایک منادی کو سنا جو کہہ رہا تھا کہ امام مالک اور ابن الماجشون کے سوا کوئی شخص فتویٰ نہ دے[3]"

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۴۴ [2] ایضاً ج ۱۰ ص ۱۴۴ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۶

فراست وفرزانگی معاملہ فہمی اور امور سیاست میں بھی نہایت زیرک اور عقلمند تھے۔ ابوالولید الطیالسی کہتے ہیں "ابن الماجشون وزارت کی صلاحیت رکھتے تھے"۔

خلفا میں وقعت ان کمالات کے باعث خلفا اُن کی بڑی توقیر اور تعظیم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ابوجعفر المنصور حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تو مہدی دور تک اُس کی مشایعت کے لیے گیا۔ جب رخصت ہونے لگا تو ابوجعفر نے کہا "بیٹے! میرے لیے ایک ہادی تلاش کر کے بھیج دینا" مہدی نے جواب دیا "میں آپ کے پاس بطور ہادی کے ایک ایسے شخص کو بھیجونگا جو بڑا عقلمند اور فرزانہ ہے"۔ اس کے بعد اُس نے حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمۃ الماجشون کو بھیجدیا۔[1]

شاعری معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، لیکن جب کہتے تھے نہایت خوب کہتے تھے۔ ایک دفعہ ابن الماجشون مہدی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ مہدی نے پوچھا "آپ نے اپنے اُن مرحوم دوستوں کی یاد میں بھی کچھ کہا ہے جو فقیہہ روزگار تھے اور اب وہ دنیا میں نہیں ہیں"؟ ابن الماجشون بولے "ہاں" اور یہ اشعار سنائے۔

ایا باکیٍ علیٰ احبابہ جزعاً	قد کنت احذر ذا من قبل ان یقعا
ان الزمان رای الف السرور بنا	فدب بالھجر فیما بیننا وسعیٰ
ما کان واللہِ شوم الدھر یترکنی	حتیٰ یجرعنی من غیظہٖ جرعاً
ولیصنع الدھر بی ماشاء مجتھداً	فلا زیادۃ شیٔ فوق ما صنعا

ترجمہ: اے دوستوں کی موت پر بے تحاشا رونے والے، سُن! میں بھی اسی حادثہ کے نازل

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۷۔

ہونے سے قبل ڈھتا تھا۔ زمانہ نے جب یہ دیکھا کہ ہم سب احباب ایک جگہ ہونے کی وجہ سے باہم
بہت مانوس ہیں تو اُس نے ہجر کو ہمارے درمیان دوڑا دیا اور اُس نے اس میں بڑی دوڑ
دھوپ کی۔ بخدا زمانہ کی بدنصیبیاں میرا پیچھا اُس وقت تک نہیں چھوڑینگی جب تک کہ
وہ اپنے غیظ وغضب کو گھونٹ گھونٹ کرکے مجھ کو نہیں پلا دینگی۔ تو اب میں کہتا ہوں کہ اچھا!
زمانہ میرے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ کر گزرے، اُس نے اب تک میرے ساتھ جو کچھ
کیا ہے اُس پر اب کسی چیز کی کیا زیادتی ہو سکتی ہے"۔

مہدی نے ان اشعار کو سُن کر کہا "بخدا میں آپ کو اب غنی بنا دونگا" چنانچہ اُس نے انہیں دس ہزار دینار دینے کا حکم دیا۔ ابن الماجشون انہیں لے کر بغداد چلے آئے لیکن اُن کے صاحبزادے نے اپنے والد کے اوصاف وخصائص دیکھ کر جود وعطا کی جو خو پیدا کر لی تھی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے وہ سب دینار تقسیم کرکے خرچ کر ڈالے۔

زہد وورع | علم وفضل کے ساتھ اُن کے عملی کمالات بھی قابل ذکر ہیں، وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ احمد بن صالح کہتے ہیں "کان نزھا صاحب سنۃ ثقۃ"[1] علامہ ابن سعد انہیں "ورع" بتلاتے ہیں[2]

حسن وجمال | قدرت نے جس طرح اُن کو معنوی اور باطنی محاسن عطا کرنے میں فیاضی سے کام لیا تھا اُن کو حسن ظاہری کی دولت بھی بافراط عطا کی گئی تھی۔ زبیر کا بیان ہے "وکان مع نباھتہ بارع الجمال" وہ اپنی شرافت کے باوصف نہایت حسین وجمیل بھی تھے[3]

تصنیفات | وہ صاحب تصنیف وتالیف بھی تھے۔ علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "اُن کی احکام"

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۲۷ و ۴۲۸ [2] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۴۴ [3] ایضاً ص ۳۴۵

میں چند کتابیں بھی ہیں[1]، حافظ ذہبی احمد بن کامل کا قول نقل کرتے ہیں "ان کی تصنیف کی ہوئی چند کتابیں بھی ہیں جن کو ان سے ابن وہب نے روایت کیا ہے[2]"۔

وفات | ان کی وفات کے سلسلہ میں اُن کے صاحبزادہ نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہتے ہیں "میرے والد کی روح جسم سے پرواز کرگئی تو ہم سب نے اُن کو غسل کے لیے ایک تخت پر لٹا دیا۔ اتفاق کی بات غسل دینے والا جب غسل دے رہا تھا تو اُس نے اُن کے تلوے میں ایک رگ دیکھی جو پھڑک رہی تھی، اُس نے یہ واقعہ لوگوں کے سامنے بیان کیا، سب کی رائے ہوئی کہ اس وقت غسل دینا ملتوی کردیا جائے۔ دوسرے دن بھی جب غسل دینے کا اہتمام کیا گیا، یہی صورت پیش آئی۔ غرض اسی طرح تین دن گذر گئے۔ اس کے بعد ابن الماجشون یکایک اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور لوگوں سے ستو طلب کیا، اُن کے ارشاد کی فوراً تعمیل کی گئی۔ ستو پی چکے تو لوگوں نے کہا "آپ پر ان تین دنوں میں جو کچھ واردات گذری ہے، اُس کی تھوڑی بہت روئداد ہم کو بھی سنائیے۔ انہوں نے بطیب خاطر اس درخواست کو منظور کرلیا اور یوں واقعہ بیان کیا "میری روح کو فرشتہ لے کر روانہ ہوا تو اُس نے آسمان دنیا کو عبور کیا، اور اسی طرح گذرتا ہوا ساتویں آسمان تک پہنچ گیا، وہاں اس فرشتہ سے پوچھا گیا "تمہارے ساتھ کون ہے؟" فرشتہ بولا "الماجشون" کہا گیا "ابھی تو ان کی عمر میں اتنے برس، اتنے مہینے، اتنے دن اور اتنے گھنٹے باقی ہیں۔ تم ان کو ابھی سے کیوں لے آئے؟" اس کے بعد فرشتہ نے مجھ کو لے کر نیچے اترنا شروع کردیا، یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

---

[1] خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۹ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۶۔

دیکھا، اُن کی دائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، اور بائیں جانب حضرت عمر فاروقؓ، اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ آپ کے سامنے تشریف رکھتے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے فرشتہ سے دریافت کیا کہ یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بیٹھے ہیں کون ہیں؟" جواب ملا "عمر بن عبدالعزیزؒ" میں نے کہا "یہ تو سرورِ کونین سے بہت زیادہ قریب ہیں" فرشتہ نے کہا "یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے ظلم و جور کے زمانہ میں حق پر عمل کیا، اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے حق کے زمانہ میں حق پر عمل کیا"[1]

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو حضرت ابن الماجشون کو اس کے بعد دنیا میں چند دنوں اور رہنے کی مہلت مل گئی۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جو سب کے لیے مقدر ہے اور جس سے کائناتِ عالم کی کوئی ایک چیز بھی مستثنیٰ نہیں ۱۶۴ھ میں جبکہ وہ مدینہ سے واپس آ کر بغداد میں قیام پذیر تھے، وفات پائی۔ اُن کے جنازہ میں خلیفۂ وقت مہدی خود شریک تھا، اُس نے ہی نماز میں امامت کی، قریش کے قبرستان میں دفن کیے گئے[2]

علی بن المدینی

نام و نسب علی نام، ابوالحسن کنیت، والد کا نام عبداللہ تھا جو خود بھی بڑے پایہ کے محدث تھے قبیلۂ بنو سعد بن بکر کے ایک شخص عروہ بن عطیہ کے غلام تھے، مدینہ کے رہنے والے تھے۔ مگر ایک روایت ہے کہ بصرہ کے باشندہ تھے[3]

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۵۹ [2] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۴۳۸ [3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۵۰

پیدائش | سنہ ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے[1]۔

علم و فضل | علم و فضل کے لحاظ سے اُن کا شمار اکابر علم و کمال میں ہوتا ہے، علامہ نووی لکھتے ہیں۔
"تمام لوگ ان کی جلالتِ شان، امامت، اور کمال اور دوسروں پر اُن کی فوقیت پر متفق ہیں[2]۔"
حافظ ذہبی کا ارشاد ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حافظ اور اربابِ علم و فضل کے پیشوا تھے۔ اُن کی عظمت و برتری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام احمد بن حنبل جیسے بلند پایہ امامِ وقت اُن کا نام از راہِ احترام نہ لیتے بلکہ اُن کی کنیت سے اُنہیں یاد کرتے تھے۔ امام بخاری آسمانِ علم کے مہرِ درخشاں ہیں لیکن وہ بھی فرماتے ہیں کہ "میں نے اپنے آپ کو کبھی کسی سے کم نہیں سمجھا۔ البتہ علی بن المدینی اس سے مستثنیٰ ہیں[3]۔"

حدیث | خاص حدیث میں اُن کو بڑا کمال حاصل تھا۔ ابو حاتم الرازی کہتے ہیں "ابن مدینی حدیث اور علل کی معلومات میں سب سے نمایاں تھے" عبدالرحمٰن بن مہدی کا بیان ہے کہ "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ خصوصاً حضرت سفیان بن عیینہ کی احادیث کے بڑے حافظ تھے[4]۔" اس فن میں اُن کی مہارت، وسعتِ نظر، اور صحیح قوتِ فیصلہ کا یہ عالم تھا کہ حضرت سفیان بن عیینہ جو اُن کے اُستاذ و شیخ اور خود بھی جلیل القدر محدث تھے، اپنے شاگرد حضرت علی بن المدینی سے بڑی محبت کرتے تھے اور اس معاملہ میں بعض لوگ اُن پر معترض ہوتے تھے تو فرماتے تھے "تم لوگ مجھ کو علی کی محبت پر ملامت کرتے ہو۔ بخدا اُنہوں نے مجھ سے جس قدر علمی فیض حاصل کیا ہے، اُس سے زیادہ میں نے اُن سے فیض اُٹھایا ہے[5]۔"

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۵۹ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۵۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵ [5] خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۵۹۔

یحییٰ بن سعید القطان بھی فرماتے تھے۔ انا اتعلم من علی اکثر مما یتعلم منی۔ امام نسائی کا مقولہ ہے کہ حضرت علی پیدا ہی اس غرض کے لیے کیے گئے تھے[1]

مختلفاتِ حدیث کا علم بہت وسیع تھا، امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ حضرت علی بن المدینی اس باب میں امام احمد سے بھی بڑے عالم تھے[2]

شیوخ | حضرت ابن مدینی نے بیشمار حضرات سے سماع حدیث کیا تھا۔ ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں۔ اُن کے والد ماجد عبد اللہ بن جعفر، حماد بن زید، جعفر بن سلیمان، عبد العزیز الدراوردی، معتمر بن سلیمان، سفیان بن عیینہ، ولید بن المسلم، بشر بن المفضل، یحیی بن سعید القطان، عبد الرحمٰن بن مہدی۔ ابو داؤد الطیالسی، ہشام بن یوسف، یزید بن زریع۔

تلامذہ | جن اربابِ علم و شریعت نے اُن سے روایت کی اُن میں امام احمد بن حنبل، صالح بن احمد، محمد بن یحیی الذہلی، فضل بن سہل الاعرج، محمد بن اسحاق الصاغانی، محمد بن اسماعیل البخاری ابو حاتم الرازی شامل ہیں[3]

ثقاہت | اُن کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام بخاری "جزء رفع یدین" میں فرماتے ہیں "کان اعلم عصرہ" ابن حبان فرماتے ہیں کہ "وہ ثقہ تھے۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علل کے بڑے علماء میں سے تھے۔ انہوں نے سفر کیا، حدیثیں جمع کیں، اُن کو لکھا، اُن پر کتابیں تصنیف کیں، پھر اُن سے متعلق مذاکرہ کیا، اور اُنہیں محفوظ رکھا" ابو جعفر العقیلی کہتے ہیں "اُن کی حدیث درست ہے" امام نسائی فرماتے ہیں "وہ معتبر ہیں، مامون ہیں، اور حدیث کے اماموں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵ [2] ایضاً [3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۵۸

میں سے ہیں۔" ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ ابو زرعہ فرماتے تھے "ان کی سچائی میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔" جعفر بن احمد کہتے ہیں "میں نے بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو روانگی سے پہلے ابن معین سے پوچھا "میں کس کس سے روایت کروں؟" اس کے ساتھ ہی میں نے چند بزرگوں کے نام لیے یحیی بن معین خاموش بیٹھے ہوئے سنتے رہے۔ جب میں نے حضرت علی بن المدینی کا نام لیا تو بولے "اگر وہ تم سے کوئی حدیث بیان کریں تو تم اس کو لکھ لینا۔ وہ سچے ہیں۔"[1]

درس | ان کی علمی شہرت و کمال کی وجہ سے دور دور کے لوگ ان کے درس میں شریک ہونے کے آرزومند رہتے تھے۔ امام نووی لکھتے ہیں "علی بن المدینی بغداد میں تشریف لاتے تھے تو وہاں ان کے درس کا ایک وسیع حلقہ قائم ہو جاتا تھا۔ جس میں امام احمد بن حنبل اور یحیی بن معین ایسے افاضل امت شرکت کرتے تھے۔ اس درس میں شریک ہو کر امام احمد، حضرت یحیی بن معین، خلف، اور معیطی مختلف مسائل پر مذاکرہ بھی کرتے تھے، جب اختلاف شدید ہو جاتا تو پھر حضرت ابن مدینی کلام شروع کرتے تھے۔"[2]

ایک شخص نے امام بخاری سے دریافت کیا "اس وقت آپ کی آرزو کیا ہے؟" فرمایا "میری تمنا یہ ہے کہ میں عراق جاؤں، وہاں علی بن المدینی حیات ہوں اور ان کے ساتھ مجالست کروں۔"[3]

فقہ | حدیث کی طرح ان کو فقہ میں بھی کمال تھا۔ حضرت سفیان بن عیینہ سے کوئی شخص کسی مسئلہ میں فتوی پوچھتا تو انہیں فوراً حضرت ابن مدینی یاد آجاتے تھے۔ ایسے موقع پر وہ اکثر فرمایا

---

[1] یہ سب اقوال تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۶، ۳۵۷ سے ماخوذ ہیں۔ [2] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۵۱۔
[3] خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۶۱۔

کرتے "لو کان حیۃ الوادی معنا"۱ عربی زبان میں حیۃ الوادی بطور استعارہ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی سلسلہ کے لوگوں کے لیے سب سے بڑا امید کا سہارا اور پناہ کی جگہ ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقہ کی موشگافیوں میں زیادہ مشغول رہنا پسند نہیں کرتے تھے ان کے اصحاب میں سے کسی نے ان سے کہا کہ اگر آپ فقہ کی طرف متوجہ ہوں تو کتنی اچھی بات ہے؟ جواب دیا "اگر میں اس میں مشغول ہو گیا تو اب جو کام کر رہا ہوں وہ نہیں کر سکونگا"۲

جلالتِ شان قدرت کی نظرِ انتخاب کسی سعادتمند کے سر پر اقلیم علم کی کشور کشائی کا تاجِ زرفشاں رکھتی ہے تو اُسے لوگوں میں اس درجہ ہر دلعزیز اور محبوب بنا دیتی ہے کہ لوگ اُس کی ایک ایک نقل و حرکت قلمبند کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی کے ساتھ مسلمانوں کو جو عام گرویدگی اور شیفتگی تھی اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، لباس، قول و فعل غرض یہ ہے کہ ہر چیز لکھی جاتی تھی۔ بڑے بڑے ائمہ وقت اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھتے تھے اعین کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن مدینی کو دیکھا کہ لیٹے ہوئے تھے اور اُن کے دائیں جانب امام احمد اور بائیں جانب یحییٰ بن معین تشریف رکھتے تھے۔ اسی حالت میں علی بن مدینی کچھ املا کراتے جاتے اور یہ دونوں بزرگ اُسے لکھتے جاتے تھے۳ حضرت سفیان بن عیینہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ تقریباً ساٹھ برس سے وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے اور اپنے تلامذہ کے لئے مجلسِ درس منعقد نہیں کرتے تھے لیکن حضرت ابن مدینی کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی۔ وہ خود لوگوں کو خطاب کر کے فرماتے تھے "اگر علی نہ ہوتے تو میں کبھی تمہارے لئے

۱ اساس البلاغۃ للزمخشری ج ۱ ص ۲۱۲ ۲ خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۶۱ ۳ تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۳۵۱

مجلس میں نہ آتا تھا شخص بن محبوب الخزاعی کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ حضرت سفیان بن عیینہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اُس وقت اُن کے پاس حضرت علی بن المدینی بھی تشریف رکھتے تھے۔ اور ابن شاذکونی بھی اس مجلس میں شامل تھے۔ علی اُٹھ کر جانے لگے تو سفیان بھی اُٹھ گئے اور یہ فرمایا "اذا قامت الخیل لم نجلس مع الرجالۃ" جب سوار کھڑے ہو گئے تو اب ہم پا پیادہ لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھے رہیں گے۔[1]

طلب علم میں سفر | تحصیلِ علم کے شوق میں وہ کسی ایک مقام پر مستقل قیام نہیں کرتے بلکہ شہر بشہر سفر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ بصرہ سے یمن کے لیے روانہ ہوئے، اور تقریباً تین سال تک یہاں واپس نہ آئے۔ ان کی والدہ ماجدہ اس وقت حیات تھیں۔ واپس تشریف لائے تو اُنھوں نے کہا "بیٹے! میں نے معلوم کر لیا ہے کہ فلاں تمہارا دوست ہے اور فلاں تمہارا دشمن" حضرت علی بولے "اماں! آپ کو یہ کس طرح پتہ چلا" کہنے لگیں "تمہاری غیر موجودگی میں فلاں فلاں شخص جن میں یحییٰ بن سعید بھی شامل تھے، میرے پاس آتے تھے، اور طرح طرح سے مجھ کو دلاسا دے کر کہتے تھے "آپ گھبرائیں نہیں، علی واپس آئینگے تو اس شان سے آئینگے کہ آپ انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو جائینگی" ان لوگوں کی گفتگو سے میں نے محسوس کر لیا کہ یہ واقعی تمہارے محب اور مخلص دوست ہیں۔ ان کے برخلاف میرے پاس بعض شخص ایسے آتے تھے جو کہتے تھے "آپ اپنے بیٹے کو بلانے کا تاکیدی خط کیوں نہیں لکھتیں کہ وہ جلد واپس آ جائیں" ان کی اس گفتگو سے میں سمجھتی تھی کہ یہ تمہارے دشمن ہیں۔[3]

---

[1] خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۴۵۹ [2] ایضاً ص ۴۵۹ و ۴۶۰ [3] ایضاً ص ۴۶۲

علم میں انہماک | انہیں دن رات علم میں انہماک رہتا تھا یہاں تک کہ سوتے سوتے اگر کوئی حدیث یاد آجاتی تھی تو فوراً لونڈی کو چراغ جلانے کا حکم کرتے، اور چراغ روشن ہو جاتا تو اپنی کتاب میں اُس حدیث کو تلاش کرتے تھے[1]

کتابت | وہ جو کچھ سُنتے تھے اُس پر اچھی طرح سے تنقید کرتے تھے خود اُن کا بیان ہے کہ میں نے تقریباً ایک لاکھ حدیثیں ترک کر دیں جن میں سے تیس ہزار حدیثیں عباد بن صہیب کی روایت کی ہوئی تھیں[2]۔ پھر معیارِ تنقید پر پرکھنے کے بعد جو حدیثیں اُنہیں صحیح اور کھری معلوم ہوتی تھیں اُنہیں قیدِ تحریر میں لے آتے تھے۔ لکھتے لکھتے اُن کے پاس اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ ایک الماری بھر گئی لیکن افسوس ہے یمن کے سفر سے واپس آنے کے بعد اُنہوں نے اس الماری کو کھولا تو اُنہیں یہ دیکھ کر بے انتہا صدمہ ہوا کہ اُن کی اب تک کی زندگی کا جو کچھ سرمایہ تھا وہ سب خاک کے ذروں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس موقع پر خود حضرت ابن مدینی کا بیان یہ ہے کہ "فلم انشط بعدُ لجمعہٖ" اس کے بعد مجھ کو ضائع شدہ سرمایہ کے جمع کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا[3]۔

خلق قرآن کا فتنہ اور ابن مدینی کا ابتلاء | جیسا کہ تصریحات بالا سے معلوم ہو چکا ہے حضرت ابن مدینی کے فضل و کمال اور مہارتِ علم و فن میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر صاحبِ علم و فضل اربابِ عزیمت میں سے بھی ہو۔ اور ایک جزئی سے جزئی مسئلہ کے لیے بھی طوق و سلاسل کو ہنسی خوشی برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، اور اگر ایسا ہوتا تو پھر امام احمد بن حنبل اور وقت کے دوسرے ائمہ علم و فن میں فرق ہی کیا رہتا۔

---

[1] بغدادی ج ۱۱ ص ۴۶۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۲ [3] تاریخ بغدادی ج ۱۱ ص ۴۶۲۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر بوالہوس کے واسطے دار و رسن کہاں

چنانچہ خلیفۂ بغداد معتصم باللہ کے عہد میں خلق قرآن کی بحث کا جو فتنہ پیش آیا اس میں علی بن مدینی اپنی علمی جلالتِ شان کے باوجود اپنے آپ کو حضرت امام احمد بن حنبل کی طرح میدانِ عزیمت و ہمت کا مردِ نبرد پیشہ ثابت نہ کر سکے۔ اس کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ معتصم باللہ نے امام احمد بن حنبل کو بلا کر پوچھا "میں نے سنا ہے کہ آپ اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، حالانکہ آنکھ تو کسی محدود چیز پر ہی واقع ہو سکتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے، تو کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل موجود ہے؟" امام نے فرمایا "ہاں! اے امیر المومنین، میری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں "تم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کا دیدار اسی طرح کرو گے جس طرح چودھویں رات میں ماہِ شب چار دہم کو دیکھتے ہو" یہ روایت سننے کے بعد خلیفہ نے احمد بن ابی داؤد کی طرف رخ کیا جس نے امام احمد بن حنبل کی چغلی کھائی تھی۔ اور پوچھا "احمد بن ابی داؤد! بتاؤ تمہیں اس روایت پر کوئی اعتراض ہے؟" ابن ابی داؤد بولا "مجھ کو ذرا مہلت دیجیے کہ میں اس روایت کی اسناد کو جانچ لوں" چنانچہ وہ گھر واپس آیا اور یہاں اس نے فوراً علی بن مدینی کو بلا کر دریافت کیا کہ آپ کو اس روایت میں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر آتی ہے؟" ابن مدینی نے انکار کر دیا اور کہا "کہ مجھ کو تو آپ اس سے معاف ہی رکھیے" ابن ابی داؤد بڑا شاطر تھا۔ بولا "دنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں"۔ اور یہ کہہ کر علی بن مدینی کو بہت کچھ زرِ نقد، سواری مع اس کے تمام ساز و سامان کے، کپڑے اور عطریات وغیرہ بھی دیں۔ اب علی بولے "ہاں! اس روایت میں

ایک نقص یہ ہے کہ اس کی اسناد میں ایک راوی قیس بن ابی حازم ہے یہ شخص کھڑا ہو کر پیشاب کرتا تھا جو علامتِ فسق ہے" ابن ابی داؤد یہ سنتے ہی مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ ابنِ مدینی کو بوسہ دیا، اور انہیں گلے سے لگالیا۔ اور دوسرے دن بارگاہِ خلافت میں جا کر کہہ دیا کہ امام احمد بن حنبل جس روایت سے استدلال کرتے ہیں وہ قیس بن ابی حازم ایسے غیر ثقہ راوی کی وجہ سے ناقابلِ استناد ہے معتصم کو بہانہ ہاتھ آگیا۔ اُس نے امام عالیمقام کو کوڑوں سے مارنے کا حکم دے دیا۔

علامہ خطیب بغدادی اس پورے واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں، اور اس پر دو نقص وارد کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ جن لوگوں نے امام احمد بن حنبل کے ابتلاء کا واقعہ بیان کیا ہے اُن میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے خلق قرآن کی بحث کے ضمن میں یہ کہا ہو کہ معتصم کے سامنے امام سے رویت باری کے مسئلہ میں مناظرہ ہوا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ حضرت ابن مدینی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ قیس بن ابی حازم کو کھڑے ہو کر پیشاب کرنے والا کہتے تھے، سراسر بہتان اور افتراء ہے۔ کیونکہ انہوں نے خود ان سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں۔ وہ ان کو معتبر تابعی سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قیس نے حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، سعد بن ابی وقاص، زبیر، طلحہ، مغیرہ بن شعبہ، ابومسعود البدری او خباب بن ارت رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے اجلہ صحابہ سے شرفِ سماع حاصل کیا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس اعترافِ فضیلت کے باوجود وہ اُن کی شان میں اس طرح کے گستاخانہ الفاظ کہیں۔ علامہ بغدادی ان دو نقصوں کے بعد اپنی رائے لکھتے ہیں کہ "اگر مندرجۂ بالا واقعہ صحیح ہے تو یہ کہنا چاہیے کہ ابن ابی داؤد نے از خود قیس بن ابی حازم پر یہ اعتراض کیا، اور اس کو وقیع بنانے کے لیے خواہ مخواہ حضرت ابنِ مدینی کی طرف

منسوب کر دیا۔[1]

ہماری رائے میں علامہ بغدادی کے خیال کے مطابق یہ واقعہ ہی سرے سے من گھڑت ہے لیکن اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ خلق قرآن کے فتنہ میں ابن مدینی کی جانب سے اس قسم کا کوئی تساہل ضرور سرزد ہوا تھا جس کی وجہ سے امام احمد بن حنبل میں اور ان میں تعلقات خوشگوار نہیں رہے۔ اور خود ابن مدینی کو بھی اس کا اقرار تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اُن سے کسی نے کہا کہ "لوگ امام احمد بن حنبل کے مقابلہ میں اب آپ کی بات قبول نہیں کرتے"۔ تو غایتِ شرمساری سے بولے " ہاں! احمد بن حنبل تو کوڑوں کی مار سہہ گئے اور میں اُسے برداشت نہیں کر سکتا تھا"۔ ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ "تم میری کمزوری جانتے ہو۔ اگر میرے ایک کوڑا بھی مارا جاتا تو میں مرجاتا"۔[2]

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اُن سے عجلت میں جو خطا سرزد ہو گئی تھی اُس نے بعض لوگوں کے دلوں میں اُن کی وقعت کم کر دی۔ یہاں تک کہ کسی کسی نے اشعار میں اس کا اظہار بھی کیا، اور خود اُن کو بھی جیتے جی اُس کا رنج و قلق رہا، ورنہ جہاں تک اُن کے عقیدہ اور رائے کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں بالکل امام احمد بن حنبل کے ہمنوا تھے۔ جہمیہ کی تکفیر کرتے اور خلق قرآن کے قائلین کو گمراہ سمجھتے تھے۔ محمد بن عثمان بن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ "میں نے خود حضرت علی بن مدینی سے برسرِ منبر سنا ہے فرماتے تھے کہ جو شخص قرآن مجید کو مخلوق سمجھتا ہے وہ کافر ہے، اور جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سچ مچ شرف ہمکلامی

---

[1] اس کی پوری تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۳۶۶، ۳۶۷۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۵

عطا نہیں فرمایا وہ بھی کافر ہے۔[۱]

ایک دوسری چیز جس نے اُن کی شہرت کو نقصان پہنچایا یہ تھی کہ وہ احمد بن ابی داؤد کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ یہ شخص بغداد کا قاضی تھا، اور امام احمد بن حنبل کو جو مصائب اُٹھانے پڑی اُن میں اس کی ریشہ دوانیوں اور چغلخوریوں کو بڑا دخل تھا۔ اس لیے عوام وخواص اس کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو بھی مذموم خیال کرتے تھے، لیکن علی بن مدینی نے آخر میں اس سے بھی تعلق منقطع کر لیا تھا۔ اور وہ سچے دل سے ان تمام قابل اعتراض باتوں سے توبہ کر چکے تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں "اس امام کے مناقب بہت زیادہ ہیں۔ اے کاش وہ خلق قرآن کے فتنہ میں مبتلا نہ ہوتے، اور احمد بن ابی داؤد سے کوئی راہ ورسم نہ رکھتے۔ مگر خیر اُنہوں نے بعد میں اس پر ندامت کا اظہار کیا۔ اور ان سب چیزوں سے الگ تھلگ ہو گئے، اور خلق قرآن کے قائلین کی تکفیر کرنے لگے تھے اللہ اُن پر رحم کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔"[۲] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "ابن مدینی کو جو ابتلا پیش آیا تھا، اُس کی وجہ سے امام احمد بن حنبل اور اُن کے متبعین اُن کی شان میں کلام کرتے تھے لیکن حق یہ ہے کہ ابن مدینی کو اپنے فعل پر بڑی ندامت تھی۔ وہ عذر خواہی کرتے تھے، اُنہوں نے توبہ کر لی تھی اور خدا کے حضور میں اُس سے رجوع کر لیا تھا۔"[۳]

تصنیفات وہ جو کچھ سُنتے تھے معیار تنقید پر پرکھ لینے کے بعد اُس کو قلمبند کر لیتے تھے۔ اس بنا پر اُن کی تصنیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ حافظ ابن حجر اُس کی تعداد دو سو بتاتے ہیں۔[۴]

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۶ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵ ۳۔ تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۶ ۴۔ ایضاً ص ۳۵۷

ابن العماد الحنبلی انہیں "صاحب التصانیف" لکھتے ہیں[1]۔

وفات | اُن کے مقام و سنہ وفات دونوں میں اختلاف ہے۔ علامہ بغدادی بغوی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اُن کی وفات بصرہ میں نہیں۔ سامرا میں ماہ ذی القعدہ سنہ ۲۳۴ھ میں ہوئی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سامرا میں متوکل باللہ عباسی کے بُلائے ہوئے تھے۔ یہاں کی زمین نے اپنی کشش کا وہ اثر دکھایا کہ وہ یہیں پیوندِ خاک ہو کر رہ گئے[2]۔

محمد بن یحییٰ الذہلی

نام و نسب | محمد نام، ابو عبداللہ کنیت۔ والد کا نام یحییٰ تھا۔ بنی ذہل کے غلام تھے اس لیے ذہلی کہلاتے ہیں۔ وطن نیشاپور تھا۔

ولادت | سنہ ۱۹۰ھ کے بعد پیدا ہوئے[3]۔

علم و فضل | علم و فضل کے لحاظ سے اُن کا شمار اُمت کے ائمہ کبار میں ہوتا ہے۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام اور شیخ الاسلام حافظِ نیسابور" لکھتے ہیں، علامہ بغدادی فرماتے ہیں "ذہلی عراق کے ائمہ اسلام میں سے تھے، حافظ متقن تھے اور مامون و معتبر ثقہ تھے انہوں نے تن تنہا امام زہری کی حدیثیں مدوّن کیں۔ بغداد میں تشریف لائے۔ وہاں کے شیوخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور اُن کا درس دیا"۔ ابن عماد الحنبلی انہیں "احد الائمۃ الاعلام

---

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۸۱ [2] بغدادی ج ۱۱ ص ۲۷۲ و ۲۷۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۱ [4] بغدادی ج ۳ ص ۴۱۵

الثقات" لکھتے ہیں۔[1]

طلب علم میں سفر | انہوں نے علم کی جستجو میں حرمین شریفین، شام، مصر، عراق، رے، خراسان، یمن، جزیرہ۔ اِن سب کی خاک چھانی، اور بعض جگہ تو کئی کئی بار تشریف لے گئے۔ چنانچہ اُنہوں نے اس سلسلہ میں بصرہ کا اٹھارہ مرتبہ، اور یمن کا دو دفعہ سفر کیا۔[2] اُن کے بہت طویل اور مسلسل سفر تین تھے۔ خود اُن کا بیان ہے کہ میں نے ان علمی سفروں میں ڈیڑھ لاکھ درہم خرچ کیے۔ پہلی مرتبہ یہ بصرہ میں داخل ہو رہے تھے کہ اُسی وقت حضرت یحییٰ بن سعید القطان کا جنازہ اپنی مقام سے روانہ ہو کر شہر پناہ کے دروازہ تک آچکا تھا۔[3]

شغف بالحدیث | انہیں حدیث میں اس درجہ انہماک تھا کہ عشق کے درجہ تک پہنچ گئے تھے۔ اُن کے صاحبزادہ ابو زکریا کہتے ہیں "ایک مرتبہ گرمی کا موسم تھا۔ آفتاب کی تمازت نے ہوش و حواس پراگندہ کر رکھے تھے۔ میں اسی عالم میں دوپہر کے وقت مکان میں داخل ہوا تو دیکھا ابا (محمد بن یحییٰ ذہلی) اپنے کتب خانہ میں بیٹھے ہوئے تصنیف میں مصروف ہیں اور اُن کے سامنے چراغ جل رہا ہے۔ میں نے عرض کی "بہتر ہوتا کہ آپ اس وقت کچھ آرام فرما لیتے" ارشاد ہوا "بیٹا! تم یہ کس طرح کہتے ہو، جبکہ میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابۂ کرام اور تابعین عظام کی معیت میں ہوں۔[4]"

امامت فی الحدیث | اُن کی شب و روز کی محنتوں، پیہم سفروں، اور راہِ طلب میں طرح طرح کی مشقت انگیزیوں

---

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳۸ [2] تاریخ بغدادی ج ۳ ص ۴۱۹ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲۔

[4] خطیب بغدادی ج ۳ ص ۴۱۹ ۔

کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے عہد کے ائمہ کبار میں سے ہو گئے۔ لوگ انہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کہتے تھے[1]۔

امام احمد بن حنبل کی جلالتِ مرتبت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، وہ خود امام ذہلی کی بڑی توقیر و تعظیم کرتے تھے۔ محمد بن سہل کا بیان ہے کہ "ایک مرتبہ ہم چند اصحاب امام احمد بن حنبل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں امام ذہلی تشریف لے آئے۔ امام احمد انہیں دیکھتے ہی تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ لوگوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ مگر آپ نے اس پر ہی اکتفا نہیں کی، اس کے بعد اپنے صاحبزادوں، اور شاگردوں سے فرمایا "تم ابو عبد اللہ کے پاس جاؤ، اور اُن سے احادیث لکھو"۔ جس زمانہ میں امام ذہلی بصرہ میں قیام پذیر تھے، اگر کوئی شخص بصرہ جاتا تو امام احمد بن حنبل اُسے تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا! وہاں پہنچ کر محمد بن یحییٰ الذہلی کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا اور اُن سے احادیث کا سماع کرنا، میں نے کسی خراسانی کو، یا (راوی کا شبہ ہے) کسی شخص کو بھی امام زہری کی احادیث کے باب میں اُن سے بڑا عالم نہیں پایا، اور نہ کسی کی کتاب اُن کی کتاب سے زیادہ صحیح ہے[1]۔

امام احمد کو امام ذہلی کی جلالتِ شان کا اس درجہ پاس تھا کہ وہ اُن کی شان سے ادنیٰ کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ امام ذہلی نے امام ابن حنبل کی مجلس میں ایک حدیث روایت کی جس میں کچھ ضعف و سقم پایا جاتا تھا، امام عالیمقام نے اُس کو سن کر فوراً ارشاد فرمایا۔ "حضرت! آپ اس طرح کی چیز کا ذکر نہ کیجیے" امام ذہلی کو ندامت محسوس ہوئی تو آپ نے کہا "اے ابو عبد اللہ! یہ جو کچھ میں نے کہا ہے، آپ کی بلندی شان کی وجہ سے کہا ہے[2]"

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۲، ۵۱۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲

حافظ ذہبی انہیں خراجِ عقیدت وتحسین اس طرح پیش کرتے ہیں، لکھتے ہیں،

"اُن پر خراسان میں علم کی ریاست، ثقاہت، تقویٰ و طہارت، دین اور اتباع سنت کا خاتمہ ہو گیا"[1]

ابو حاتم فرماتے ہیں "امام ذہلی اپنے زمانہ کے امام تھے" ابن خزیمہ امام ذہلی کی کوئی روایت بیان کرتے تھے تو اُن کا نام لینے کے بعد امام عصرہٖ کہا کرتے تھے[2]

شیوخ | امام ذہلی نے حدیث کا سماع جن شیوخ وقت سے کیا اُن میں چند کے اسماء گرامی یہ ہیں عبدالرحمٰن بن مہدی، محمد بن بکر البرسانی، عبید اللہ بن موسیٰ، یعلی بن عبید، محمد بن عبید، روح بن عبادہ، ابو النضر ہاشم بن القاسم، اسود بن عامر، سلیمان بن داؤد الہاشمی، محمد بن عمر الواقدی

تلامذہ | خود اُن کے دامانِ فیض سے وابستہ ہو کر جنہوں نے فائدہ اُٹھایا اُن کی فہرست طویل ہے۔ چند نام یہ ہیں۔ سعید بن ابی مریم، ابو صالح کاتب، اللیث بن سعد، عبداللہ بن محمد، سعید بن منصور محمود بن غیلان، محمد بن المثنیٰ، محمد بن اسماعیل الصغانی، ابو داؤد السجستانی[3]

علامہ بغدادی عنوان میں امام ذہلی کے نام کے ساتھ "شیخ البخاری" لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی "مقدمہ فتح الباری" میں امام بخاری کے جو شیوخ شمار کرائے ہیں اُن کو پانچ طبقات پر تقسیم کیا ہے، اور اُن میں سے چوتھے طبقہ میں امام ذہلی کا نام لیا ہے[4]

امام زہری کی احادیث | امام ذہلی کو یوں تو احادیث کے تمام ذخیرہ پر ہی عبور تھا لیکن اُن کو امام زہری کی احادیث خصوصیت سے بہت یاد تھیں اور وہ اُن کے علل سے بھی اچھی طرح واقف تھے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں "ذہلی نے امام زہری کی احادیث اور اُن کی کتابوں کے ساتھ بڑا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲ [2] ایضاً [3] تاریخ خطیب بغدادی ۳۵۴ھ ص ۴۵ ج ۳ ص ۱۹۴ مطبع منیری۔

اعتنا کیا تھا۔ اور اس میں اُن کو بہت کچھ صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا[1]۔ علی بن مدینی ان کو وارث زہری کہتے تھے۔ دارقطنی کہتے ہیں "جو شخص یہ پسند کرے کہ وہ امام ذہلی کے علم کے محلات کا مشاہدہ کرے۔ اُس کو امام زہری کی احادیث کے اُن علل میں غور و فکر کرنا چاہیے جو محمد بن یحییٰ نے معلوم کی تھیں[2]"۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے "ما قدم علینا رجل اعلم بحدیث الزہری من محمد بن یحییٰ[3]"۔ یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا "آپ امام زہری کی حدیثیں کیوں جمع نہیں کرتے" فرمایا "ہم سب کو محمد بن یحییٰ الذہلی نے اس سے مستغنی کر دیا ہے[4]"۔

حفظ اُن کا حفظ مسلم تھا۔ امام ابن حنبل سے کسی نے پوچھا "آپ کے نزدیک محمد بن یحییٰ اور محمد بن رافع ان دونوں میں کون قابلِ ترجیح ہے" فرمایا "محمد بن یحییٰ احفظ، اور محمد بن رافع زیادہ پرہیزگار ہیں[5]"۔

بعض مواقع پر علماءِ حدیث اُن کا طرح طرح سے امتحان لیتے تھے۔ لیکن آخر کار اُن کو امام ذہلی کی جلالتِ شان اور امامت و ثقاہت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ صالح کا بیان ہے کہ میں رے جانے لگا تو فضلک کے پاس آیا اور پوچھا "میں نیشاپور پہنچ کر کس سے احادیث کی کتابت کروں؟" وہ بولے "تم نیشاپور میں ایک شیخ کی تلاش کرنا جو پُر رونق اور خوبصورت ہوں، اُن کا لباس بھی عمدہ ہوگا، اور وہ گدھے پر سوار ہوں گے، اُن کا نام محمد بن یحییٰ الذہلی ہوگا۔ بس تم اُن کی احادیث قلمبند کرنا۔ وہ زفرق تا بقدم فائدہ ہی فائدہ ہیں"۔ صالح کہتے ہیں "میں نے نیشاپور پہنچ کر جستجو

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۳ [4] ایضاً ص ۵۱۴
[5] ایضاً ص ۵۱۳۔

کی تو وہ واقعی ان تمام صفات کے جامع نکلے، میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میں نے فضل بن العباس الرازی سے آپ کی ایک حدیث سنی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اُسے خود آپ سے بھی سُن لوں" محمد بن یحییٰ بولے "لاؤ، سُناؤ" میں نے وہ حدیث مع اسناد کے پڑھ دی۔ اسناد میں ایک راوی کا نام سعید بن عامر تھا۔ امام ذہلی نے اُس کو سُننے کے بعد ارشاد فرمایا "جو شخص ایسا انتخاب اور اس طرح کی قرأت کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ سعید بن عامر اس طرح کی حدیث روایت نہیں کر سکتے۔ صالح نے کہا "درست ارشاد ہوا، سعید بن عامر نہیں بلکہ اس روایت کا راوی سعید بن واصل ہے" علامہ بغدادی یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ دراصل صالح نے یہ حدیث پیش کر کے امام ذہلی کا امتحان لینا چاہا تھا کہ دیکھیں وہ اس روایت کو قبول کرتے ہیں یا نہیں، پس امتحان سے اُن کو ثابت ہو گیا کہ امام ذہلی کو اپنی روایتیں خوب محفوظ تھیں۔ وہ وہم سے احتراز کرتے، اور علمی بصیرت رکھتے تھے۔[1]

ابو علی الحسین بن علی الحافظ سے کسی نے امام ذہلی اور عباس بن عبدالعظیم العنبری کی نسبت سوال کیا تو فرمایا "عباس حافظ ہیں مگر محمد بن یحییٰ بہت زیادہ جلیل المرتبت ہیں"[2]

فضلک الرازی اُن سے روایت کرتے تھے تو کہا کرتے تھے "مجھ سے ایک ایسے شخص نے روایت کی ہے جس نے کبھی حدیث میں خطا نہیں کی یعنی محمد بن یحییٰ الذہلی النیشاپوری"[3]

محدثین کا اعتماد اُن کی مہارتِ فن، وسعتِ نظر، اور حفظ و ثقاہت کی وجہ سے محدثین اُن پر اس درجہ اعتماد کرتے تھے کہ زنجویہ بن محمد کا بیان ہے "میں نے مشائخ علماء سے سُنا ہے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۴۱۷، ۴۱۸ [2] بغدادی جلد ۳ ص ۴۱۸ [3] ایضاً

کہتے تھے جس حدیث کو امام ذہلی کی نظر میں پایۂ اعتبار حاصل نہ ہو وہ لاشئے محض ہے[1]" ابو احمد الفراء کہتے ہیں "محمد بن یحییٰ عِندَنا اِمامٌ ثقۃٌ مُبَرِّزٌ[2]" ابراہیم بن موسیٰ الرازی کا بیان ہے کہ جو شخص امام زہری کی روایات معلوم کرنے کا ارادہ رکھتا ہو وہ محمد بن یحییٰ سے مستغنی نہیں ہو سکتا" ابن اخرم کہتے ہیں "خراسان نے اُن جیسا کوئی آدمی پیدا نہیں کیا۔ امام بخاری نے اُن سے چونتیس حدیثیں روایت کی ہیں[3]

امام بخاری اور امام ذہلی کی شکر رنجی

امام بخاری اور امام ذہلی کی شکر رنجی تاریخ حدیث کا مشہور واقعہ ہے جس نے بعض گمراہ کن غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ یہ شکر رنجی کسی ذاتی خصومت و مخالفت پر نہیں بلکہ ایک مسئلہ کے متعلق غلط فہمی کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے تھی، حافظ ابن حجر نے حاکم ابو عبداللہ کی تاریخ کے حوالہ سے اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، ہم ذیل میں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

"امام بخاری ۲۵۰ھ میں نیشاپور تشریف لائے۔ اور یہاں مدت تک قیام کیا، اس اثناء میں وہ روزانہ درس دیتے تھے، امام محمد بن یحییٰ الذہلی کو جب امام بخاری کے نیشاپور تشریف لانے کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں سے کہا کہ تم لوگ اس عالم مرد صالح کے پاس جاؤ اور ان سے احادیث کا سماع کرو، لوگ اُن کے ارشاد کے مطابق امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے امام کے درس حدیث میں شرکت شروع کر دی، لیکن بعد میں اُن کی مجلس میں خلل پیدا ہو گیا۔ حاتم بن احمد

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۴ [2] ایضاً ص ۵۱۵ [3] ایضاً ص ۵۱۶۔

بن محمود نے امام مسلم کے حوالے سے جو روایت کی ہے وہ اس سے زیادہ تفصیلی ہے، فرماتے ہیں "امام بخاری نیشاپور آئے، تو ان کا استقبال اس قدر شاندار ہوا کہ ایسا استقبال نہ میں نے کسی گورنر کا دیکھا اور نہ کسی اور حاکم کا۔ اہل نیشاپور شہر سے نکل کر دو تین منزل تک گئے امام ذہلی نے اپنی مجلس میں فرمایا" جو شخص امام بخاری کے استقبال کا ارادہ رکھتا ہو اسے ضرور جانا چاہیے، اور میں خود بھی اُن کے استقبال کے لیے جاؤں گا" چنانچہ نیشاپور میں چھوٹا بڑا کوئی عالم ایسا نہیں تھا جو امام بخاری کے استقبال میں شریک نہ ہوا ہو۔ ان لوگوں کے علاوہ امام بخاری کے مشتاقانِ زیارت کا اتنا ہجوم تھا کہ مکانوں کی دیواریں اور چھتیں آدمیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ آپ نے یہاں آکر "دار البخاریین" میں قیام فرمایا۔ امام ذہلی نے لوگوں کو امام بخاری کے استقبال میں شرکت کی دعوت دینے اور اس میں خود شریک ہونے کے باوجود اپنے تلامذہ کو اس بات کی تاکید کر دی تھی کہ وہ امام ہمام سے کسی مسئلہ میں استفسار نہ کریں۔ کیونکہ اگر انہوں نے اُس کا جواب اُن کے مسلک کے خلاف دیا تو فرقِ باطلہ کو شماتت کا بہانہ ہاتھ آجائیگا لیکن لوگ کب باز آنے والے تھے۔ امام بخاری نے دوسرے دن درس شروع کیا تو وہیں ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا "حضرت الفاظ قرآن کی نسبت آپ کیا فرماتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "ہمارے تمام افعال مخلوق (حادث) ہیں اور ہمارے الفاظ ہمارے افعال ہی ہیں" امام کا یہ فرمانا تھا کہ مجلس میں سخت اضطراب اور شور و غل پیدا ہو گیا۔ کسی نے کچھ کہا، اور کسی نے کچھ، نوبت بانیجا رسید کہ گھر والوں کو مجبور ہو کر ان غل مچانے والوں کو گھر سے باہر نکالنا پڑا[1]۔"

[1] مقدمۂ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۲۔

ہماری رائے میں وجہ مخالفت اس قدر ہی ہے جس کو دشمنوں نے رائی کا پہاڑ بنادیا ہے۔ امام ذہلی الفاظ قرآن مجید کو غیر مخلوق مانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے امام بخاری کی نسبت جب یہ سنا کہ وہ انہیں مخلوق بتاتے ہیں تو انہوں نے اپنی مجلس میں اس کی تردید کی۔ ورنہ نہ امام ذہلی کو امام بخاری کی عام ہردلعزیزی اور مقبولیت پر رشک و حسد تھا۔ اور نہ امام بخاری اپنی کسی ذاتی غرض اور خودنمائی کی بنا پر امام ذہلی سے روگردانی کرتے تھے، اُن سے جب لوگوں نے عرض کی کہ آپ امام ذہلی کے مسلک کے خلاف یہاں کسی بات کا چرچا نہ کریں وہ یہاں کے مسلم امام ہیں، تو انہوں نے بالکل صفائی کے ساتھ فرمایا "میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح دیکھتا ہے۔ اے خدا! تو جانتا ہے کہ میں نے نیشاپور میں کسی اکڑ، خودنمائی، یا کسی ذاتی وجاہت کے حاصل کرنے کے لیے قیام نہیں کیا ہے اور اب میرا نفس مجھ کو اس سے منع کرتا ہے کہ میں مخالفین کی کثرت سے ڈر کر اپنے وطن کو واپس چلا جاؤں"۔

علاوہ ازیں مزید تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخالفت میں چند شریر النفس لوگوں کی دخل اندازی کو زیادہ دخل تھا جنہوں نے خواہ مخواہ امام بخاری کی نسبت ایک غلط خبر مشہور کردی۔ ورنہ حق یہ ہے کہ امام بخاری قرآنِ مجید کے مخلوق ہونے کے قائل نہیں تھے۔ محمد بن نصر المروزی اور ابو عمرو نے اُن سے اس مسئلہ کی نسبت استفسار کیا تو انہوں نے پوری وضاحت کے ساتھ فرمایا "میں نے قرآن مجید کو مخلوق نہیں کہا ہے اور جو شخص میری طرف اس قسم کا قول منسوب کرتا ہے وہ کذاب ہے"[1]

[1] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۴۔

شرم وحیا | امام ذہلی جس طرح ایک جلیل القدر محدث وقت تھے، طبعاً نہایت شرمیلے اور باحیا بھی تھے۔ وفات کے بعد جب اُن کو غسل دیا جا رہا تھا، اُن کی خادمہ قریب ہی کھڑی ہوئی تھی، کہنے لگی "میں نے ابوعبداللہ کی خدمت تیس برس تک کی، اور اُن کے غسل و وضو کے لیے میں ہی پانی رکھتی تھی لیکن میں نے اُن کی مملوکہ ہونے کے باوجود کبھی ایک مرتبہ بھی ان کی پنڈلی نہیں دیکھی۔"[1]

وفات | ان کی تاریخ وفات میں شدید اختلاف ہے، علامہ بغدادی نے کئی روایتیں نقل کی ہیں، لیکن حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ اُن کی وفات ماہ ربیع الاول ۲۵۸ھ میں ہوئی ہے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال کئی نامور محدثین احمد بن سیار القطان، احمد بن حفص بن عبداللہ السلمی، حمید بن الربیع الخزار الکوفی اور شیخ صوفیہ یحییٰ بن معاذ نے وفات پائی۔[2]

ابومحمد یحییٰ بن یحییٰ اللیثی

نام و نسب | یحییٰ نام، ابومحمد کنیت، والد کا نام بھی یحییٰ تھا۔ بربریوں کے ایک قبیلہ مصمودہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بنولیث کے غلام تھے اس بنا پر اُن کی طرف منسوب ہو کر لیثی کہلاتے ہیں۔ ان کے دادا ابوعیسیٰ اندلس میں آکر قرطبہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے یحییٰ یہیں پیدا ہوئے اور یحییٰ بن مضر القیسی الاندلسی سے احادیث کا سماع کیا۔ اس کے بعد ابھی اٹھارہ برس

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۴۱۹ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۳

سکے ہی تھے کہ طلب علم میں مشرق کی طرف چلے گئے اور وہاں کتاب الاعتکاف کے چند ابواب کے سوا تمام موطا امام مالک خود امام مالک سے سُنا، مکہ میں اُنہوں نے حضرت سفیان بن عیینہ سے، مصر میں لیث بن سعد، عبداللہ بن وہب، اور عبدالرحمن بن القاسم سے درس حدیث لیا[1]۔ ان بزرگوں کے علاوہ اُن کے اساتذہ کی فہرست میں حسب ذیل حضرات بھی داخل ہیں :-

یحییٰ بن مضر، ابن القاسم، القاسم بن عبداللہ العمری، ابوضمرہ،

تلامذہ اُن سے جن لوگوں نے روایت کی اُن میں خود اُن کے فرزند عبیداللہ، بقی بن مخلد، محمد بن وضاح، محمد بن العباس، صباح بن عبدالرحمن العتیقی وغیرہم داخل ہیں[2]۔

علم کا شوق وہ علم حاصل کرنے کے اتنے دھنی تھے کہ کسی چیز کی طرف وہ خواہ کتنی ہی دلچسپ ہو، نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ امام مالک نے اُن کا لقب "عاقل اہلِ اندلس" رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ امام مالک حدیث کا درس دے رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے کہا "ہاتھی آ گیا" جتنے لوگ اس وقت درس میں شریک تھے سب ہاتھی دیکھنے چلے گئے، لیکن یحییٰ اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے۔ امام مالک نے پوچھا "اندلس میں تو ہاتھی ہوتا نہیں ہے پھر تم ہاتھی دیکھنے کیوں نہیں گئے؟" حضرت یحییٰ بولے "حضرت! میں یہاں آپ کا فیض صحبت اُٹھانے اور آپ کے علم اور اسوہ سے کچھ حاصل کرنے آیا ہوں، اس لیے نہیں آیا کہ ہاتھیوں کو دیکھتا پھروں" امام مالک کو اُن کا یہ جواب بیحد پسند آیا، اور اُس دن سے آپ نے اُن کو عاقل

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۶   [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱ -

اہلِ اندلس کہنا شروع کردیا[1]۔ حضرت یحییٰ کو امام مالک کے ساتھ بڑی خصوصیت تھی۔ اُن کے مؤطا کا اندلس میں چرچا انہی کی وجہ سے ہوا۔

فقہ | انہوں نے فقہ کی تحصیل بھی امام مالک سے اور دوسرے علماءِ مدینہ سے کی تھی۔ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں "اندلس میں امام مالک کے فقہ کی اشاعت حضرت یحییٰ کی بدولت ہی ہوئی[2]۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں " وکان فقیہاً حسن الرای"۔

فتویٰ | وہ فتویٰ بھی دیتے تھے، اور اس معاملہ میں وہ اندلس کے سب سے بڑے امام سمجھے جاتے تھے۔ ابن خلکان لکھتے ہیں "یحییٰ بن یحییٰ اندلس واپس آئے تو یہاں علم کی ریاست انہی پر ختم تھی۔ انہی کی وجہ سے اس ملک میں "مالکی" مسلک کی اشاعت ہوئی۔ اور اُن سے اتنی کثیر جماعت نے فقہ حاصل کیا کہ اُن کا شمار بھی نہیں ہوسکتا" ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ عیسیٰ بن دینار کے بعد اندلس کے سب سے بڑے مفتی یحییٰ بن یحییٰ ہی تھے۔ یہاں کے عوام اور خواص آپ کی ہی رائے کی طرف رجوع کرتے تھے[3]۔

ان کے تفقہ کا ایک عجیب واقعہ | ان کو اپنے تفقہ سے جو بات حق معلوم ہوتی تھی اُس کے اظہار میں رعب وہیبتِ سلطانی بھی مانع نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اندلس کا حاکم امیر عبدالرحمٰن بن الحکم الاموی ماہِ رمضان میں اپنی ایک محبوب لونڈی سے مجامعت کر بیٹھا تھا۔ اُس وقت تو بحالتِ اضطرار اس سے یہ حرکت سرزد ہوگئی لیکن بعد میں اُس کو اپنے فعل پر بہت ندامت ہوئی، فتویٰ طلب کرنے کے لیے فقہاءِ شہر کو جمع کیا۔ اُن میں حضرت یحییٰ بن یحییٰ بھی شامل تھے۔ ان سے کفارہ کی

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۶ [2] شذرات الذہب ج ۲ ص ۸۲ [3] بحوالہ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۰۱

نسبت پوچھا گیا تو اُنھوں نے فرمایا، امیر کو پے بہ پے دو مہینوں کے روزے رکھنے چاہئیں حضرت یحییٰ کی جلالتِ شان مسلم تھی۔ اُن کے اس فتوی کو سُن کر دوسرے فقہاء خاموش رہے لیکن امیر کے پاس سے چلے آنے کے بعد اُنھوں نے ان سے دریافت کیا کہ امام مالک تو اس نوع کے مسائل میں خیار کے قائل ہیں۔ یعنی وہ یہ فرماتے ہیں کہ کفارۂ صوم میں روزہ دار کو اختیار ہے، کوئی غلام آزاد کرے، ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ پھر آپ نے اس سے انحراف کر کے صرف دو ماہ کے روزوں پر ہی کیوں اصرار کیا؟ آپ نے جواب دیا "اگر ہم نے امیر کے لیے یہ دروازہ کھول دیا تو اُس کے لیے بہت آسان ہوگا کہ روز مجامعت کرے اور کفارہ میں کوئی غلام آزاد کر دے۔ یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔ اس بنا پر میں نے صرف ایسی چیز بتائی ہے جو امیر کے لیے بہت مشکل ہے، تاکہ وہ ایک مرتبہ ایسی حرکت کرنے کے بعد دوسری مرتبہ ایسا کرنے کی جسارت نہ کرے"[1]۔

جامعیت حضرت یحییٰ کی ذات مختلف علمی، عملی، اخلاقی، اور روحانی ونفسانی کمالات کا مجموعہ تھی۔ ابن عماد الحنبلی کا ارشاد ہے "وہ کثیر العلم، عظیم المرتبت، اور نہایت ہی محترم و موقر امام تھے اُن کی عقل کامل تھی، نفس بہت نیک اور اچھا تھا، فضل وافر رکھتے تھے۔ عبادت بہت کرتے تھے"[2] احمد بن خالد کا بیان ہے "جب سے اندلس میں اسلام داخل ہوا ہے۔ یہاں کے علماء میں سے کسی کو وہ جاہ وجلال، عظمت و برتری نصیب نہیں ہوئی جو حضرت یحییٰ بن یحییٰ کو حاصل ہوئی، وہ اپنی وضع قطع اور نشست و برخاست کے طور طریق میں بالکل امام مالک معلوم ہوتے

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۷ [2] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۱۷۔

تھے۔ ابوالولید بن الفرضی کہتے ہیں "حضرت یحییٰ امام وقت اور اپنے ملک کے تنہا امام تھے"[1]

جلالتِ شان | ان گوناگوں کمالات کے باعث وہ جس طرح پبلک میں انتہائی عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے، اسی طرح شاہی دربار میں بھی اُن کی بڑی توقیر کی جاتی تھی۔ سلطنت کی جانب سے اُن کو عہدۂ قضا پیش کیا گیا لیکن اُنہوں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ اس انکار سے اُن کی وقعت و عزت دوچند ہوگئی۔ اور وہ سلطان کی نگاہ میں اس درجہ موقر ہوگئے کہ اُن کے مشورہ کے بغیر ملک کا کوئی اہم معاملہ سرانجام نہیں پاتا تھا۔ یہاں تک کہ گورنروں کے عزل و نصب میں بھی انہی کی رائے کو مقدم رکھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر علامہ ابن حزم اندلسی فرماتے ہیں کہ "جس طرح امام ابوحنیفہ کے فقہ کی اشاعت حضرت قاضی ابویوسف کے چیف جسٹس ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ کیونکہ اس بلند عہدہ اور مخصوص علمی وقار کی وجہ سے اُن کو خلافتِ عباسی کے دربار میں اتنا رسوخ حاصل تھا کہ اقصیٰ مشرق سے لے کر اقصیٰ افریقہ تک صرف وہی لوگ گورنری ایسے بڑے مناصب پر سرفراز کیے جاتے تھے جو فقہی مسائل میں قاضی ابویوسف کے ہم خیال وہم رائے ہوتے تھے۔ اسی طرح بلادِ اندلس میں مالکی فقہ کی اشاعت حضرت یحییٰ بن یحییٰ کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے ہوئی۔ سلطان حکام کے عزل و نصب میں انہی سے مشورہ کرتا تھا۔ اور وہ عہدوں کی تقرری کے لیے انہی علماء کو ترجیح دیتے تھے جو امام مالک کے مسلک کے پابند ہوتے تھے"[2] لیکن حضرت یحییٰ امام مالک کے مقلد محض نہ تھے، بلکہ اُن کے مسائل میں آزادانہ رائے رکھتے تھے۔ چنانچہ کئی مسئلوں میں اُنہوں

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۶ [2] ایضاً ص ۲۱۶ اگرچہ ہمارے خیال میں ابن حزم کی یہ رائے قابلِ غور ہے

نے امام سے خلاف بھی کیا ہے

تقویٰ و طہارت | عملی اعتبار سے وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ یہاں تک کہ ابنِ بشکوال کہتے ہیں کہ وہ مستجاب الدعوات تھے[1]

وفات | ماہ رجب ۲۳۴ھ یا ۲۳۶ھ میں وفات پائی[2]

محمد بن عمر الواقدی

نام و نسب | محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت۔ ان کے دادا کا نام واقد تھا، انہی کی نسبت سے واقدی کہلاتے ہیں۔ بنو ہاشم، اور بعض کے نزدیک بنو سہم بن اسلم کے غلام تھے[3]

ولادت | ۱۳۰ھ میں غالباً مدینہ میں پیدا ہوئے[4]

علم و تحقیق کا شوق | واقدی کی زیادہ تر شہرت ایک عالم مغازی و سیر کی حیثیت سے ہے، انہیں واقعات غزوات کی تحقیق کا شوق اس درجہ تھا کہ مقامات غزوہ کا مشاہدہ خود وہاں جا کر کرتے تھے۔ خود اُن کا بیان ہے کہ "میں صحابۂ کرام کی اولاد اور اُن کے موالی میں سے جس کسی سے ملتا اُس سے دریافت کرتا تھا کہ کیا آپ نے فلاں واقعہ کی نسبت اپنے بزرگ سے کچھ سُنا ہے کہ وہ کہاں پیش آیا۔ اور وہ کہاں قتل کیے گئے؟ جواب اثبات میں ملتا تو پھر میں خود اُس جگہ جا کر اپنی آنکھوں سے اُس کا مشاہدہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں میں مریسیع گیا، اور اُس کو خوب اچھی طرح دیکھا"

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۴۰۱ [2] ایضاً ص ۴۰۱ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۶ [4] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۶

ہارون الفردی نے ایک مرتبہ انہیں اس حالت میں دیکھا کہ پانی کا چھوٹا سا مشکیزہ ساتھ لیے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا "آپ کہاں جا رہے ہیں" بولے "میں حنین جا رہا ہوں تاکہ غزوۂ حنین کے مقام وقوع کا بچشم خود معائنہ کروں"[1]

ان کا ذوقِ جستجو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جو بات معلوم نہیں ہوتی تھی اُسے بے تکلف اربابِ خبر سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ وہ اس وصفِ خاص میں اپنے ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ ایک مرتبہ ابراہیم الحربی سے پوچھا گیا کہ امام مالک کے مسائل کس سے معلوم کیے جائیں؟ تو اُنہوں نے علامہ واقدی ہی کا نام لیا، اور کہا "آج دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو یوں کہے کہ میں نے امام مالک، سفیان ثوری، ابن ابی ذئب، اور یعقوب وغیرہم سے سوال کیا البتہ ہاں واقدی اس سے مستثنیٰ ہیں"[2]

علم وفضل | اُن کی اس جستجو اور تحقیق و تلاش کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم و فضل کے اعتبار سے دور دور مشہور ہوگئے۔ علامہ بغدادی لکھتے ہیں "واقدی اُن لوگوں میں سے تھے جن کے آوازۂ شہرت سے مشرق و مغرب معمور تھے۔ اخبار و روایات کا علم رکھنے والوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اُن سے واقف نہ ہو۔ اُن کی کتابیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک اور اُس کے بعد کے سوانح و واقعات درج ہیں۔ اور اُن میں فقہ کے مسائل اور حدیث کے اختلافات بھی ہیں"[3] ابن العماد الحنبلی انہیں "علم کا ظرف" بتاتے ہیں[4]

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۶ [2] ایضاً ص ۶، ۷ [3] ایضاً ص ۱

[4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۸۔

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ وہ امام عالم اور صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے[1] البتہ علامہ ابنِ سعد فرماتے ہیں "واقدی مغازی، سیرت، فتوحات، احکام اور حدیثوں میں علماء کے اختلافات اور اُن کے متفقہ مسائل ان سب کے عالم تھے"۔ اُن کے علم وفضل کی دلیل یہی کیا کم ہے کہ محمد بن سعد صاحبِ طبقات ایسا علامۂ یگانہ اُن کا کاتب اور تلمیذ تھا۔ البتہ انہیں عہدِ جاہلیت (عرب قبلِ اسلام) سے واقفیت بالکل نہیں تھی۔ حدیث میں درخور وافر رکھتے تھے۔ اور اپنے زمانہ کے اکابر محدثین سے حدیث کا سماع کیا تھا۔ بعض لوگوں نے ان کو امیر المومنین فی الحدیث کہا ہے لیکن اس پر تفصیلی گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

تصنیفات جو کچھ سُنتے تھے لکھتے جاتے تھے جس سے اُن کے پاس کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ بیان کیا جاتا ہے "جب وہ بغداد کی جانبِ شرقی سے جانب غربی کی طرف منتقل ہوئے تو اُن کی کتابوں کے ایک سو بیس (۱۲۰) بنڈل باندھے گئے"۔ ابو حذافہ کی روایت ہے کہ اُن کے پاس کتابوں کی چھ سو الماریاں تھیں[2] معلوم ہوتا ہے واقدی کو اپنے حافظہ پر بڑا ناز تھا۔ وہ کہا کرتے تھے "دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی کتابیں اُس کے محفوظات سے زیادہ نہ ہوں لیکن میرا حال اس کے برعکس ہے[3]"۔ اُن کی تصنیفاتِ سیر و مغازی تو مشہور ہیں ہی۔ ان کے علاوہ اُنھوں نے ایک کتاب اُن بدنصیب انسانوں کے حالات میں لکھی تھی جو عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو کر نعمتِ ایمان وسعادت سے محروم ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں ان لوگوں اور صحابۂ کرام کی

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۶ [2] کتاب الانساب للسمعانی ص ۵۷۷ [3] بغدادی ج ۳ ص ۶

جنگ کا تفصیلی تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کا نام "کتاب الرِّدَّۃ" تھا۔

قضا اور دربارِ خلافت کی قدر افزائی

علمی شہرت و کمال کے باعث خراسان سے اپنی واپسی پر مامون نے اُن کو بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی بنا دیا تھا، اور یوں بھی مامون اُن کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے مامون کے پاس ایک عریضہ لکھا جس میں اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا تھا، اور لکھا تھا کہ "مقروض ہوگیا ہوں، آپ مجھے اتنی رقم بھیج دیجیے"۔ مامون نے جواب میں لکھا کہ "آپ میں دو خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک سخاوت، اور دوسری حیا، آپ کی سخاوت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس تھا سب خرچ کر بیٹھے۔ اب رہی حیا، اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی کل رقم قرض کا ذکر نہیں کیا بلکہ اُس کا صرف ایک حصّہ بتایا ہے اس بنا پر میں نے حکم دیدیا ہے کہ آپ کی معیّنہ مطلوبہ رقم سے دوچند رقم آپ کو دے دی جائے۔ اب معلوم نہیں یہ رقم بھی آپ کے ادائے قرض کے لیے کافی ہوگی یا نہیں؟ اگر کافی نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری خود آپ پر عائد ہوتی ہے، اور اگر قرض کے ادا کرنے کے بعد بھی یہ مرسلہ رقم کچھ بچ رہے، تو آپ حسبِ عادت اس کو فراخ دلی سے خرچ کیجیے، کیونکہ اللہ کے خزانے کھلے ہوئے ہیں اور اُس کے فیضانِ کرم کے لیے کوئی مانع نہیں ہے"۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مامون نے اپنے اس خط کے اخیر میں لکھا ہے "اور ہاں! ایک مرتبہ آپ ہی نے تو یہ روایت نقل کی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا "اے زبیر! رزق کی کنجیاں عرش کے سامنے لٹکی ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اخراجات کے مطابق اُن کے رزق اتارتا رہتا ہے، جس کا خرچ زیادہ

ہوتا ہے اُسے زیادہ اور جس کا خرچ کم ہوتا ہے اُسے کم ملتا ہے" واقدی نے یہ روایت پڑھ کر کہا کہ میں اس کو بھول گیا تھا۔ اب مامون کے یاد دلانے سے یاد آئی ہے تو مجھ کو اس کی اس درجہ مسرت ہوئی کہ اُس کے عطیہ سے بھی نہیں ہوئی۔[1]

دربارِ خلافت کے علاوہ یحییٰ بن خالد البرمکی بھی واقدی کی بہت تعظیم و توقیر کرتا، اور اُن کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا۔ خود اُن کا بیان ہے "ایک مرتبہ عید قریب آگئی اور میرے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ میں اپنے بچوں کے لیے کپڑوں کا انتظام کرسکوں۔ کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تو اپنے ایک تجارت پیشہ دوست کے پاس آیا اور اپنی ضرورت ظاہر کرکے اُس سے کچھ روپیہ قرض طلب کیا اُس نے کئی سر بمہر تھیلیاں میرے سامنے لاکر رکھ دیں جن میں ایک لاکھ دو سو درہم تھے۔ میں انہیں لے کر گھر چلا آیا، لیکن ابھی یہاں آئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرا ایک ہاشمی دوست آیا، اور میری طرح اُس نے اپنی پریشانی اور ضرورت کا اظہار کرکے مجھ سے کچھ روپیہ بطور قرض طلب کیا۔ میں نے گھر میں آکر اپنی بیوی سے مشورہ کیا کہنے لگیں "تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے جواب دیا "میں تو یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ ہم دونوں اُس رقم کو آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیں" میری بیوی بولیں "سبحان اللہ! یہ آپ نے کیا سوچا ہے؟ ذرا یہ تو سوچیے کہ آپ ایک معمولی سے آدمی کے پاس گئے اور اُس نے آپ کی ضرورت کا حال معلوم کرکے فوراً ایک لاکھ دو سو درہم کی تھیلی آپ کی خدمت میں پیش کردی، لیکن یہاں آپ کے پاس ایک ایسا دوست

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۶ علامہ بغدادی نے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون کا یہ عطیہ ایک لاکھ درہم تھا۔

آتا ہے جو ہاشمی ہونے کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ نسبت رکھتا ہے۔ آپ اُس کو نصف پر ہی ٹالنا چاہتے ہیں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کل رقم ہی اُس کے حوالہ کر دیجیے" میں نے بیوی کے مشورہ کے مطابق ایسا ہی کیا کہ جو کچھ قرض لایا تھا، سب کا سب ہاشمی دوست کے نذر کر دیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میرے تاجر دوست کو بھی قرض کی ضرورت پیش آگئی۔ کیونکہ اُس کے پاس جو کچھ تھا وہ مجھے دے چکا تھا، تو وہ میرے دوست ہاشمی کے ہی پاس آیا جو خود اُس کا بھی دوست تھا۔ ہاشمی نے اُس کی پریشانی کا حال سُن کر وہ سربمہر تھیلیاں جوں کی توں اُس کے حوالہ کر دیں۔ اب اُس نے تھیلیوں پر اپنی مہر دیکھی تو اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی فوراً میرے (واقدی) پاس آیا۔ میں نے اُسے سارا قصہ از اوّل تا آخر سُنا دیا، اب رائے یہ قرار پائی کہ چونکہ ہم تینوں حاجتمند ہیں اور ہمارے پاس ان تھیلیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس لیے ہم کو چاہیے کہ انہیں ہی آپس میں تقسیم کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی کر لیا گیا۔ شدہ شدہ اس واقعہ کی خبر یحییٰ بن خالد برمکی کو پہنچ گئی۔ اُس نے اپنا قاصد بھیج کر مجھ کو طلب کیا۔ میں نے حاضر ہو کر جو واقعہ پیش آیا تھا بتمام و کمال سُنا دیا تو اُس نے اپنے خادم سے کہا "میاں! ذرا وہ تھیلی اُٹھا لانا" خادم نے فوراً حکم کی تعمیل کی، اُسے کھولا گیا تو معلوم ہوا اُس میں دس ہزار دینار رکھے۔ جن کو یحییٰ نے اس طرح تقسیم کر دیا کہ دو دو ہزار دینار ہم تینوں دوستوں کو، اب بچے چار ہزار سب کے سب اُس نے میری بیوی کو یہ کہہ کر بطور عطیہ دے دیے کہ "یہ نیک دل خاتون تم سب سے زیادہ کریمۃ النفس ہے"[1]

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۱۹ و ۲۰۔

علامہ مسعودی نے بھی "مروج الذہب" میں اس واقعہ کا اسی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ علامہ بغدادی یحییٰ بن خالد کا نام لیتے ہیں، اور مسعودی اس کو مامون کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بہرحال ان دونوں میں سے کوئی ہو، اسلامی تعلیم نے سوسائٹی میں جو اخلاق فاضلہ پیدا کر دیے تھے اس واقعہ سے ان کی ایک جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔ اور یہ معلوم کرنا دشوار نہیں رہتا کہ اسلام کے ابر کرم و فیض نے مرد، عورت، امیر غریب، غلام اور آزاد غرضکہ انسانی جماعت کے ہر طبقہ اور ہر گروہ کو کس درجہ بلند اخلاق اور شمائل سے آراستہ و پیراستہ بنا دیا تھا۔ کیا دنیا کی کوئی قوم اپنی تاریخ میں انسانی جماعتوں کے اجتماعی تہذیب نفس و تربیت اخلاق کی زیادہ نہیں ایسی دو چار روشن نظائر بھی دکھا سکتی ہے؟

آزاد ذریعہ معاش | علم و فضل میں یگانۂ روزگار ہونے کے باوجود علامہ واقدی کی غیرت نفس نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے علم کو ذریعہ معاش بنا کر امرا، و رؤسا کے عطیوں پر گذر بسر کریں، بلکہ وہ اپنی معاش اپنی قوت بازو سے پیدا کرتے تھے۔ وہ مدینہ میں لوگوں سے مضاربت کر کے گیہوں بیچتے تھے۔ یعنی سرمایہ دوسروں کا ہوتا تھا، اور کام خود کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ ان کے پاس ایک لاکھ درہم تھے۔ سوء اتفاق سے وہ کہیں تلف ہو گئے۔ روپیہ والوں نے ان کو پریشان کیا، یہ بالکل خالی ہاتھ تھے، قرض کا معاملہ، جب سخت تنگ آگئے تو مجبوراً یحییٰ بن خالد برمکی سے ملنے بغداد آئے۔ یحییٰ کے مکان پر پہنچ کر دہلیز میں ہی بیٹھ گئے۔ یحییٰ کے نوکروں اور دربانوں نے کہا کہ آپ ذرا توقف کیجیے، کھانے کا وقت آجائے تو آپ ملاقات کر سکینگے۔ کیونکہ یحییٰ کی

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۱۹ و ۲۰۔

یہ عادت ہے کہ جو کوئی اُن سے ملنے آتا ہے اُس سے وہ دسترخوان پر ملاقات کرتے اور اپنے ساتھ اُسے بھی شریکِ طعام کرتے ہیں، صرف کھانے کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اُس وقت کسی شخص کے لیے روک ٹوک نہیں ہوتی"، علامہ واقدی بیان کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا یحییٰ کے کھانے کا وقت آیا، تو ایک طویل دسترخوان بچھایا گیا اور دربانوں نے مجھ کو بھی وہیں لیجا کر بٹھا دیا۔ اثناءِ طعام میں یحییٰ کے استفسار پر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ کھانے سے فراغت اور ہاتھ منہ دھو لینے کے بعد میں آگے بڑھا اور (عربی تہذیب و تمدن کے مطابق) میں نے چاہا کہ یحییٰ کے سر کو بوسہ دوں، لیکن یحییٰ نے اپنا سر ہٹا لیا اور مجھے اس کا موقع نہیں دیا۔ پھر میں رخصت ہو کر مکان کے باہر چبوترہ تک پہنچا تھا، اور سوار ہو کر واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک خادم ایک ہزار دینار کی تھیلی لیے ہوئے آیا، اور مجھے دے کر کہنے لگا "وزیر معظم آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آج ان کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کیجیے اور کل پھر تشریف لائیے" حسبِ طلب میں دوسرے دن پہنچا تو یہی واقعہ پیش آیا۔ میں نے یحییٰ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور جب چلنے لگا تو ایک خادم نے ایک ہزار دینار کی تھیلی لا کر دی اور وہی پیغام سنایا کہ "وزیر کرم آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کل پھر تشریف لائیگا" میں نے اس پیغام کے مطابق ایسا ہی کیا تو پھر وہی صورتِ حال پیش آئی، یعنی میں نے گذشتہ دو دنوں کی طرح یحییٰ کے ساتھ ہمطعامی کی، اور روانگی کے وقت وہی ایک ہزار دینار کی تھیلی پیش کی گئی اور دوسرے روز آنے کی وہی دعوت بھی دی، چوتھے دن پھر یہی واقعہ پیش آیا لیکن اس دفعہ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ میں یحییٰ کے بوسۂ سر کے لیے آگے بڑھا تو انہوں نے حسب سابق مزاحمت

نہیں کی، اور مجھ کو بوسہ سے منع نہیں کیا۔ پھر اس کے بعد خود ہی فرمایا "میں نے اس سے قبل آپ کو اپنے سر کا بوسہ نہیں لینے دیا لیکن آج میں نے اس سے منع نہیں کیا۔ آپ کو اس پر تعجب ہوگا۔ سُنیے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آج سے قبل تک آپ کے ساتھ کوئی ایسا احسان نہیں کیا تھا جس کے باعث آپ میرے سر کا بوسہ لے کر مجھے ممنونِ کرم کرتے۔ البتہ ہاں! آج آپ کو میری طرف سے کچھ نفع پہنچ چکا ہے، تو اب آپ کا حق ہے کہ میرے ساتھ تعظیم و تکریم کا معاملہ کریں"۔ یہ کہہ کر اپنے ملازم سے خطاب کیا اور کہا "اے میاں! دیکھنا ان کو دو لاکھ درہم کی ایک تھیلی دیدو"۔ پھر روئے سخن میری جانب کر کے فرمایا "آپ ان میں سی ایک لاکھ درہم اپنے قرض میں دیدیجیے، اور بقیہ ایک لاکھ اپنی ضرورتوں پر خرچ کر لیجیے"۔ اس کے بعد مجھ سے باصرار کہا کہ اب آپ یہیں میرے پاس میرے مکان میں قیام فرمائیے۔ میں نے عرض کی "اگر آپ بالفعل مجھ کو مدینہ واپس جانے کی اجازت دیدیں تو بہتر ہو۔ میں وہاں جا کر جن لوگوں کا روپیہ میرے ذمہ واجب الادا ہے اُسے ادا کر دوں۔ پھر ایسا ہی ہو تو آپ کے پاس واپس چلا آؤنگا۔ یحییٰ نے میری یہ درخواست منظور کر لی۔ اور حکم دیا کہ میرے لیے سفر مدینہ کا انتظام مکمل کر دیا جائے"۔ چنانچہ میں مدینہ پہنچا۔ وہاں کے قرضخواہوں کا روپیہ اُن کو ادا کیا، اور پھر حسب وعدہ بغداد میں واپس آکر یحییٰ بن خالد کے زیر سایۂ عاطفت زندگی بسر کرنے لگا۔[1]

جود و سخا اور کشادہ دلی | علامہ واقدی جیسا کہ مذکورۂ بالا واقعۂ احباب سے ثابت ہوتا ہے، نہایت

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۵۰۴۔

فراخ دل اور کشادہ دست تھے۔ وہ روپیہ کو تکمیلِ حاجات و ضروریات زندگی کا ذریعہ سمجھتے تھے
بخیلوں اور زر پرست لوگوں کی طرح اُسے جوڑ جوڑ کر رکھنا اور اصل مقصد بنا لینا اُن کے نزدیک
نہایت معیوب و مذموم تھا، علامہ بغدادی لکھتے ہیں "وکان جواداً کریماً مشہوراً بالسخاء" خود
مامون بھی اُن کی اس خصلت کا اعتراف کرتا تھا۔ اُن کے اپنے بیان کے مطابق انہیں سلطان
کی طرف سے چھ لاکھ درہم ملے، مگر کبھی اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی۔ انتہا یہ ہے کہ اُن کا انتقال
ہوا تو بے سر و سامانی کا یہ عالم تھا کہ کفن تک کا انتظام کرنے کے لیے گھر میں روپیہ نہیں تھا مامون
کو خبر ہوئی تو اُس نے کفن بھجوایا، اور طرفہ یہ ہے کہ اُنہوں نے عہدۂ قضا کی خدمات انجام دینے
کے زمانہ میں وفات پائی تھی۔[۱]

واقدی پر جرح یہ عجیب بات ہے کہ علامہ واقدی ایک طرف تاریخ و مغازی کے مسلّمہ عالم
تسلیم کیے جاتے ہیں، لیکن دوسری جانب علماءِ حدیث نے اُن پر نہایت سخت جرح کی
ہے۔ امام احمد بن حنبل، علی بن المدینی، امام شافعی، اور امام نسائی ان سب میں پیش پیش ہیں
انہوں نے ان کو صرف ضعیف کہنے پر ہی بس نہیں کی۔ بلکہ انہیں متروک الحدیث، کذاب،
لیس بشیء، اور وضاع ایسے الفاظ جو عموماً رواۃ کی جرح میں استعمال ہوئے ہیں، سب ہی کچھ
کہہ دیے گئے ہیں۔ ان حضرات کے برخلاف بعض علماءِ حدیث ایسے بھی ہیں جنہوں نے اُن
کی ثقاہت کو تسلیم کیا ہے۔ ابراہیم بن جابر الفقیہ کا بیان ہے کہ میں نے صغانی سے سُنا ہے
فرماتے تھے۔ اگر واقدی ثقہ نہ ہوتے تو میں اُن سے کس طرح روایت کرتا؟ مصعب الزبیری

[۱] تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۲۰۔

کہتے ہیں" وہ ثقہ اور مامون ہیں" ابن نمیر سے اُن کی نسبت دریافت کیا گیا تو بولے" یہاں تو اُن کی احادیث صحیح ہی ہیں۔ رہے اہل مدینہ وہ اُن سے زیادہ واقف ہیں۔ ابو عبید بھی ان کو ثقہ مانتے تھے[1] مجاہد بن موسیٰ سے اُن کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "ما کتبت عن احدٍ احفظ منہ" ماوردی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ واقدی حدیث میں امیرالمومنین تھے" ابراہیم الحربی انہیں "امین الناس علی الاسلام" بتلاتے ہیں[2]۔

جرح و تعدیل پر تبصرہ اصل یہ ہے کہ علامہ واقدی کی وسعتِ معلومات۔ اور اُن کے علم و فضل میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ البتہ سوال صرف یہ ہے کہ روایات میں وہ قابلِ استناد بھی ہیں یا نہیں؟ اہل علم جانتے ہیں کہ علماءِ جرح و تعدیل نے روایت و درایت کے جو اصول قائم کیے ہیں وہ اس قدر سخت ہیں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا عالم و فاضل ہو۔ اگر وہ اُس معیار پر پورا نہیں اُترتا ہے تو علماءِ حدیث کی نگاہِ نکتہ چین و دقیقہ رس میں اُسے پایۂ اعتبار حاصل نہیں ہوسکتا۔ مشہور محدث اسحاق بن راہویہ نے کسی جگہ فرمایا ہے کہ بعض وہ لوگ جن کو ہم کسی خامی کی وجہ سے ساقط الاعتبار قرار دے دیتے ہیں نیکی اور زہد و اتقاء کی وجہ سے اُن کی روحیں جنت میں سبز پرندوں کی شکل میں اُڑتی پھرتی ہونگی، اور حق یہ ہے کہ جرح و تعدیل میں علماءِ حدیث کی یہ سختی، اور تنقیدِ رواۃ میں اُن کی یہ غیر معمولی بیمروتی اور درشتی ہی اس بات کی ضامن ہے کہ جن رواۃ کو ان بزرگوں نے ثقہ، اور جن روایات حدیث کو انہوں نے صحیح و معتبر مانا ہے وہ یقیناً صحیح ہی ہونگی۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر اب اگر علامہ

---

[1] ان اقوال کے لیے دیکھو تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۵۔

واقدی کے معاملہ پر نظر کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو خود واقدی میں ایسی کمزوریاں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے علم و فضل کے باوجود اکابر محدثین کے نزدیک ثقہ راویوں کی صف میں شمار نہیں کیے گئے۔ اور کچھ انفرادی طور پر بعض ائمہ فن کو اُن کے متعلق کسی خاص حدیث میں کوئی غلط فہمی ہوگئی اور اس بنا پر وہ اُن کی توثیق نہیں کر سکے۔

پہلی شق کی تفصیل یہ ہے کہ راوی کی ثقاہت کے لیے جو شرطیں مقرر ہیں اُن میں قوتِ حفظ کو بہت اہمیت حاصل ہے لیکن واقدی کے حالات کے تتبع سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ اپنے حافظہ پر ناز کرتے تھے لیکن اُن کا حافظہ شروع سے کمزور تھا یا عمر کے تقاضے اور عوارض و امراض کی وجہ سے آخر میں کمزور ہوگیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ علامہ بغدادی نے یہ لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ مامون نے واقدی سے کہا کہ آج جمعہ کی نماز آپ پڑھائیے اُنھوں نے معذرت کی اور کہا کہ "اے امیر المومنین مجھ کو سورۂ جمعہ یاد نہیں ہے"۔ مامون نے کہا" اچھا! سورۂ جمعہ میں آپ کو یاد کرادونگا۔ چنانچہ مامون نے سورۃ ٹکڑے کرکر کے پڑھنی شروع کی، اور واقدی سے کہا کہ آپ بھی پڑھیے۔ اس طرح انھوں نے نصف سورۃ حفظ کرلی لیکن اس کے بعد پھر بقیہ نصف سورۃ یاد کی تو سورۃ کا نصف اوّل بھول گئے۔ اب نصف اول پھر یاد کیا تو نصف ثانی بھول گئے۔ کئی مرتبہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ آخرکار مامون اُکتا گیا، اس پر غنودگی طاری تھی، سوگیا۔ اب واقدی نے ایک اور شخص جو اُس وقت وہاں موجود تھے، اور جن کا نام علی بن صالح تھا اُن سے کہا کہ آپ مجھ کو سورۂ جمعہ یاد کرا دیجیے۔ اُنھوں نے سورۃ یاد کرانی چاہی تو اُن کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اتنے میں مامون کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے یہ واقعہ

معلوم ہوا تو کہا " واقدی ایک ایسے شخص ہیں جو تاویل تو یاد رکھتے ہیں لیکن تنزیل یاد نہیں رکھتے"[1]

اس کے علاوہ اُن کے ضعفِ حافظہ کی تائید اُس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے اور جس میں مامون نے اپنے عطیہ کے ساتھ انہی کی روایت کی ہوئی انہیں ایک حدیث یاد دلائی۔ یاد ہوگا، علامہ واقدی نے اُسے سُن کر بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا کہ میں تو اسے فراموش ہی کر چکا تھا۔"

ضعفِ حافظہ کے علاوہ وہ عام طور پر اپنی روایت کو ایسے راویوں کی طرف منسوب کر دیتے تھے جن سے خود اُن کو سماع حاصل نہیں تھا۔ اصولِ حدیث کی اصطلاح میں اس کو تدلیس کہتے ہیں اور جو شخص ایسا کرتا ہو اُسے محدثین کی نگاہ میں کچھ زیادہ پایۂ اعتبار حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں " واقدی تو اسانید گھڑتے ہیں" حضرت یحییٰ بن معین فرماتے تھے " واقدی کو دیکھو وہ عاتکہ بنتِ عبد المطلب سے روایت کرتے ہیں اور حمزہ بن عبد المطلب سے بھی"[2]

ان کی ان ذاتی کمزوریوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں قدمین کو ان کی طرف سے مغالطہ پیدا ہو گیا تھا۔ مثلاً امام احمد بن حنبل کی واقدی کی طرف سے بدگمانی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت عبد اللہ بن ابن مکتوم والی مشہور حدیث حجاب اُن کے نزدیک صرف یونس سے مروی تھی اور واقدی اُس کو معمر سے روایت کرتے تھے۔ امام

---

[1] بغدادی ج ۳ ص ۷ [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۱۳

احمد کی رائے میں واقدی کا یہ جرم اتنا شدید تھا کہ محض اس کی بنا پر اگر کوئی شخص اُن سے روایت کرنی بھی چاہتا تھا تو وہ اُسے سختی سے منع کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن المدینی نے ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل پر واقدی سے سماع کرنے کا اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اُنہوں نے بالکل صفائی کے ساتھ فرمایا "ایک ایسے شخص سے روایت کرنا کس طرح حلال ہوسکتا ہے جو معمر سے نبہان مکاتب اُم سلمہ کی حدیث روایت کرتا ہے، حالانکہ اُس میں یونس متفرد ہیں لیکن راوی بیان کرتے ہیں" میں علی بن مدینی کی زبان سے امام احمد بن حنبل کا یہ قول سُننے کے بعد مصر آیا تو وہاں معلوم ہوا کہ ابن ابی مریم بھی نافع سے اس روایت کو نقل کرتے ہیں میں نے خود ابن ابی مریم کی زبان سے یہ روایت سُنی تو بیساختہ ہنسی آگئی۔ ابن ابی مریم نے ہنسی کی وجہ دریافت کی تو میں نے اُن کو پورا واقعہ سُنایا، اور کہا کہ یہاں آپ نافع سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں جو یونس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ حالانکہ امام احمد بن حنبل کا یہ اذعان تھا کہ یونس کے علاوہ یہ روایت کسی اور سے منقول ہی نہیں ہے۔ ابن ابی مریم بولے "ہمارے شیوخِ مصر کو امام زہری کی روایات کی طرف بڑی توجہ تھی"[1] (یہ حدیث نبہان سے امام زہری نے روایت کی ہے اور اُن کی مرویات میں شامل ہے) راوی اس پورے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد آخر میں کہتے ہیں

هذا مما ظُلِمَ فيه الواقدی — اس واقعہ میں واقدی پر ظلم کیا گیا ہے۔

اِن سب چیزوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ واقدی کی روایتوں کو مطلقاً مردود

---

[1] یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۴ اور تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۱۸ میں مذکور ہے۔

نہ قرار دیا جائے۔ البتہ اگر ان کی بیان کردہ روایت کسی ایسی روایت سے متعارض ہو جو اُن سے زیادہ ثقہ اور معتمد راوی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، تو اُس وقت اُن کی روایت ترک کر دینی چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کے سامنے ایک مرتبہ واقدی کی ایک روایت نقل کی گئی تو انھوں نے اُس کو سُن کر اپنا سر جھکالیا اور زبان سے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔[1]

وفات | ۱۱۔ ذی الحجہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔[2]

محمد بن سعد الزہری

نام و نسب | محمد نام۔ ابو عبداللہ کنیت، والد کا نام سعد تھا۔ حسین بن عبداللہ بن عبید اللہ بن العباس بن عبد المطلب کے آزاد کردہ غلام تھے۔[3]

ولادت و دیگر حالات | ۱۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔[4] اصل وطن بصرہ تھا، لیکن بغداد میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہشیم، ولید بن مسلم، ابن عیینہ، ابن علیہ، ابو ضمرہ، معن بن عیسیٰ، ابو الولید الطیالسی، اور دوسرے کثیر علماء سے روایت کی ہے۔ اور خود ان سے جن حضرات نے روایت کی اُن میں سے چند کے اسماءِ گرامی یہ ہیں: احمد بن عبید، ابن ابی الدنیا، احمد بن یحییٰ، حارث بن ابی اسامہ، حسین بن محمد بن الفہم۔[5]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۱۲ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۷ [3] ایضاً [4] معجم المطبوعات ج ۱ ص ۱۱۶
[5] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۸۲۔

علم وفضل | لیکن اُن کو سب سے زیادہ خصوصیت واقدی سے رہی ہے، وہ اُن کے کاتب تھے، اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے عرصہ تک اُن کی مصاحبت کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ شاگرد ہونے کے باوجود علامہ ابن سعد استناد و اعتماد کے لحاظ سے اپنے استاد سے کہیں زیادہ فائق و برتر ہیں علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "وہ ارباب علم وفضل، اور اصحابِ فہم و عدالت میں سے تھے انہوں نے صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے طبقات میں ایک بڑی کتاب لکھی ہے، اور حق یہ ہے کہ خوب اور بہت خوب لکھی ہے" پھر ایک اور موقع پر فرماتے ہیں "محمد بن سعد ہمارے نزدیک اہل عدالت میں سے تھے۔ اُن کی بیان کردہ حدیثیں اُن کی سچائی کی دلیل ہیں، کیونکہ وہ اُن میں بہت چھان بین سے کام لیتے ہیں[1]"۔ ابن عماد حنبلی انہیں "الامام الحبر[2]" اور ابن خلکان انہیں "احد الفضلاء النبلاء الاجلاء" لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "ابن سعد کثیر العلم اور کثیر الحدیث والروایہ تھے۔ انہوں نے غرائب حدیث اور فقہ پر بھی کتاب لکھی ہے[3]" حافظ ذہبی انہیں الحافظ العلامہ لکھتے ہیں[4]۔

جلالت علم | اُن کی جلالتِ علم کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ امام احمد بن حنبل ایسا جلیل المرتبہ محدث ہر جمعہ کو ابنِ سعد کے پاس اپنا آدمی بھیج کر اُن کے ذخیرۂ حدیث میں سے دو جزو منگواتا اور ایک ہفتہ تک اُن کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں واپس کر دیتا تھا۔ ابراہیم الحربی کہتے ہیں کہ اگر منگوا کر مطالعہ کرنے کے بجائے امام احمد خود علامہ ابنِ سعد کے پاس

---

[1] خطیب بغدادی ج ۵ ص ۳۲۱ [2] شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۹ [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۸۳
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۔

جا کر احادیث کا سماع کرتے تو یہ اُن کے لیے زیادہ بہتر ہوتا[1]۔

تصنیفات | علامہ ابن سعد کثیر التصانیف تھے۔ اُن کی سب سے زیادہ مشہور اور اہم کتاب "کتاب الطبقات" ہے جو عموماً طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ ابن خلکان اور صاحب کشف الظنون نے اس کی پندرہ جلدیں بتائی ہیں لیکن مولانا شبلی نعمانی سیرۃ النبی کے مقدمہ میں اس کی بارہ جلدیں ہی بتاتے ہیں۔ صاحب کشف الظنون کہتے ہیں۔

"علامہ ابن سعد نے یہ کتاب پندرہ جلدوں میں تصنیف کی تھی۔ مگر بعد میں خود ہی اس کا انتخاب کیا تھا"[2] اس کے علاوہ علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی طبقات کا انتخاب کیا جس کا نام "انجاز الوعد المنتقی من طبقات ابن سعد" رکھا[3]۔ اس کتاب میں سیرت نبوی، مغازی، بدریین، مہاجرین، اہل مدینہ، کوفیین، خواتین، انصار، صحابہ کرام، تابعین عظام وغیرہم سب کا ہی ذکر ہے۔ یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا مکمل نسخہ موجود نہیں تھا۔ سب سے پہلے شہنشاہ جرمن کو اسکی طباعت و اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اور اُنہوں نے ایک لاکھ روپیہ جیب خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو (ED. SACHAU) کو اس کام پر مامور کیا کہ جہاں کہیں اس کے اجزا ملیں وہ اُن کو فراہم کریں۔ چنانچہ پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر مختلف مقامات سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں۔ اس کی طباعت و تصحیح میں جن مستشرقین نے پروفیسر ساخو کی رفاقت کی اُن کے نام یہ ہیں:۔

جوزف ہورووٹز (JOSEPH HOROVITZ) جولیس لیپرٹ (JULIUS LIPPERT) کے۔ وی زٹرسٹین (K. V. ZETTERSTEEN) اور بروکلمن (CARL BROCKELMANN)

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۹۴ [3] معجم المطبوعات ج ۱ ص ۱۱۶

حاجی خلیفہ نے الطبقات الکبریٰ کے جس انتخاب کا ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ وہی ہے جس کو ابن الندیم الطبقات الصغریٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں[1]

علامہ ابن الندیم نے ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کا نام "کتاب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم" بتلاتے ہیں[2] لیکن "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کا فاضل مقالہ نگار لکھتا ہے اور غالباً یہ صحیح بھی ہے کہ "حافظ ابن سعد نے اس نام سے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ بلکہ جس کو "کتاب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کہا جاتا ہے وہ در اصل "کتاب الطبقات" کا ہی جزو اول ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا تذکرہ ہے[3]"

وفات اتوار کے دن ۴ جمادی الثانیہ ۲۳۰ھ میں جبکہ آپ کی عمر ۶۲ سال تھی بغداد میں وفات پائی اور باب الشام کے قبرستان میں دفن ہوئے[3]

یحییٰ بن ابی زائدہ

نام ونسب یحییٰ نام، ابوسعید کنیت، والد کا نام زکریا تھا۔ لیکن اپنے دادا ابوزائدہ کی نسبت سے مشہور ہیں۔ محمد بن المبشر الہمدانی کے غلام تھے۔

تعلیم وتربیت حضرت یحییٰ کے والد زکریا بن ابی زائدہ خود بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے اس لیے حضرت یحییٰ کو علم کے ساتھ ایک علمی گھرانہ میں پیدا ہونے کے باعث قدرتی

---

[1] الفہرست ص ۱۴۵ [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ ابن سعد [3] تاریخ بغدادی ج ۵ ص ۳۲۲

مناسبت تھی۔ پھر ان کے والد کو بھی شروع سے ہی اپنے بیٹے کی تعلیم کا بڑا خیال تھا، عیسیٰ بن یونس بیان کرتے ہیں "میں نے زکریا بن ابی زائدہ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے صغیر السن بچہ یحییٰ کو مجالد بن سعید کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتے تھے اور اُن سے کہتے تھے "بیٹے ان حدیثوں کو یاد کرلو۔ مزید براں طرفہ یہ ہوا کہ حضرت یحییٰ کوفہ کے رہنے والے تھے جو اُس زمانہ میں اسلامی علوم وفنون کا گہوارہ تھا۔ آپ نے ان قدرتی مواقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔

علم وفضل | چنانچہ آپ نے حدیث کا سماع اپنے والد ماجد زکریا بن ابی زائدہ کے علاوہ ہشام بن عروہ، اسماعیل بن ابی خالد، سلیمان الاعمش، عبداللہ بن عمر العمری، حجاج بن ارطاۃ، ابن عون، اور عاصم الاحول وغیرہم سے کیا۔ اور اپنے ذوق وشوق اور شیوخ کے فیضِ التفات سے علم وفضل میں وہ مرتبۂ بلند حاصل کیا کہ سرآمد علماء روزگار بن گئے۔ اُن کی فضیلت کی دلیل یہی کیا کم ہے کہ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، یحییٰ بن آدم، قتیبہ بن سعید، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ ایسے جلیل المرتبت ائمہ اسلام اُن کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں[1]۔

علی بن المدینی کی جلالتِ شان سے علم حدیث کا کوئی طالب علم ناواقف نہیں آپ فرماتے ہیں "حضرت ابنِ عباس اپنے زمانہ میں علم کے منتہیٰ تھے۔ اُن کے بعد حضرت شعبی اپنے عہد میں علم کے مرکز قرار پائے۔ پھر حضرت سفیان ثوری کا عہد آیا تو وہ امامِ وقت ہوئے، اسی طرح حضرت یحییٰ بن ابی زائدہ اپنے زمانہ میں علم کے منتہیٰ تھے"[2] ایک مقولہ میں اس پر اور اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ "امام ثوری کے بعد حضرت یحییٰ سے بڑھ کر کوئی شخص معتبر

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۴ [2] تاریخ بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۵۔

فی الحدیث نہیں تھا[1] حضرت یحییٰ بن سعید القطان مشہور امام جرح و تعدیل ہیں لیکن وہ بھی حضرت یحییٰ بن ابی زائدہ کی علمی وجاہت وجلالت سے اس درجہ مرعوب تھے کہ فرمایا کرتے تھے "کوفہ میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی مخالفت میرے لیے یحییٰ بن ابی زائدہ کی مخالفت سے زیادہ صبر آزما اور شدید ہو[2]" حضرت یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا "آپ کو اسمٰعیل بن زکریا زیادہ پسند ہیں یا یحییٰ بن ابی زائدہ؟" فرمایا "یحییٰ بن ابی زائدہ" سائل نے پھر بات بنانے کے لیے دریافت کیا "تو آپ کے نزدیک یہ دونوں بھائی ہیں؟" ارشاد ہوا "نہیں[3]"

حدیث اُن کا خاص فن حدیث تھا جس میں وہ مسلمہ روزگار امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ ابوخالد الاحمر بیان کرتے ہیں "کان یحییٰ جید الاخذ للحدیث" حضرت یحییٰ کو حدیث کے انتخاب میں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ حضرت یحییٰ میں خاص کمال یہ تھا کہ وہ عموماً کتاب دیکھے بغیر اپنے حافظہ سے روایت کرتے تھے[4]۔ لیکن اس کے باوجود کیا مجال تھی کہ کہیں خطا ہو جائے۔ حضرت یحییٰ بن معین نقد وجرح میں نہایت متشدد ہیں لیکن وہ بھی ایک حدیث میں حضرت یحییٰ کی غلطی کا ادعا کر سکے۔ فرماتے ہیں "یحییٰ بن ابی زائدہ نہایت فہیم وعقیل تھے۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ ایک حدیث کے علاوہ انہوں نے کوئی اور خطا کی ہے[5]۔ اسمٰعیل بن حماد کہتے تھے "یحییٰ بن ابی زائدہ حدیث میں ایک خوشبوؤں میں بسی ہوئی دلہن" کی مانند ہیں[6]۔ حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں "عبداللہ بن مبارک اور یحییٰ بن ابی زائدہ دو ایسی شخصیتیں ہیں کہ ہم نے ان کا مثل دیکھا

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۸ [2] کتاب الانساب للسمعانی ص ۲۹۵ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۹ [4] ایضاً ص ۲۰۹ [5] تاریخ بغدادی جلد ۱۴ ص ۱۱۷ [6] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۹

ہی نہیں[1]"

مدارِ اسناد | حضرت یحییٰ اپنے زمانہ میں اسناد کے سب سے بڑے مدار تھے۔ علی بن المدینی بیان کرتے ہیں "اسناد کا دار و مدار پہلے زمانہ میں چھ بزرگوں پر تھا (آپ نے اُن کے اسماءِ گرامی بھی شمار کرائے) پھر ان چھ ارباب علم وفضل کا علم ایسے مختلف اصحاب کی طرف منتقل ہوگیا جنہوں نے علم کی مختلف شاخوں میں کمال پیدا کیا (حضرت علی بن المدینی نے اس موقع پر بھی ان بزرگوں کا نام لیا) پھر ان سب کا علم دو بزرگوں پر اگر منتہی ہوگیا۔ ایک ابو سعید یحییٰ بن سعید جو بنو تمیم کے غلام تھے اور جنہوں نے صفر ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ اور دوسرے بزرگ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہیں۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح یہ دونوں بزرگ نام اور کنیت میں ایک ہیں علم کی جامعیت و مرکزیت میں بھی ایک ہی ہیں[2]"

ثقاہت | ثقاہت و تثبت کے لحاظ سے بھی اُن کا پایہ نہایت بلند تھا۔ تمام ائمہ حدیث ان کی ثقاہت پر متفق ہیں، حضرت یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا "آپ کو ابن مسہر زیادہ محبوب ہیں یا یحییٰ بن ابی زائدہ" بولے "دونوں ثقہ اور قابل وثوق ہیں[3]" امام نسائی اور عجلی انہیں ثقہ بتاتے ہیں۔ ابن نمیر اتقان کے لحاظ سے اُن کو امام شافعی سے بھی فائق مانتے ہیں۔ ابو حاتم فرماتے ہیں "مستقیم الحدیث ثقۃ صدوق[4]" حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "یحییٰ بن ابی زائدہ کا شمار کوفہ کے حفاظ حدیث میں ہوتا ہے، وہ متقن، ثبت، اور صاحب سنت تھے[5]"

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۱ [2] ایضاً ص ۱۱۱ [3] ایضاً ص ۱۱۵ و ۱۱۶ [4] ایضاً ص ۱۱۷ [5] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۸ [6] ایضاً

ابن عماد الحنبلی بھی شذرات الذہب میں یہی لکھتے ہیں[1]۔

حدیث میں تصنیف | حضرت یحییٰ بن ابی زائدہ کو علم حدیث میں ایک نمایاں خصوصیت یہ حاصل ہے کہ یہ کوفہ کے سب سے پہلے امام فن ہیں جس میں انہوں نے تصنیف کی۔ علامہ بغدادی، علامہ سمعانی، اور حافظ ابن حجر تینوں لکھتے ہیں " وھو اول من صنف الکتب بالکوفۃ[2]"

اُن کا اندازِ تصنیف اتنا مقبول ہوا کہ اُن کے بعد بعض اور اماموں نے تصنیف کی طرف توجہ کی تو انہیں ان کے ہی نقشِ قدم پر چلنا پڑا۔ چنانچہ حضرت وکیع نے اپنی کتابوں میں حضرت یحییٰ کی کتابوں کی ہی پیروی کی[3]۔

فقہ | حدیث کی طرح اُن کو فقہ میں بھی کمال حاصل تھا، چنانچہ اُن کا شمار کوفہ کے فقہاء محدثین میں ہوتا تھا[4]۔ ایک مرتبہ حضرت عجلی کے سامنے یحییٰ بن ابی زائدہ کا ذکر آگیا تو انہوں نے فرمایا "حضرت یحییٰ کے والد زکریا بن ابی زائدہ ثقہ تھے۔ اُن کے فرزند یحییٰ بھی ثقہ ہیں اور یہ دونوں باپ بیٹے اُن اکابر امت میں سے ہیں جو حدیث اور فقہ دونوں کے جامع تھے[5]۔ حسن بن ثابت ایک مرتبہ حضرت یحییٰ سے ملاقات کرنے کے بعد واپس لوٹے تو انہوں نے بیان کیا کہ میں کوفہ کے سب سے بڑے فقیہ (یحییٰ بن ابی زائدہ) کے پاس مہمان تھا[6]۔

افتاء | فقہی کمال کے ساتھ وہ صاحب افتاء بھی تھے[7]۔ ابن عماد الحنبلی انہیں امام ابو حنیفہ

[1] ج ۱ ص ۲۹۸ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۹ [3] ایضاً [4] تاریخ بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۶
[5] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۰۸ [6] بغدادی ج ۱۴ ص ۱۱۶ [7] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۸

کے اصحاب میں شمار کرتے ہیں[1]۔

عہدۂ قضاء اور وفات | کمال تفقہ اور تثبت فی العلم کی وجہ سے ان کو وفات سے چار ماہ پیشتر مدائن کی قضا کا عہدہ پیش کیا گیا جس کو انہوں نے منظور کر لیا۔ یہ زمانہ ہارون کی حکومت کا تھا لیکن عمر نے وفا نہیں کی اور اسی عہدۂ قضا پر مامور ہونے کی حالت میں بماہ جمادی الاولیٰ ۱۸۳ھ مدائن میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۳ سال کی تھی[2]۔

قتیبہ بن سعید الثقفی

نام و نسب | بعض کے نزدیک ان کا نام یحییٰ اور بعض کے نزدیک علی تھا، اور قتیبہ لقب لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ قتیبہ نام تھا اور ابو رجار کنیت تھی۔ ان کے دادا جمیل بن طریف مشہور اموی گورنر عراق حجاج بن یوسف الثقفی کے غلام تھے۔ حجاج انتہائی ظالم و جابر اور تند مزاج ہونے کے باوجود جمیل کی بڑی تکریم کرتا تھا، انتہا یہ ہے کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتا تھا تو حضرت قتیبہ کے دادا کو اپنے دائیں جانب ایک الگ کرسی پر بٹھایا کرتا تھا[3]۔ بنو ثقیف کے ساتھ اس علاقۂ غلامی کے باعث حضرت قتیبہ ثقفی کہلاتے ہیں۔

وطن اور ولادت | ان کا وطن بلخ کا ایک گاؤں بغلان تھا لیکن عراق میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ کبھی اپنے وطن جاتے بھی تھے تو مہمان داخل، ایک دو دن رہے اور چلے آئے

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۹۸ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۱۸ [3] ایضاً ج ۱۲ ص ۴۶۸۔

چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں

مَا کَانَ مِثْلِی فِی بَغْلَانَ مَسْکَنُہٗ وَلَا یُسِرُّ بِہَا اِلَّا عَلٰی سَفَرٍ

ترجمہ:- میری طرح بغلان میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کا وطن ہو تو بغلان مگر وہ وہاں جائے مسافر کی طرح۔

خود اپنے بیان کے مطابق اُن کی پیدائش ۱۵۰ھ میں ہوئی تھی لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ ۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

تعلیم و تربیت | حضرت قتیبہ کے والد سعید بن جمیل نہایت نیک تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے دستِ مبارک میں ایک رجسٹر (صحیفہ) ہے۔ سعید نے پوچھا "یا رسول اللہ کیا ہے؟" ارشاد ہوا "اس میں علماء کے نام درج ہیں" انہوں نے عرض کی "حضرت! ذرا یہ رجسٹر مجھ کو مرحمت فرما دیجیے تاکہ میں یہ دیکھ لوں کہ اس میں میرے فرزند کا بھی نام درج ہے یا نہیں" اس درخواست کے بموجب اُن کو رجسٹر دے دیا گیا۔ اُنہوں نے کھول کر دیکھا تو اُس میں ان کے فرزند قتیبہ کا اسمِ گرامی بھی شامل تھا۔ ایک ایسے نیک نیت اور حوصلہ مند باپ کے فرزند ہونے کے باعث اُن کو اسلامی علوم و فنون کے ساتھ قلبی لگاؤ تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اس ذوق شوق میں وطن سے نکل کر عراق، مدینہ، مکہ، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا اور ان مقامات کے ائمہ کبار سے حدیث کے سماع کا شرف حاصل کیا، جن میں سے چند نام یہ ہیں۔ امام مالک بن انس

ا۔ بغدادی ج ۱۲ ص ۴۷۰ ۲۔ ایضاً ص ۴۶۸۔

لیث بن سعد، عبداللہ بن لہیعہ، بکر بن مضر، حماد بن زید، ابو عوانہ، اسماعیل بن جعفر، سفیان بن عیینہ وغیرہم۔ انہوں نے یہ سفر نو عمری میں ہی شروع کر دیا تھا، خود اُن کا بیان ہے کہ میں سب سے پہلے ۱۷۲ھ میں عراق آیا تو میری عمر ۲۳ سال تھی[۱]

علم و فضل | طلبِ علم میں اُن کے شہر بشہر پھرنے اور اکابر امت کے فیضِ التفات سے انہیں علم و فضل کا دریا بنا دیا۔ حافظ ذہبی انہیں "الشیخ الحافظ محدث خراسان" لکھتے ہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں "وہ ثقہ عالم، صاحب حدیث، اور کثرت سے سفر کرنے والے تھے[۲]" ابن عماد الحنبلی فرماتے ہیں "الیہ المنتہیٰ فی الثقۃ" ثقاہت اُن پر ختم ہے[۳]۔

تلامذہ | اُن کی عظمت و بزرگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُن کے حلقۂ تلامذہ میں اُس عہد کے بڑے بڑے ائمۂ حدیث داخل ہیں، مثلاً امام احمد بن حنبل، ابو خیثمہ، زہیر بن حرب، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوداؤد السجستانی، ابراہیم الحربی، ابو حاتم الرازی، ان کے علاوہ امام بخاری نے ان کی روایت کی ہوئی تین سو آٹھ اور امام مسلم نے چھ سو اڑسٹھ احادیث صحیحین میں درج کی ہیں[۴]۔

حضرتِ قتیبہ نے امام احمد بن حنبل اور حضرت یحییٰ بن معین کی روایتوں کے لیے اپنے صحیفہ میں الگ الگ علامتیں مقرر کر رکھی تھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے احمد بن محمد بن زیاد الکرینی سے ایک دفعہ فرمایا "تم کو میری جن روایتوں پر سُرخ نشان ملے

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۷۰ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۰ [۳] شذرات الذہب ج ۲ ص ۹۵ [۴] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۶۱۔

سمجھا کہ میں نے وہ روایتیں امام احمد بن حنبل سے کے سامنے روایت کی ہیں، اور جن ابواب پر سبز نشان ہے وہ یحییٰ بن معین سے روایت کی ہوئی ہیں[1] لیکن ابو العباس السراج کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نشانیاں دو قسم کی نہیں بلکہ سات قسم کی تھیں ان سات میں سے دو تو امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کے لیے ہی مخصوص تھیں۔ باقی پانچ نشانیاں ابو خیثمہ، ابوبکر بن ابی شیبہ، یحییٰ الحمانی، ابو زرعہ، عبید اللہ بن عبد الکریم الرازی اور ابو الحسین مسلم بن الحجاج النیشاپوری کے لیے مخصوص تھیں[2]۔ عبد اللہ بن محمد بن سیار بیان کرتے ہیں "عراق میں کوئی بڑا امام ایسا نہیں ہے جس نے قتیبہ بن سعید سے روایت نہ کی ہو، اور وہ بڑے سچے تھے[3]"

درس حدیث حضرت قتیبہ جہاں کہیں تشریف لے جاتے تھے، علم و فضل کا دفتر کھل جاتا تھا۔ چنانچہ بغداد میں تشریف فرما ہوئے تو امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین ایسے ائمہ روزگار نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کا درس لیا۔ اور جو لوگ اُن سے استفادہ کے موقع کو ضائع کر دیتے تھے وہ موقع نکل جانے پر کفِ افسوس ملتے تھے عمرو بن علی الفلاس بیان کرتے ہیں "میں ایک مرتبہ منیٰ میں حضرت قتیبہ کے پاس سے گذرا تو دیکھا عباس العنبری اُن کے پاس بیٹھے ہوئے حدیث لکھ رہے ہیں، میں اُس وقت گذرا ہوا چلا گیا اور اُن سے احادیث کا سماع نہیں کیا لیکن بعد میں مجھ کو اپنے تساہل پر بڑی ندامت ہوئی[4]"

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۶ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۴۶۸ [4] ایضاً۔

کثرتِ حدیث | جیساکہ اوپر ذکر ہوچکا ہے حضرتِ قتیبہ بن سعید نے حدیث کی جستجو میں اُن تمام ملکوں کا سفر کیا تھا جہاں سے اُنہیں ان جواہر ریزوں کے ملنے کی اُمید ہوسکتی تھی ان پیہم سفروں میں اُنھوں نے احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کرلیا کہ ایک مرتبہ اُنھوں نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا "تم اس موسم سرما میں میرے پاس قیام کرو تو میں تم کو پانچ شخصوں کی روایت کی ہوئی ایک لاکھ حدیثیں سناؤنگا۔ شاگرد نے کہا "غالباً اُن میں سے ایک بزرگ تو عمر بن ہارون ہونگے" فرمایا "نہیں۔ صرف عمر بن ہارون سے تو میں نے تیس ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔ یہ ایک لاکھ احادیث تو وکیع بن الجراح، عبدالوہاب الثقفی، جریر الرازی، محمد بن بکر البرسانی سے منقول ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ قتیبہ بن سعید نے پانچویں بزرگ کا بھی نام لیا تھا لیکن میں اُس کو بھول گیا[۱]"

ایک عجیب واقعہ | حضرت قتیبہ کی علمی زندگی کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ وہ شروع شروع میں قیاسی مسائل کی جستجو میں زیادہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک توشہ دان لٹک رہا ہے، لوگ اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن اُس تک پہنچنے سے عاجز ہیں۔ پھر میں نے اُس کو لینا چاہا تو میں اپنی سعی میں کامیاب ہوگیا۔ اب میں نے اُس میں جھانک کر دیکھا تو مجھے مشرق ومغرب کے درمیان کی کل کائنات نظر آگئی، صبح کے وقت میں ایک بزرگ کی خدمت میں

---

[۱] تاریخ بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۹۔

حاضر ہوا جو خواب کی تعبیر بتانے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے اپنا خواب بیان کیا، اُنھوں نے سُن کر فرمایا "بیٹے! اب تم روایات و آثار کی طلب میں مشغول ہو جاؤ کیونکہ صرف روایات و آثار ہی مشرق و مغرب تک پہنچ سکتی ہیں۔ قیاسی مسائل میں اس درجہ وسعت پیمائی کہاں[1]؟"

تمول | عام اہل علم کے برخلاف حضرتِ قتیبہ بڑے مالدار بھی تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں "وکان غنیاً متمولاً[2]" اُن کے پاس اونٹ، بکریاں، گائیں، اور گھوڑی وغیرہ بڑی کثرت سے تھے[3]۔

حلیہ | اُن کا حلیہ یہ تھا میانہ قد و قامت، سر کے بال آگے سے غائب، پُر رونق چہرہ، خوش وضع ڈاڑھی، اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی بڑے مہمان نواز اور خوش خلق تھے[4]۔

وفات | شعبان ۲۴۰ھ میں اپنے وطن بغلان میں وفات پائی۔ اس وقت اُن کی عمر ۹۱ سال تھی[5]۔

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۷ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۰ [3] تاریخ بغدادی ج ۱۲ ص ۴۶۸
[4] ایضاً [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۱

ابو زرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم

نام و نسب عبید اللہ نام، ابو زرعہ کنیت، والد کا نام عبد الکریم تھا۔ عیاش بن مطرف القرشی کے غلام تھے، اس لیے قرشی کہلاتے ہیں۔ رے کے باشندے تھے اس نسبت سے انہیں رازی کہا جاتا ہے۔ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔

علم و فضل علم و فضل کے لحاظ سے ان کا شمار اپنے عہد کے ائمہ کبار میں ہوتا تھا۔ علامہ خطیب بغدادی فرماتے ہیں "وکان اماماً ربانیاً متقناً حافظاً مکثراً صادقاً"[1]۔ حافظ ذہبی انہیں "الامام حافظ العصر" لکھتے ہیں[2]۔ ابن عماد الحنبلی کا ارشاد ہے "وہ حافظ تھے اور بلند رتبہ امام تھے"[3]۔

علم حدیث ان کا خاص فن علم حدیث تھا، انہوں نے جن محدثین سے سماع کیا ان کی فہرست طویل ہے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں:۔ ابو نعیم، قبیصہ، خلاد بن یحییٰ، مسلم بن ابراہیم قعنبی، محمد بن سابق، ابو الولید الطیالسی، یحییٰ بن بکیر المصری۔ ان بزرگوں کے علاوہ انہوں نے امام احمد بن حنبل کے ساتھ بھی مجالست کی تھی۔ ان سے حدیث پر مذاکرہ رہتا تھا اور ان سے حدیث کی روایت بھی کی ہے[4]۔

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۳۲۶ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴۔

[3] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۴۸ [4] بغدادی ج ۱۰ ص ۳۲۶۔

طلبِ علم میں سفر وہ اپنے شوق و ذوق کی تشنگی بجھانے کے لیے شہر شہر اور ملک ملک پھر کر علوم وفنون کے چشموں سے سیراب ہوتے تھے چنانچہ انھوں نے حرمین شریفین، عراق، شام جزیرہ، خراسان اور مصر کا سفر کیا۔[1]

قوتِ حافظہ اور ذکاوت کسی علم وفن میں کمال پیدا کرنے کے لیے ذکاوت اور قوتِ حافظہ کی مضبوطی شرطِ اولیں کا مرتبہ رکھتی ہے۔ قدرت نے اُن کو یہ دونوں نعمتیں عطا فرمانے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں "ابوزرعہ قوت حافظہ اور ذکاوت کے لحاظ سے زمانہ کے نمایاں ترین افراد میں سے تھے"۔ وہ اپنے حافظہ میں ایسے ضرب المثل تھے کہ لوگ بے خوف وتردد اس کی قسم کھا لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا "میں نے قسم کھا کر یہ کہا ہے کہ اگر ابوزرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو میری بیوی پر طلاق" آپ نے یہ سُن کر فرمایا "تو تم اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو"[2] (یعنی واقعی مجھ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں) بہ ظاہر ایک لاکھ احادیث کا یاد کرنا عادۃً دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ حضرت ابوزرعہ اس سے کیا مراد لیتے تھے، اس کی توضیح روایت ذیل سے ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ابوزرعہ نے کسی شخص سے بیان کیا کہ مجھ کو ایک لاکھ حدیثیں ابوبکر بن ابی شیبہ سے سُنی ہوئی یاد ہیں، اُس شخص نے پوچھا "تو آپ انھیں مجھے املا کرا سکتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "نہیں لیکن اگر میں اُن کو سُنونگا تو پہچان جاؤنگا"۔[3]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۲۔

ابوبکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں "میں نے ابوزرعہ سے بڑا حافظ کوئی نہیں دیکھا"[1] صنعانی کا بیان ہے "(قوتِ حافظہ کے لحاظ سے) حضرت ابوزرعہ ہمارے نزدیک امام احمد بن حنبل سے مشابہ تھے"[2]

اُن کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو سُنتے تھے دماغ میں مرتسم ہوجاتا تھا، خود ان کا بیان ہے "علم کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو میں نے اپنے کانوں سے سُنا ہو اور میرے دل نے اُس کو محفوظ نہ کرلیا ہو۔ میں بغداد کے بازاروں سے گزرتا تھا اور بالاخانوں سے گانے والی عورتوں کے سرود کی آواز آتی تھی تو میں اپنی انگلیوں سے کان بند کرلیتا تھا کہ کہیں میرا قلب اُس گانے کو محفوظ نہ کرلے"[3] ابوبکر الموصلی کا بیان ہے "ہم نے جس کسی شخص کی قوتِ حافظہ کی شہرت سُنی ملاقات کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس کے متعلق جیسی کچھ شہرت تھی وہ خود ایسا نہیں تھا۔ لیکن حضرت ابوزرعہ کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے اُن کو ہم نے دیکھا تو وہ اپنی شہرت سے کہیں زیادہ ثابت ہوئے"[4]

کتابت حدیث اس غیر معمولی قوتِ حفظ کے باوجود وہ محض اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے، بلکہ جو کچھ سُنتے تھے اُسے لکھ لیتے تھے۔ اور پھر ضرورت کے وقت اُس سے کام لیتے تھے اُن کے سامنے اگر کوئی غلط روایت بھی کرتا تو وہ اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے اُس کی تغلیط کی جرأت نہ کرتے۔ بلکہ کتابوں کی مراجعت کرتے تھے۔

احتیاط ایک طرف حافظہ کا یہ عالم کہ پچاس پچاس سال کی لکھی ہوئی حدیثیں اُن کی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ [2] ایضاً [3] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۲ [4] ایضاً

یادداشتوں میں موجود تھیں۔ اور اُن کو اس مدت میں اُنہیں دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔
لیکن اس کے باوجود اُن کو خوب یاد تھا کہ کونسی حدیث کس یادداشت (کتاب) میں کس
صفحہ میں اور کس سطر میں ہے۔ اور پھر احتیاط کا یہ حال کہ کتاب دیکھے بغیر کسی راوی کی تعلیط
نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ محمد بن مسلم اور فضل بن العباس جو صائغ کے لقب سے مشہور ہیں یہ
دونوں اپنے ایک نزاع کا فیصلہ کرانے ابوزرعہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن میں سے
ہر ایک دوسرے کی روایت کو منکر اور اپنی روایت کو صحیح قرار دیتا تھا، محمد بن مسلم نے
حضرت ابوزرعہ سے دریافت کیا" فرمائیے! ہم میں کون خطا پر ہے اور کون صواب پر؟"
آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش بیٹھے رہے۔ محمد بن مسلم نے پھر دوبارہ کہا" حضرت!
آپ کلام کیوں نہیں فرماتے؟ کچھ تو ارشاد ہو!" حضرت ابوزرعہ نے اس دفعہ بھی بات
ٹالنے کے انداز سے تغافل برتا لیکن محمد بن مسلم نے بیحد اصرار کیا اور کہنے لگے" آپ کے سکوت
کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بات بالکل صاف ہونی چاہیے، اگر میں خطا پر ہوں
تو مجھ کو میری خطا بتا دیجیے، اور اگر یہ (فضل بن العباس) خطا پر ہیں تو ان سے فرما دیجیے
کہ تم مخطی ہو" یہ سُن کر آپ نے فرمایا" اچھا میرے بھتیجے ابوالقاسم کو بلاؤ" فوراً حکم کی تعمیل
کی گئی، آپ نے ابوالقاسم سے فرمایا" تم میرے کتب خانہ میں جاؤ اور پہلی دوسری
اور تیسری الماری کو چھوڑ کر چوتھی الماری دیکھو، اُس میں سے سترہواں جزء نکال کر لے آؤ۔"
ارشاد کے مطابق مطلوبہ جزء حاضر خدمت کیا گیا تو آپ نے جھٹ جھٹ اوراق گردانی

ؔ تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۳۲۔

کرکے حدیث متنازع فیہ نکالی اور محمد بن مسلم کے سامنے رکھدی۔ محمد بن مسلم نے اُس کی قرأت کی تو انہیں معلوم ہوا کہ دونوں غلطی پر تھے۔[1]

محفوظاتِ ابوزرعہ کی تعداد غیر معمولی قوتِ حافظہ اور پھر شب و روز کی سرگرم جستجو اور طلب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی محفوظات کی تعداد حیرت انگیز طور پر بہت زیادہ ہے۔ اس معاملہ میں امام احمد بن حنبل سے زیادہ اور کس امام کا اندازہ درست ہوسکتا ہے، وہ فرماتے ہیں "کل صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے بھی کچھ زائد ہی۔ ان میں سے چھ لاکھ حدیثیں اس نوجوان یعنی ابوزرعہ کو یاد ہیں" امام بیہقی فرماتے ہیں "امام احمد کی مراد یہ ہے کہ چھ لاکھ میں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور صحابۂ کرام کے اقوال، اور تابعین کے فتاویٰ یہ سب شامل ہیں"[2]

علماء کا اعتراف اُن کی جلالتِ شان پر تمام علماء کا اتفاق ہے، ابن حبان فرماتے ہیں۔ "وہ ثقہ تھے، حدیث کے علم، تدین، ورع، علمی مذاکرہ، اور علمی مصروفیت وانہماک اور ترک دنیا و مافیہا کے اعتبار سے حضرت ابوزرعہ دنیا کے اماموں میں سے تھے"[3] ابوحاتم کا بیان ہے "حضرت ابوزرعہ کی وفات ہوگئی اور اُنہوں نے علم، فقہ، سچائی اور طہارت و پاکیزگی کے لحاظ سے اپنا کوئی قائم مقام نہیں چھوڑا، ان کی یہ صفات ایسی ہیں کہ ان میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا، اور مجھے نہیں معلوم کہ مشرق ومغرب میں کوئی اُن کا ہمسر ہو"[4] اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے "جو حدیث ابوزرعہ کو محفوظ نہ ہو اُس کی کوئی اصل ہی

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۳۰ و ۳۳۱ [2] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۴۸

نہیں ہے[1] محمد بن یحییٰ فرماتے تھے "جب تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ابوزرعہ ایسے ائمۂ کبار زندہ رکھیگا وہ خیر و برکت کے ساتھ رہینگے"[2]

امام ابوزرعہ اپنی جلالتِ شان کی وجہ سے دور دراز کے طلبۂ علوم کے لیے مرکز کا حکم رکھتے تھے۔ ان کے بعض شاگرد کسی بڑے امام کے پاس استفادہ کے لیے جاتے تھے تو وہ حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے، اور پھر اُن کو حضرت ابوزرعہ کی خدمت میں ہی رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ چنانچہ فضلک الرازی بیان کرتے ہیں "میں مدینہ گیا تو وہاں حضرت ابومصعب کے دولتکدہ پر حاضر ہوا، دروازہ سے ایک شیخ نکلے جن کی داڑھی اور سر کے بالوں پر خضاب لگا ہوا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو؟" میں نے عرض کیا "میں رے سے آرہا ہوں اور ابوزرعہ کا تلمیذ ہوں" یہ سُن کر ابومصعب بولے "اللہ تعالیٰ تمہاری اصلاح کرے۔ کیا تم ابوزرعہ کو چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو؟" پھر فرمایا "میں امام مالک بن انس اور دوسرے شیوخِ وقت سے بھی ملا ہوں لیکن میری آنکھوں نے ابوزرعہ کا مثل نہیں دیکھا"

فضلک الرازی اسی طرح کا ایک اور اپنا واقعہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں مصر میں حضرت ربیع کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ اُن سے سماع حدیث کروں۔ اُنہوں نے پوچھا "کہاں سے آرہے ہو؟" میں نے کہا "رے سے" یہ سُن کر فرمایا "اللہ تمہاری اصلاح کرے، بھلا تم ابوزرعہ کو چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو؟ ابوزرعہ تو اللہ کی ایک

---

[1] تہذیب التہذیب ج، ص ۲۰۳ [2] ایضاً

نشانی ہیں اور اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو آیۃ (نشانی) بناتا ہے تو اُس کی شکل سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی ثانی نہیں ہے" اسی طرح کا ایک مقولہ یونس بن عبدالاعلیٰ کا ہے، اُن کے سامنے ایک مرتبہ حضرت ابو زرعہ کا ذکر آیا تو اُنہوں نے فرمایا" ابو زرعہ اللہ کی ایک آیۃ ہیں اور اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کسی انسان کو اپنی آیۃ بنا کر بھیج دیتا ہے"[1]

عبدالواحد بن غیاث کہتے تھے" ابو زرعہ نے اپنا جیسا کوئی نہیں دیکھا"[2]

درس حدیث حضرت ابو زرعہ کی مقبولیت اور اُن کے باکمال ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ ابھی وہ صرف ستائیس برس کے ہی تھے کہ اُنہوں نے حدیث کا درس شروع کر دیا تھا جس میں بڑے بڑے افاضل روزگار شوق وذوق سے شریک ہوتے تھے۔

ابو حفص عمر بن مقلاص بیان کرتے ہیں" حضرت ابو زرعہ مصر میں ۲۲۹ھ میں تشریف لائے یہاں جب وہ ابن بکیر، عمرو بن خالد اور دوسرے شیوخ سے سماع حدیث کر چکے تو اُن کے پاس اصحاب حدیث جمع ہو گئے۔ ابو زرعہ نے ان سب کو حدیث کی املاء کرائی۔ اس وقت ان کی عمر ستائیس برس تھی" یزید بن عبدالصمد کہتے ہیں" حضرت ابو زرعہ ہمارے شہر میں تشریف لائے تو ان کے اردگرد مستفیدین کا ایک وسیع حلقہ قائم ہو گیا۔ جب آپ یہاں سے تشریف لیجانے لگے تو میں نے کہا۔ حضرت! اب یہاں کے حلقہ کے لئے آپ مجھے اپنا قائم مقام بنا دیجیے"۔ آپ نے اس کو منظور فرما لیا اور مجھ کو اپنا جانشین

---

[1] یہ تینوں واقعات تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۰ ص ۳۳۰ سے ماخوذ ہیں [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵

بنادیا۔[1]

حضرت ابوزرعہ کی وسعتِ علم، ثقاہت، اور شہرت و مرکزیت کا یہ عالم تھا کہ اکابر امت بھی ان کے ہوتے ہوئے کسی اور محدث سے احادیث کا سماع کرنے میں پہلوتہی کرتے تھے۔ حضرت قتیبہ بن سعید مشہور محدث ہیں۔ ایک دفعہ یہ رَے میں تشریف لائے تو لوگوں نے درخواست کی کہ "حدیث کا درس دیجیے"۔ انہوں نے فرمایا "میں تم لوگوں کے سامنے اس وقت احادیث کی روایت کرونگا جبکہ میری مجلسوں میں احمد بن حنبل، یحییٰ ابن معین، علی بن المدینی، اور ابوبکر بن ابی شیبہ شریک ہونگے"۔ ان حضرات کو قتیبہ کے اس قول کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا "(ہمیں قتیبہ کی روایتوں کی کوئی ضرورت نہیں) ہمارے پاس ایک ایسا نوجوان ہے جو ان تمام روایتوں کو نقل کرتا ہے جنہیں قتیبہ نے مختلف مجالس میں روایت کیا ہے"[2]

ہردلعزیزی | ان کمالات نے اُن کو عوام و خواص کے ہر ایک طبقہ میں اتنا محبوب و ہر دلعزیز بنا دیا تھا کہ اگر کوئی شخص ان کی شان میں گستاخانہ کلمہ کہتا تو لوگ اُسے نہایت بُرا سمجھتے تھے۔ ابو حاتم کہتے ہیں "میں رازی سے امام ابوزرعہ کی شان میں تنقیص کے کلمات سنتا تھا۔ تو میں یقین کر لیتا تھا کہ رازی بدعتی ہے"[3] حضرت اسحاق بن راہویہ نے ایک دفعہ انہیں خط لکھا جس میں آپ نے تحریر فرمایا "انی ازداد بک کل یوم سرورا" میں ہر روز آپ کی یاد سے اپنے آپ کو بیش از بیش مسرت پہنچاتا ہوں[4]۔

---

[1] تاریخ بغدادی ج۱۰، ص ۳۲۸ [2] ایضاً ص ۳۳۲ [3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۲ [4] ایضاً

تقویٰ وطہارت | وہ علم وفضل میں جس طرح یگانۂ روزگار تھے، تقویٰ اور طہارت میں بھی اُن کو امتیاز خاص حاصل تھا۔ ایک مرتبہ ابوبکر المقرئی نے حضرت ابوزرعہ کا تذکرہ کیا کسی شخص نے جو اس وقت مجلس میں حاضر تھا دریافت کیا "ابوبکر! کیا ابوزرعہ ان حفاظ حدیث میں سے تھے جن کو آپ نے دیکھا ہے؟" سائل نے یہ کہہ کر اُن حفاظ کا نام بھی لیا، ابوبکر نے جواب دیا "ابوزرعہ تو اُن سب حفاظ سے اعلیٰ تھے۔ کیونکہ وہ حفظ حدیث کے ساتھ تقویٰ اور طہارت کے بھی جامع تھے۔ اور اس لحاظ سے وہ امام احمد بن حنبل کے مشابہ تھے[1]۔"

اس سلسلہ میں ایک یہ عجیب واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک دفعہ حمدون البرذعی حضرت ابوزرعہ کے پاس حدیث لکھنے کے لیے آئے لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں عمدہ عمدہ قیمتی برتن اور فرش فروش دیکھے۔ یہ سب چیزیں دراصل حضرت ابوزرعہ کے بھائی کی ملکیت تھیں لیکن حمدون نے غلطی سے ان کو خود اُنہی کی ملک سمجھا اور اس سے اس درجہ اثر پذیر ہوئے کہ حدیث کا سماع کیے بغیر ہی گھر سے واپس لوٹ آئے اور وطن کی مراجعت کا ارادہ کر لیا۔ رات کو انہیں خواب میں نظر آیا کہ گویا وہ ایک حوض کے کنارے پر بیٹھے ہیں، اور پانی میں کسی انسان کا عکس پڑ رہا ہے۔ اس عکس سے آواز آئی کہ "اے حمدون! تم ابوزرعہ سے کنارہ کشی کرتے ہو؟ کیا تم کو معلوم نہیں کہ امام احمد بن حنبل ابدال میں سے تھے۔ جب اُن کی وفات ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے منصب و مقام پر ابوزرعہ کو فائز کر دیا[2]۔" حافظ ذہبی فرماتے ہیں "ابوزرعہ حفظ، ذکار، دین، اخلاص اور

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۳۳ [2] ایضاً

علم وعمل کے اعتبار سے زمانہ کے یکتا بزرگوں میں سے تھے[1]

عبادت | حضرت ابو زرعہ پر خشیت ربانی کا جو علماء ربانیین کا خاص شعار ہے، بڑا غلبہ تھا۔ اور اس لیے وہ عبادت بھی بہت کرتے تھے۔ اور اس میں اُن کو اس درجہ انہماک ہوتا تھا کہ گردوپیش کی تمام چیزوں سے بے خبر رہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے وطن رے کی ایک مسجد میں بیس سال تک نماز پڑھی تھی۔ اس مسجد کی محراب میں کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی لیکن اُنھوں نے بیس سال تک اس مسجد میں نماز پڑھنے کے باوجود کبھی آنکھ اُٹھا کر اُس عبارت کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ ایک دفعہ علماء حدیث کی ایک جماعت مسجد میں آپ سے ملنے آئی۔ اور اُس نے محراب میں یہ عبارت لکھی دیکھی تو آپ سے سوال کیا "محرابوں میں کچھ لکھنے کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا "ہمارے اسلاف کی ایک جماعت اس کو مکروہ سمجھتی تھی" یہ لوگ بولے "تو پھر آپ کی مسجد میں یہ عبارت کیوں لکھی ہوئی ہے کیا آپ کو اس کی خبر نہیں؟ فرمایا "سبحان اللہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسجد میں اللہ کے حضور میں حاضر ہو اور پھر وہ اپنے سامنے کی چیزوں کو بھی جانے"[2]

مرجعِ خلائق | دن بھر اُن کے پاس مستفسرین اور طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔ چنانچہ اُنھیں اگر کسی کے ساتھ مذاکرہ کرنا ہوتا تھا تو وہ اُسے علی الصباح بلاتے تھے۔ ابن خراش خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ میں اور حضرت ابو زرعہ میں طے ہوا کہ میں علی الصباح اُن کی خدمت میں مذاکرہ کے لیے حاضر ہونگا، اس قرارداد کے مطابق میں بہت سویرے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ [2] صفۃ الصفوہ ج ۴ ص ۷۰۔

بیدار ہو کر اپنے گھر سے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں ابو حاتم کا مکان پڑتا تھا۔ وہ اُس وقت گھر میں تنہا تھے۔ اُنھوں نے مجھ کو بلا لیا، باتیں ہونے لگیں۔ اس میں کچھ دیر ہو گئی، پھر مجھ کو حضرت ابو زرعہ کے ساتھ عہد و پیمان کا خیال آیا تو میں لپکا، لیکن ابو زرعہ کے مکان پر پہنچ کر دیکھا کہ لوگوں کا زبردست ہجوم ہے اور وہ سب اُن پر فرطِ اشتیاق و عقیدت سے گرے پڑ رہے ہیں۔[1]

حضرت ابو زرعہ کی محبوبیت اور فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہوگی کہ ایک مرتبہ حضرت ابو زرعہ امام احمد بن حنبل کے مکان پر قیام پذیر ہوئے تو امام عالی مقام نے اپنے صاحبزادہ عبداللہ سے فرمایا ”بیٹے! میں صرف فرض نماز پر اکتفا کرتا ہوں اور نوافل کے عوض میں نے اس شیخ (ابو زرعہ) کے ساتھ مذاکرہ کو قبول کر لیا ہے“[2] کمالِ محبت کی وجہ سے محدثین اُن کی درازیِ عمر کے لیے غائبانہ دعائیں کرتے تھے۔[3]

حلم و خطا پوشی وہ اپنی ذاتی سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے بے انتہا حلیم اور بردبار تھے۔ انہیں اگر کسی شخص کا کوئی عیب معلوم ہوتا تھا تو در پردہ اُس کی اصلاح کی کوشش کرتے اور لوگوں میں اُس کو بدنام کرنے سے اجتناب فرماتے تھے، خود اُنھوں نے ایک مرتبہ بیان فرمایا۔ ”میں نے بعض مشائخ سے کچھ حدیثیں سُنی تھیں اور اُن کو ایک کتاب میں لکھ لیا تھا۔ چند روز کے بعد اصحاب حدیث میں سے ایک شخص نے مجھ سے اُس کتاب کو طلب کیا، میں نے وہ اُسے دے دی۔ چھ ماہ کے بعد اُس نے کتاب مجھ کو واپس کر دی لیکن میں نے اب

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۳۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۳۲

اُس کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو یہ دریافت کر کے بیحد افسوس ہوا کہ اس شخص نے کتاب میں سات جگہ تغیر و تبدل کر دیا تھا۔ میں اس کتاب کو لے کر اُس شخص کے مکان پر آیا اور اُس سے کہا کیا ایسا تغیر و تبدل کرتے ہوئے تجھ کو خدا کا خوف نہیں آیا؟ اس کے بعد میں نے اس کو وہ ساتوں مقامات دکھائے جہاں اُس نے شدید تغیرات کیے تھے۔ اور اس سلسلہ میں بتایا کہ دیکھو یہ روایت ابوضمرہ سے مشہور ہے، لیکن تم نے اس کو ابن ابی فدیک کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اسی طرح اس روایت میں فلاں راوی تھا، اور تم نے اُس کی جگہ فلاں کا نام درج کر دیا ہے، کذا و کذا۔ وہ تو خیر یہ ہوئی کہ میں نے اپنے شیوخ سے یہ روایتیں جس طرح سُنی تھیں مجھ کو یاد تھیں، ورنہ میں سخت التباس میں مبتلا ہو جاتا۔ پس اے شخص تو توبہ کر اور خدا سے ڈر" اس واقعہ کو سُن کر آپ کے بعض تلامذہ نے بیحد اصرار کیا کہ اُس شخص کا نام بتا دیجیے لیکن آپ نے نام لینے سے انکار کر دیا۔[1]

وفات | اُن کی وفات بھی ایسے اچھے طریقہ پر ہوئی کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے۔ ابو جعفر التستری بیان کرتے ہیں "حضرت ابو زرعہ رے کے قریب ایک مقام ماشہران میں فروکش تھے کہ وہاں مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ ہم چند آدمی جن میں ابو حاتم۔ محمد بن مسلم منذر بن شاداں اور چند اور علماءِ عہد شامل تھے اُن کے مکان پر عیادت کے لیے حاضر ہوئے۔ مکان پر پہنچ کر دیکھا تو حضرت ابو زرعہ پر عالم نزع طاری تھا۔ ہم سب اُن قریب بیٹھ گئے، اور ہم نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان" تم اپنے

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۳۳۱۔

مرنے والوں کو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی تلقین کرو" کے مطابق اس وقت حضرت ابوزرعہ کو کلمۂ شہادت کی تلقین کرنی چاہیے۔ ہم آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے لیکن "مرنے والے" کی جلالتِ شان و عظمتِ مرتبت کے باعث تلقین کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ آخرکار تدبیر یہ سوچی کہ اسی حدیث کا مذاکرہ کریں۔ اس طرح خودبخود انہیں تلقین ہو جائیگی۔ چنانچہ ان علماء نے حدیث کی اسناد پڑھنی شروع کی لیکن کوئی اسے تمام نہ کرسکا، کوئی کسی راوی تک پہنچ کر رہ گیا اور کسی نے کسی راوی کے نام پر ہی اسناد کو ختم کر دیا۔ اس پر حضرت ابوزرعہ نے اسی عالم نزع میں پوری اسناد پڑھ کر سنائی اور اس کے بعد حدیث پڑھی عن معاذ بن جبلٍ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان اٰخر کلامہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ" سبحان اللہ! آپ نے اس حدیث کو ختم ہی کیا تھا کہ آخری ہچکی آئی اور مرغ روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر مقام علیین کی طرف پرواز کر گیا۔ یہ واقعۂ وفات ۲۹ ذی الحجہ ۲۶۴ھ کو پیش آیا۔ دوسرے دن تدفین کی گئی۔ وفات کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا تو نہایت عمدہ حالت میں نظر آئے حفص بن عبداللہ نے دیکھا کہ آسمان پر فرشتوں کو نماز پڑھا رہے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً[1]

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۰ ص ۲۳۵، ۲۳۶۔

شعبہ بن الحجاج بن الورد[1]

نام ونسب شعبہ نام، ابو بسطام کنیت، والد کا نام حجاج تھا قبیلۂ ازد کے ایک شخص جهضم بن العتیک کے غلام تھے[2]۔ اسی نسبت سے ازدی اور عتکی کہلاتے ہیں۔

وطن اور سکونت اصل وطن شہر واسط تھا۔ یہیں ۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ پھر بصرہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے دو بھائی تھے ایک کا نام بشار اور دوسرے کا نام حماد تھا۔ یہ صرافہ کا کام کرتے تھے، اور حضرت شعبہ کے تمام اخراجات انہی کے ذمہ تھے۔

طلبِ حدیث حضرت شعبہ کو شروع سے ہی شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں "میں (مشہور عربی شاعر) طرماح کے پاس بیٹھا رہتا، اور اس سے شعر و شاعری سے متعلق سوالات کرتا رہتا تھا۔ ایک روز میرا گذر حکم بن عتیبہ کے پاس سے ہوا، وہ حدثنا کہہ کر ایک اسناد بیان کر رہے تھے۔ اسے سن کر میں نے دل میں کہا یہ اس چیز سے بدرجہا بہتر ہے جس کو میں طلب کرتا ہوں یعنی شعر و شاعری۔ میرا یہ خیال پختہ ہو گیا اور اس روز سے میں نے شعر ترک کر کے حدیث کی طلب شروع کر دی[3]"۔

---

[1] ترتیب کے لحاظ سے حضرت شعبہ کا ذکر اب سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مصنف کو اپنی کوتاہ خیالی کی وجہ سے حضرت شعبہ کا تذکرہ لکھنے کا خیال اس وقت آیا جبکہ اس سے پہلے تک کے تمام اجزا طباعت کے مرحلہ سے بھی گذر چکے تھے۔ مصنف کو اس بے ترتیبی پر شدید ندامت ہے۔ تاہم عدم ذکر سے ذکر بہتر ہے۔ اگرچہ بے ترتیبی کے ساتھ ہی سہی۔ [2] علامہ نووی انہیں عبدۃ بن الاعز کا غلام بتلاتے ہیں جو خود یزید بن المہلب کا غلام تھا۔ [3] تاریخ بغدادی

علم وفضل | اس زمانہ میں کبارِ تابعین حیات تھے۔ حضرت شعبہ کو اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر سماع حدیث کا موقع ملا۔ حصول علم کی استعداد فطری اور وہبی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم حدیث واسماء الرجال کے آسمان پر مہر جہاں تاب بن کر نمودار ہوئے۔ حافظ ذہبی انہیں "الحجۃ الحافظ شیخ الاسلام" لکھتے ہیں۔ علامہ نووی فرماتے ہیں "وہ اتباع تابعین اور بزرگ ترین محدثین اور عظیم المرتبت محققین میں سے تھے"۔ ان کی امامت فی الحدیث، جلالتِ شان احتیاط، اور اتقان پر سب کا اتفاق ہے[1]۔

حدیث | حضرت شعبہ نے جن شیوخ حدیث سے سماع کیا اُن میں سے چند بزرگوں کے نام یہ ہیں۔ قتادہ، یونس بن عبید، ایوب، خالد الحذاء، عبد الملک بن عمیر، ابو اسحاق السبیعی، طلحہ بن مُصرِّف، عمرو بن مرۃ، منصور بن المعتمر، سلمۃ بن کُہیل، اسماعیل بن ابی خالد، سلیمان الاعمش، حبیب بن ابی ثابت، حکم بن عتیبۃ، عمرو بن دینار، سعد بن ابراہیم رحمہم اللہ، ان کے علاوہ حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین کو ان کا دیکھنا ثابت ہے حاکم کا بیان ہے کہ حضرت شعبہ نے حضرت انس بن مالک اور عمرو بن سلمہ کو بھی دیکھا تھا۔ اور اُنہوں نے چار سو تابعین سے سماع حدیث کیا، پھر خود ان سے روایت کرنے والوں میں بھی متعدد تابعین شامل ہیں۔ مثلاً سعد بن ابراہیم، منصور بن المعتمر، اعمش، ایوب، اور داؤد بن ابی ہند[2]۔

تلامذہ | خود حضرت شعبہ سے جن حضرات نے استفادہ کیا، اُن کی فہرست طویل ہے اور

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۴۵ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۲

اُس میں بڑے بڑے اکابرِ اُمت شامل ہیں۔ مثلاً ایوب السختیانی، الاعمش، محمد بن اسحاق، ابراہیم بن سعد، سفیان الثوری، شریک بن عبداللہ، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، اسماعیل بن عُلیّۃ، وکیع، ابوداؤد الطیالسی رحمہم اللہ

علماء کا اعتراف | حضرت شعبہ کے تبحّر اور امامت فی الحدیث پر سب کا اتفاق ہے حضرت سفیان ثوری انہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کہتے تھے۔ عراق میں حدیث کا چرچا انہی کے دم سے ہوا۔ امام شافعی فرماتے ہیں "اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا جاننے والا کوئی نہ ہوتا[1]" ابوالولید الطیالسی بیان کرتے ہیں "میں حضرت حماد بن سلمۃ کے پاس آتا جاتا تھا، وہ فرماتے تھے کہ "اگر تم حدیث کا علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو حضرت شعبہ کے پاس جاؤ[2]" یزید بن زریع کہتے ہیں "شعبہ حدیث کے باب میں سب لوگوں سے زیادہ سچے تھے[3]"

حفظ | وہ حدیثوں کی کتابت کم کرتے تھے، زیادہ تر انہیں محفوظ رکھتے اور اپنے حفظ سے روایت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ علی بن المدینی نے حضرت یحییٰ القطان سے دریافت کیا۔ "آپ کے نزدیک طویل حدیثوں کو سب سے زیادہ یاد رکھنے والا کون ہے، سفیان یا شعبہ؟" انھوں نے جواب دیا "شعبہ تو اس معاملہ میں بہت بڑھے ہوئے ہیں[4]"

علم حدیث میں سب سے زیادہ دشوار مرحلہ رجال و رُواۃ کا ہے حضرت شعبہ کو اس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۲ [2] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۴۵

[3] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۰ [4] ایضاً ص ۲۶۴۔

میں خاص کمال حاصل تھا۔ چنانچہ حضرت یحییٰ اپنے ایک بیان میں سفیان اور شعبہ دونوں کا فرق و امتیاز یہ بتاتے ہیں کہ سفیان ابواب کے بڑے عالم تھے اور شعبہ رجال کی معرفت میں یکتا تھے۔ خود تو خود انہیں رجال کے معاملہ میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی شخص کی نسبت انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ حدیث کا اہل نہ ہونے کے باوجود روایت کرتا ہے تو وہ اس سے جاکر فرماتے تھے "تم حدیثیں بیان مت کرو، ورنہ میں بادشاہ سے تمہاری شکایت کروں گا"[1] امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "شعبہ کے زمانہ میں کوئی شخص ان سے بڑھ کر اور ان سے زیادہ اچھا عالم بالحدیث نہیں تھا"[2]

جامعیت علم حدیث میں مہارت پیدا کرنے کے جو شرائط ہیں، حضرت شعبہ ان سب پر حاوی تھے۔ امام احمد بن حنبل ایک دوسرے مقولہ میں فرماتے ہیں "شعبہ اس معاملہ میں ایک پوری قوم کے برابر تھے یعنی رجال کی معرفت میں، حدیث کی بصیرت میں، تثبت اور اتقان میں اور راویوں کی تنقیح و تحقیق میں"[3]

جلالتِ شان ان کے اس غیر معمولی تبحر اور کمال کی وجہ سے اس عہد کے تمام علماء اعیان ان کا نام بڑی عزت و احترام سے لیتے تھے، اور دوسروں کو ان کے احترام کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ حماد بن زید بیان کرتے ہیں "ہم سے حضرت ایوب نے فرمایا۔ تم لوگوں کے پاس واسطہ سے ایک شخص آئیگا جو حدیث کا شہسوار ہے۔ تم اس سے حدیثیں قبول کرو"۔ ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری سے مسلم بن قتیبہ ملے تو انہوں

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۴۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۳ [3] ایضاً ص ۳۴۴

نے مسلم سے پوچھا "کہیے! ہمارے اُستاذ حضرت شعبہ کا کیا حال ہے"[1] اُنکی مہارت وامارت فی الحدیث کی وجہ سے محدثین اُن کی مخالفت سے ڈرتے تھے، حماد بن زید بیان کرتے ہیں "جو شخص چاہے میری مخالفت کرے۔ مجھ کو اس کی پروا نہیں ہے۔ بشرطیکہ شعبہ میرے موافق ہوں، لیکن اگر شعبہ ہی کسی چیز میں میرے مخالف ہو جائیں تو پھر میں اُس کو ترک کر دونگا۔"[2]

ابو بکر بن منجویہ کہتے ہیں "حضرت شعبہ حفظ، اتقان، ورع، اور فضل میں اپنے عہد کے سرداروں میں سے تھے۔ اور یہ عراق کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے محدثین کے معاملہ کی تحقیق کی۔ ضعیف راویوں کو ترک کیا۔ اور وہ قابل اقتدا سردار بن گئے بعد میں اہل عراق انہی کے نقش قدم پر چلے، حافظ ابن حجر اس کلام کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ابن منجویہ نے یہ جو کچھ کہا ہے بعینہ یہی ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے ابن منجویہ نے یہ الفاظ وہیں سے اڑائے ہیں لیکن انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا

احتیاط | حضرت شعبہ کو کثرتِ مزاولت اور فطری استعداد وصلاحیت کی وجہ سے حدیث کے باب میں ایک ایسا ملکہ حاصل ہو گیا تھا کہ جن روایتوں کو اُنہوں نے نہیں سُنا تھا وہ اُن کے بھی عالم سمجھے جاتے تھے۔ علی بن مدینی بیان کرتے ہیں "قتادہ کے شاگرد تین ہیں۔ سعید، ہشام، اور شعبہ۔ سعید تو ان سب سے زیادہ متقن تھے، ہشام کا علم کثیر تھا رہے شعبہ تو وہ سُنی اور بغیر سُنی دونوں قسم کی حدیثوں کے علم میں ان سب سے بڑھے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۴ [2] ایضاً

ہوئے تھے[1] لیکن اس فطری ملکہ کے باوصف اُن کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ ایک روایت کو کئی کئی بار سنتے تھے۔ ایک محدث کا بیان ہے۔ "حضرت شعبہ جب تک ایک روایت کو دو مرتبہ نہیں سُن لیتے تھے وہ اُس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے، اور ایسا کرنا اُن کے ضبط اور اتقان کی دلیل ہے[2]"۔

پھر خواہ کوئی حدیث کیسی ہی جید ہو لیکن اگر اُس میں بھی کوئی شک پیدا ہو جاتا تھا تو وہ اُسے ترک کر دیتے تھے[3]۔ "سمعت" (میں نے سُنا) اُس وقت تک نہیں کہتے تھے۔ جب تک اُن کو واقعی طور پر سماع حاصل نہ ہو[4]۔

حضرت سفیان ثوری اُن کے اس ورع واتقاء کی داد اس طرح دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں "میں نے شعبہ سے زیادہ حدیث میں تقویٰ اور ورع اختیار کرنے والا کوئی نہیں دیکھا[5]۔" ابو نوح کہتے ہیں "میں عبداللہ بن عثمان کے پاس آکر جو حضرت شعبہ کے شاگرد تھے، اور اُن کی حدیثیں لکھتے تھے۔ حضرت شعبہ کی احادیث کا مطالعہ کرتا تھا اور اُن کو لکھ لیتا تھا، اس کے بعد میں حضرت شعبہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ مجھ سے انہی روایتوں کو بیان کرتے لیکن املا کی ہوئی روایتوں میں اور اُن میں ادنیٰ سا فرق بھی نہیں ہوتا تھا[6]۔"

حماد بن زید جلیل القدر محدث ہیں، وہ فرماتے ہیں "شعبہ اگر کسی روایت میں میرے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۵۵ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۴
[5] بغدادی ج ۹ ص ۲۶۵ [6] بغدادی ج ۹ ص ۲۶۵۔

مخالف ہو جاتے ہیں تو میں اُن کا اتباع کر لیتا ہوں، کیونکہ وہ ایک حدیث کو بیس بیس مرتبہ سُن کر بھی بس نہیں کرتے۔ اور میں تو صرف ایک مرتبہ سُن لینے پر ہی قناعت کر لیتا ہوں"۔ ابوزید الہروی بیان کرتے ہیں "میں نے خود حضرت شعبہ سے سُنا ہے۔ ایک مرتبہ فرما رہے تھے "میں آسمان سے گر پڑوں، یہ مجھ کو زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں روایت میں کسی قسم کی تدلیس کروں"۔

محدثین کی نسبت رائے | وہ محدثین و رُواۃ کی نسبت جو رائے ظاہر کرتے تھے اُس کے لیے نہایت بلیغ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ابن عون کی نسبت اُن سے دریافت کیا تو فرمایا "وہ تو گھی اور شہد ہیں" پھر اس شخص نے ابوبکر الہذلی کے بارہ میں اُن کی رائے معلوم کی تو آپ نے فرمایا "رہنے بھی دو! کہیں مجھ کو قے نہ ہو جائے"

حدیث میں غیر معمولی احتیاط اور رواۃ کی تحقیق و تنقیح کے باب میں اُن کی اس بلیغ جدوجہد کا ثمرہ یہ ہوا کہ احادیث صحیحہ و غیر صحیحہ میں بیّن امتیاز ہو گیا اور جو روایتیں بالکل غلط طریقہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہو چکی تھیں اُن کے قابلِ اعتبار ہونے کا پردہ چاک ہو گیا۔ چنانچہ حضرت وکیع فرماتے ہیں "میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جنت میں حضرت شعبہ کے مراتب و درجات بلند کریگا۔ کیونکہ اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدافعت کی ہے"

حضرتِ شعبہ کے لیے دلیلِ افتخار اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ صالح بن محمد کے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۳۔ [۲] ایضاً [۳] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۲۶۳

بیان کے مطابق رجال میں جس شخص نے سب سے پہلے کلام کیا ہو وہ شعبہ ہیں پھر انکی پیروی یحییٰ القطان نے کی ان کے بعد امام احمد بن حنبل اور حضرت یحییٰ بن معین ان کے نقش قدم پر چلے۔[1]

عربیت | وہ جس طرح علم حدیث میں امامت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ انھیں عربیت میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ خود ان کا مقولہ ہو" تم عربیت سیکھو کہ اس سے عقل میں زیادتی ہوتی ہے"[2]

علم شعر | عربیت میں کمال پیدا کرنے کے لئے عربی شعر و شاعری سے پورے طور پر واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت شعبہ کو بھی عربی کے اشعار کثرت سے یاد تھے اور وہ اس کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اصمعی عربی لغت کا مشہور امام ہے۔ خود اُس کا بیان ہے۔ ایک مرتبہ ابو عمرو بن العلاء نے مجھ کو یہ شعر سنایا۔

فما جنبوا انا نشد علیھم ولکن رأوا نارا تحس وتلفع

میں نے یہ شعر حضرت شعبہ کو سنایا تو فرمانے لگے" افسوس! شعر اس طرح نہیں ہو بلکہ یہ ہے

فما جنبوا انا نشد علیھم ولکن رأوا نارا تحش وتلفع

اصمعی اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد کہتا ہے" شعبہ نے بالکل صحیح فرمایا، اور ابو عمرو بن العلاء نے خطا کی" پھر اصمعی کا بیان ہے" میں نے شعر کا عالم حضرت شعبہ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں دیکھا"[3]

---

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۴۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۶

[3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ صفحہ ۲۵۸

ابوزید الہروی کہتے ہیں "حضرت شعبہ عربیت میں اور شعر میں امامت کا درجہ رکھتے تھے"[1]

عبادت | ان علمی خوبیوں کے ساتھ اُن میں عملی کمالات بھی کم نہیں تھے۔ وہ بیحد عبادت گزار اور تقویٰ وطہارت کی زندگی بسر کرنے والے تھے۔ عبادت کرتے کرتے اُن کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا۔ اور ہڈیاں نکل آئی تھیں اور رنگ سیاہ پڑ گیا تھا[2]۔ وہ رکوع وسجود میں اتنی طوالت کرتے تھے کہ اُن پر بھول جانے کا شبہ ہوتا تھا[3]۔ ابوبکر البکراوی بیان کرتے ہیں "میں نے حضرت شعبہ سے بڑا کوئی عبادت گزار نہیں دیکھا"[4]

تقویٰ | اُن کے تقویٰ وطہارت کا یہ عالم تھا کہ حضرت یحییٰ بن معین ان کو امام المتقین فرماتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کا بیان ہے "میں نے بنی تصلّب میں کوئی شخص شعبہ سے افضل وبرتر نہیں پایا"[5]

رحم وکرم | ان کا دل نہایت رقیق تھا۔ ایک معمولی سے ستم زدہ انسان کی داستانِ مصیبت سُنکر تڑپ اُٹھتے تھے۔ اگرچہ زندگی تمول اور رفاہیت سے بسر نہیں کرتے تھے۔ تاہم کوئی سائل ان کے بابِ کرم سے محروم نہ لوٹتا تھا۔ نضر بن شمیل بیان کرتے ہیں۔ میں نے حضرت شعبہ سے بڑھ کر مسکینوں پر رحم کھانے والا کوئی نہیں دیکھا۔ اُن کے سامنے کوئی مسکین آتا تو وہ ازراہِ بے التفاتی اس کی طرف سے اپنا رُخ پھیرتے نہیں تھے۔ بلکہ جبتک

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۷ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۲

[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۲ [4] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۲۴۵

[5] خطیب بغدادی ج ۹ ص ۲۶۳-۲۶۲

وہ نظروں سے غائب ہوتا۔ اپنی نگاہوں سے برابر اس کا تعاقب کرتے رہتے تھے[۱] ان کی یہ عادت تھی کہ اثنار درس میں اگر کوئی سائل آجاتا تو وہ اُس کے سوال کو پورا کرنے کے لئے درس بند کردیتے تھے۔ ان کے تلامذہ کو یہ عادت معلوم تھی۔ اس لئے درس میں خلل پیدا ہونے کے ڈر سے وہ اس کا اہتمام کرتے تھے کہ سائل کے آتے ہی اُس کا سوال پورا کردیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک گداگر آیا۔ حضرت شعبہ درس دے رہے تھے سائل آکر ذرا کھڑا ہوا ہی تھا کہ پھر بیٹھ گیا۔ آپ نے پوچھا "کیا حال ہے؟" شاگردوں نے کہا "عبدالرحمٰن بن مہدی نے اس کو ایک درہم دینے کا ذمہ لے لیا ہے"[۲]

حضرت شعبہ کے پڑوس میں ایک غریب بڈھا رہتا تھا ایک دن وہ آیا۔ اور کسی چیز کا سوال کیا۔ حضرت شعبہ نے فرمایا "تم نے مجھ سے کیوں سوال کیا ہے؟ کیا میرے پاس کوئی چیز موجود ہے؟" بڈھا یہ سنکر جانے لگا تو آپ نے اُس سے فرمایا "تو! تم میرا یہ گدھا لے جاؤ۔ یہ اب تمہارا ہے" بڈھا بولا "مجھ کو اس گدھے کی ضرورت نہیں" آپ نے فرمایا تم اسے لے جاؤ۔ اسی سے اپنا کام نکالو" اتفاق ایسا ہوا کہ بڈھا اس گدھے کو لئے ہوئے حضرت شعبہ کے تلامذہ کی ایک جماعت کے پاس سے گذرا یہ لوگ معاملہ کی نوعیت کو سمجھ گئے۔ انھوں نے فوراً اس گدھے کو بڈھے سے پانچ درہم میں خرید کر لیا۔ اور پھر اُسے بطور تحفہ حضرت شعبہ کی خدمت میں پیش کردیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت شعبہ اپنے گدھے پر کہیں تشریف لیجا رہے تھے

---

[۱] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۰   [۲] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۱

راہ میں سلیمان بن المغیرہ مل گئے۔ اور شعبہ سے فقر و فاقہ کی شکایت کرنے لگے۔ حضرت شعبہ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم! اس وقت اس گدھے کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چیز نہیں ہے" یہ کہہ کر آپ گدھے سے اترے اور اسے سلیمان بن المغیرہ کے حوالہ کر دیا۔[1] انہیں فقراء کی صحبت طبعاً نہایت مرغوب تھی۔ وہ بسا اوقات فرماتے تھے۔ "اگر یہ فقراء نہ ہوتے تو میں تمہاری صحبت میں نہ بیٹھتا"[2] مسلم بن ابراہیم نے حضرت شعبہ کی اس صفت کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں۔ "حضرت شعبہ فقیروں کے ماں باپ تھے"[3] حضرت یحییٰ بن سعید کا بیان ہے۔ "میں نے حضرت شعبہ سے زیادہ کسی کو غریبوں اور مسکینوں سے محبت کرنے والا نہیں دیکھا وہ خود فرماتے تھے۔ "اگر میرے گھر میں آٹا اور ایک بانس ہو تب بھی میں اسے مسکینوں کو دینے میں پس و پیش نہیں کروں گا"[4]

لباس میں سادگی اس قدر سیر چشم اور کشادہ دست ہونے کے باوجود اپنے ذاتی اخراجات میں وہ بیحد سادگی پسند کرتے تھے۔ سلیمان بن حرب بیان کرتے ہیں۔ "حضرت شعبہ جو کپڑے پہنتے تھے۔ ان کا تہ بند چادر اور کرتہ سب ملا کر بھی دس درہم کی قیمت کے نہیں ہوتے تھے"[5] وہ صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی لباس کی سادگی کو پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ابو نوح کے بدن پر ایک قیمتی کرتہ دیکھا تو پوچھا۔ "تم نے یہ کرتہ کتنے میں بنوایا ہے۔ ابو نوح نے کہا آٹھ درہم میں۔ حضرت شعبہ بولے۔ "تیرے لئے ہلاکت ہو کیا تو خدا سے

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۱ [2] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۱ [3] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۱
[4] ایضاً [5] ایضاً

نہیں ڈرتا۔ تونے ایسا کیوں نہیں کیا کہ چار درہم میں کرتہ بنا تا اور باقی چار درہم کا صدقہ کردیتا۔ابو نوح نے جواب دیا۔ میں ایک ایسی جماعت کے ساتھ رہتا ہوں جس کے ہاں شان و شوکت سے رہنا پڑتا ہے۔ آپ نے فرمایا، آخر یہ زیب و زینت کس لئے ہے[1]" ۔ حضرت شعبہ کی وفات کے بعد اُن کا اثاثہ بیت جس میں ایک گدھا۔ اُس کی لگام، زین اُن کے بدن کے کپڑے موزہ۔ اور جوتہ کُل یہ چیزیں تھیں، فروخت کی گئیں تو اُن کی مجموعی قیمت سولہ درہم ہوئی[2] ۔

دنیوی ساز و سامان سے نفرت حضرت شعبہ کو دنیوی جاہ و جلال اور مال و متاع سے دلی بے رغبتی تھی۔ اُن کے نزدیک علم کا ذائقہ دنیا کی تمام لذتوں سے بے پرواہ کردینے کے لئے کافی تھا۔ اُن کا قول تھا جو شخص حدیث طلب کرتا ہے وہ مفلس ہوجاتا ہے۔ میں نے اپنی ماں کا ایک طشت سات دینار میں فروخت کیا تھا[3]۔ خلیفہ مہدی کو اُن کی ذات سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے تیس ہزار درہم حضرت شعبہ کو نذر کئے۔ لیکن آپ نے اُن سب کو تقسیم کردیا۔ اسی طرح بصرہ میں ایک ہزار جریب زمین آپ کو دی تو آپ نے اُس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس جائداد سے دست بردار ہوگئے[4]۔

خلفاء میں ان کی عزت و احترام حضرت شعبہ اپنے ان علمی و عملی کمالات کی وجہ سے دربارِ خلافت میں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کسی شخص کے حق میں انکی سفارش بے چون و چرا منظور کرلی جاتی۔ ایک مرتبہ آپ کے بھائی کسی معاملہ میں گرفتار ہوکر قید خانہ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۴-۳۴۵
[2] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۶۲
[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۳
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۴

میں بند کر دیئے گئے۔ حضرت شعبہ کو اس کی خبر ہوئی تو بھائی کی سفارش کے لئے بغداد تشریف لائے۔ اور یہاں خلیفہ مہدی کے پاس جا کر یہ اشعار پڑھے:۔

اذکر حاجتی ام قد کفانی — حیاءک ان شیمتک الحیاء

کریم لا یعطلہ صباح — عن الخلق الکریم ولا مساء

فارضک ارض مکرمۃ بنتھا — بنو تیم وانت لھم سماء

ترجمہ:۔ میں اپنی حاجت بیان کروں۔ یا آپ کی حیاء ہی کافی ہے۔ بے شبہ حیاء آپکی عادت خاص ہے۔ آپ ایسے کریم ہیں جس کو نہ تو صبح اور نہ شام کریمانہ اخلاق سے باز نہیں رکھ سکتے۔ آپ کی زمین بزرگی کی زمین ہے جس کو بنو تیم نے بنایا ہے اور آپ ان کے لئے آسمان ہیں۔

خلیفہ نے یہ اشعار سن کر کہا: "نہیں! اے ابوبسطام، آپ اپنی اس حاجت کا ذکر نہ کیجئے ہم اسے پہچان گئے ہیں اور وہ ہم نے پوری بھی کر دی ہے" یہ کہہ کر خلیفہ نے حضرت شعبہ کے بھائی کو رہا کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔[۱]

مکمل تصویر ابوزید الہروی نے حضرت شعبہ کی مکمل تصویر اس طرح کھینچی ہے جس میں ان کے چہرۂ فضل و کمال کا ایک ایک خط و خال نمایاں نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں: "میں نے حضرت شعبہ کو دیکھا ہے وہ نماز پڑھتے تھے تو اس میں اتنی طوالت کر دیتے تھے کہ ان کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ وہ علم، زہد، قناعت، رحم دلی اور خیر کی صفات سے متصف تھے ــــ عربیت

---

[۱] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۲۵۶

اور شعر میں سردار کا حکم رکھتے تھے" امام نسائی نے اُن کی شان میں ایک اور عظیم الشان جملہ کہا ہے، فرماتے ہیں "اللہ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے امین تین بزرگ ہیں۔ شعبۃ بن الحجاج، یحیٰی بن سعید القطان، اور امام مالک بن انس[1]

مقولے | ان کے مقولے نہایت حکیمانہ اور پُر اثر و نصیحت ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "لوگ بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی عقل اُن کے ساتھ رہتی ہے۔ اور بعضوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اُن کی عقل گھر کے صحن میں رہتی ہے۔ ان کے علاوہ بعض بد نصیب ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے پاس عقل ہی نہیں ہوتی۔ ان میں پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو بات کرتے ہیں تو بولنے سے پہلے غور کر لیتے ہیں کہ انھیں کیا کہنا چاہئے"[2] آپ علم حدیث کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کس درجہ مشکل سمجھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "اے کاش! میں حمام گرم کرنے والا ہوتا اور حدیث کی معرفت مجھ کو حاصل نہ ہوتی۔ ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا "مجھ کو دخولِ نار سے ڈرانے والی کوئی چیز حدیث سے بڑھ کر نہیں"[3]

وفات | ۷۷ برس کی عمر میں سنہ ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت سفیان کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا "آج حدیث کا علم مردہ ہو گیا"[4]

---

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۷
[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۳
[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۵
[4] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱ ص ۱۸۵



اسماعیل بن علیۃ الہروی

نام ونسب | اسماعیل نام ابوبشر کنیت، والد ماجد کا نام ابراہیم تھا، مگر یہ بجائے باپ کے ماں کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ابراہیم بن مقسم عبدالرحمٰن بن قطبۃ الاسدی کے غلام تھے۔ ان کے والد مقسم خراسان اور زابلستان کے درمیان ایک جنگ میں پکڑے گئے اور غلام بنالئے گئے تھے۔ خود ابراہیم کوفہ میں تجارت کرتے تھے لیکن حضرت اسماعیل کی والدہ علیہ جو بنو شیبان کی باندی تھیں۔ نہایت شریف طبع، عقلمند، اور فاضلہ تھیں۔ صالح المری اور بصرہ کے دوسرے بڑے علما ر اور فقہا ر ان کے مکان پر آکر ان سے علمی اور فقہی مسائل میں گفتگو کرتے تھے[1]۔ والدہ کے اس فضل وکمال کی وجہ سے حضرت اسماعیل انھیں کی طرف منسوب ہو کر ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہو گئے۔ لیکن خود حضرت اسماعیل فرط غیرت وحیا سے اپنے لئے اس کنیت کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔

من قال ابن علیۃ فقد اغتابنی — جو کوئی مجھ کو ابن علیہ کہتا ہے وہ گویا میری غیبت کرتا ہے[2]۔

ولادت | حضرت اسماعیل کے والد ابراہیم بن المقسم کوفہ میں تجارت کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں ان کی آمد ورفت بصرہ میں بھی رہتی تھی۔ یہیں انھوں نے علیہ سے نکاح کیا۔

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۰ [2] بغدادی ج ۶ ص ۲۳۱

سنہ ۱۱۰ھ میں حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ ماں کی وجہ سے ان کا قیام بصرہ میں رہا۔ ان کے ایک بھائی ربعی بن ابراہیم تھے۔

علم وفضل | ان کے علم وفضل پر سب کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبی انھیں العلامۃ اور "احد الاعلام" لکھتے ہیں[1]۔ ان کی تعلیم کا اہتمام ان کی والدہ ماجدہ نے ہی کیا تھا۔

عبدالوارث جلادی جو اس زمانہ کے مشہور محدث تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک دن علیۃ اپنے بچے اسماعیل کو لیکر میرے پاس آئیں اور کہا۔ یہ میرا بیٹا ہے، اس کو اپنے ساتھ رکھا کیجئے، تاکہ یہ آپ کی سی خو بو پیدا کرلے" عبدالوارث کہتے ہیں "اسماعیل بصرہ کے خوبصورت بچوں میں سے تھے۔ میں ان کو لئے ہوئے جب چند بیٹھے ہوئے آدمیوں کے پاس سے گذرتا تھا تو ان سے کہہ دیتا تھا، آگے ہوجاؤ" پھر میں ان کو کسی محدث کی خدمت میں حاضر کردیتا تھا، ابراہیم الحربی جو اس روایت کے ناقل ہیں بیان کرتے ہیں۔ "ابن علیہ بڑے ہوئے تو اہل بصرہ کو اس میں شک نہیں تھا کہ وہ عبدالوارث سے زیادہ ثبت اور ثقہ فی الحدیث ہیں[2]"

علم حدیث | ان کو حدیث میں خاص کمال حاصل تھا۔ غندر جو مشہور امام حدیث ہیں بیان کرتے ہیں "میری نشو ونما علم حدیث کی فضا میں ہوئی ہے، اس علم میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کو ابن علیہ پر فضیلت حاصل ہو۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں "کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس نے خطا نہ کی ہو۔ البتہ ابن علیہ اور بشر بن المفضل اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں[3]"

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶ [2] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۱ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶

ابن المدینی فرماتے ہیں "میں نہیں کہتا کہ کوئی شخص حدیث میں ابن علیہ سے زیادہ ثبت ہے"[1]۔

ہیثم بن خالد کا بیان ہے "ایک مرتبہ بصرہ کے چند حفاظِ حدیث جمع ہوئے۔ تو ان سے کوفہ کے محدثین نے کہا "تم اسماعیل کو ہمارے سامنے سے ہٹا دو پھر جس کسی کو تم لانا چاہو لے آؤ"[2]۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "بصرہ میں ان پر تثبت کی نہایت ہے" حضرت شعبہ انھیں سید المحدثین کہتے تھے[3]۔ ابن ناصر الدین کہتے ہیں وہ ثبت اور متقن تھے۔ ان کی روایات میں کوئی خطا نہیں پائی گئی[4]" یزید بن ہارون فرماتے ہیں "میں بصرہ گیا تو مجھ کو وہاں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس کو حدیث کے باب میں ابن علیہ سے افضل سمجھا جاتا ہو"[5] حضرت قتیبہ بیان کرتے ہیں "عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ حفاظِ حدیث چار ہیں:۔ اسماعیل بن علیہ عبد الوارث۔ یزید بن زریع، اور وہیب" حضرت یحییٰ بن معین جو مشہور امام جرح و تعدیل ہیں فرماتے ہیں "کان ثقۃ مامونا صدوقا مسلما ورعا تقیا"[6]

جلالت شان ان کی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے محدثین اُن کی مخالفت سے خائف رہتے تھے۔ عفان بیان کرتے ہیں "ایک مرتبہ ہم حماد بن سلمۃ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے کوئی حدیث پڑھی اور اس میں ان سے ایک خطا ہو گئی۔ کسی شخص نے ان کی

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۷
[2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۶
[3] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۳۳
[4] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۳۳
[5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶
[6] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۶

کہا، اس حدیث میں تو آپ کی مخالفت کی گئی ہے۔ انھوں نے پوچھا، کس نے مخالفت کی ہے۔ جواب ملا، حماد بن زید نے۔ آپ نے یہ سن کر اس قول کی طرف کچھ التفات نہیں کیا۔ اور یوں بھی اُن کی عادت تھی کہ کسی کے قول کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک شخص نے کہا، حضرت ابن علیہ بھی تو اس حدیث میں آپ کے مخالف ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت حماد کھڑے ہو گئے، اور گھر میں تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے اور فرمانے لگے۔ تو بس قول تو اس حدیث میں حضرت اسماعیل بن علیہ کا ہی معتبر ہے[1] امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے، حضرت مالک کی وفات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے ان کا قائمقام حضرت سفیان کو بنا دیا۔ پھر حضرت حماد بن زید کا انتقال ہوا تو خدا نے ان کا قائم مقام میرے لئے ابن علیہ کو کر دیا[2] ایک مرتبہ یزید بن ہارون نے اپنے حلقہ میں ایک حدیث نقل کی اور سلسلہ اسناد نقل کرنے کے بعد کہا کہ اس روایت کی تخریج علی نے کی ہے۔ ایک شخص نے کہا، ابن علیہ تو اس کو مجاہد سے مروی مانتے تھے۔ یزید بن ہارون نے یہ سنکر کچھ التفات نہیں کیا اور انھوں نے پھر وہی خَرَّجَہٗ عَلَیّٰ کہا۔ یزید بن ہارون کو غلط فہمی یہ ہوئی تھی کہ وہ ابن علیہ کو ابن عینیہ سمجھے تھے۔ اس لئے اس شخص نے پھر ذرا زور سے کہا "ابن عُلَیَّہ"۔ اب یزید بن ہارون نے ابن علیہ کا نام سُنا تو سخت پریشان ہوئے اور دو مرتبہ ابن علیہ۔ ابن علیہ کہہ کر خاموش ہو گئے[3]

حفظ اور فہم حدیث	حضرت اسماعیل طلب علم کے زمانہ سے ہی اپنے ساتھیوں میں

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۶ [3] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۴

فہم حدیث کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ "حاتم بن وردان کا بیان ہے کہ یحییٰ۔ اسماعیل۔ وہیب اور عبدالوہاب یہ چاروں ایک ساتھ حضرت ایوب کی مجلس درس میں شریک ہوتے تھے۔ درس سے فارغ ہوکر جب یہ اُٹھتے تھے تو سب حضرت اسماعیل کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے اور اُن سے سوال کرتے تھے، "ایوب نے کیا کہا اور اُس سے اُن کی مراد کیا تھی؟" اسماعیل ان سب کو جواب دیتے تھے[1]۔

حفظ | حضرت اسماعیل کا تمام ذخیرہ احادیث اُن کے سینہ میں محفوظ تھا۔ وہ لکھتے نہیں تھے وہیب کا قول ہے کہ اسماعیل بن ابراہیم کا حفظ اور عبدالوہاب کی کتاب دونوں برابر ہیں "زیاد بن ایوب کہتے ہیں "میں نے ابن عُلیَّہ کی کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ لیکن اس کے باوجود تثبت اور ثقاہت کا یہ عالم تھا کہ اُن سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی تھی۔ علی بن المدینی جو مشہور امام حدیث ہیں، فرماتے ہیں "محدثین سے تصحیف بھی ہوئی ہے اور خطائیں بھی، لیکن چار محدثین ایسے ہیں جن سے کوئی خطا یا تصحیف نہیں ہوئی، انھیں چار میں ایک ابن عُلیَّہ بھی ہیں[2]"۔

شیوخ | انھوں نے جن شیوخ سے حدیث کا سماع کیا اُن میں چند بزرگوں کے نام یہ ہیں:۔ ایوب السختیانی، علی بن جدعان، محمد بن المنکدر، عبداللہ بن ابی نجیح، حریری، عطاء بن السائب

تلامذہ | اور خود ان سے جن حضرات نے احادیث کا سماع کیا اُن میں بڑے بڑے محدثین شامل ہیں مثلاً شعبہ۔ عبدالرحمن بن مہدی۔ علی بن المدینی۔ احمد اسحاق۔ بندار وغیرہم۔

فقہ | حدیث کی طرح انھیں فقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ حضرت شعبہ انھیں "ریحانۃ الفقہاء

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۲ [2] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۲، ۲۳۳

یعنی "فقہاء کے گل تر" کہتے تھے[1]

قضا | اس فقہی مہارت و تبحر کی وجہ سے اُن کو پہلے پہل بصرہ کے صدقات کا انتظام سپرد کیا گیا پھر بغداد میں فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ ان سے کرایا جانے لگا اور اخیر میں انھیں بغداد کا جج بنادیا گیا لیکن ایک عجیب واقعہ ایسا پیش آیا کہ انھیں اس عہدہ سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک تجارت کرتے تھے اور اس میں انھیں بہت کافی نفع تھا۔ لیکن یہ تجارت خود سرمایہ دار بننے کے لئے نہ تھی۔ بلکہ علماء اور طلبہ کی خدمت اور ان کو دنیوی ضرورتوں سے بے پروا کردینے کے لئے تھی، چنانچہ وہ خود فرماتے تھے "اگر سفیان بن عینیہ، سفیان ثوری، فضیل، ابن السماک اور ابن علیہ یہ پانچ حضرات نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا"۔ حضرت ابن علیہ کے عہد قضا میں پہلی مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارک بغداد آئے اور انھیں جب اس واقعہ کا علم ہوا تو نہایت آزردہ خاطر ہوئے۔ یہاں تک کہ دستور کے مطابق حضرت ابن علیہ گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت عبداللہ بن مبارک کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اُن سے گفتگو کرنے کے لئے سر بھی نہیں اُٹھایا، ابن علیہ تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر واپس چلے آئے۔ اور دوسرے دن ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا "میں آپ کے احسان و کرم کا منتظر تھا، اور آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہوا تھا لیکن آپ نے مجھ سے کلام نہیں کیا۔ معلوم نہیں جناب کو میری کون سی حرکت ایسی ناگوار ہوئی ہے؟" حضرت عبداللہ بن مبارک نے اس خط کو پڑھنے کے بعد فرمایا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۵

"یہ شخص (ابن علیہ) بال کی کھال ہی نکالنا چاہتا ہے"، اور پھر جواب میں یہ اشعار لکھ کر ارسال فرمائے۔

یا جاعل الدین لہٗ بازیًا   یصطاد اموال المساکین

احتلت للدنیا ولذاتھا   بحیلۃ تذھب بالدین

فصرت مجنونا بھا بعد ما   کنت دواء للمجانین

این روایاتک فی سردھا   لترک ابواب السلاطین

ان قلت اکرھت فذا باطل   زال حمار العلم فی الطین

ترجمہ:۔ اے دین کو غریبوں کے اموال کا شکار کرنے والا باز بنانے والے تو نے دنیا اور اس کی لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا حیلہ اختیار کر لیا ہے جو دین کو تباہ کر کے رہے گا پہلے تو تو پاگلوں کے لئے دوا کا حکم رکھتا تھا لیکن اب تو خود دنیا کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اب بادشاہوں کے دروازوں سے بے پرواہ ہو کر تیرا وہ احادیث و روایات میں مشغول رہنا کہاں ہے؟ اگر تو یہ کہے کہ مجھ کو (عہدہ قضا کے قبول کرنے پر) مجبور کر دیا گیا تو یہ عذر سراسر باطل ہے، اب تو بہر حال علم کا گدھا کیچڑ میں پھسل گیا ہے۔

ابن علیہ کے پاس یہ خط پہونچا تو آپ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ آپ اسے پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ خط پڑھ لینے کے بعد آپ فوراً مجلس قضا سے اٹھے اور ہارون رشید کے پاس جا کر اپنا استعفیٰ پیش کرتے ہوئے فرمایا خدا کے لئے آپ میری بڑھاپے

پر رحم فرمائے۔ کیونکہ میں اب خطا پر زیادہ صبر نہیں کر سکتا"۔ ہارون رشید نے کہا معلوم ہوتا ہے اس مجنون (عبداللہ ابن مبارک) نے آپ کو بھکا دیا ہے، حضرت ابن علیہ بولے "بھکایا نہیں، بلکہ انھوں نے تو مجھ کو (ایک مصیبت عظمیٰ سے) نجات دلادی ہے، اور میں تو دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اس سے رستگاری عطا فرمائے۔ ہارون الرشید نے آپ کا استعفا منظور کر کے آپ کو خدمت قضا سے سبکدوش کر دیا، حضرت عبداللہ بن مبارک کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت خوش ہوئے۔ اور حسب سابق ایک تھیلی ابن علیہ کی خدمت میں بھیجدی۔[1]

زہد و اتقا علمی اعتبار سے بھی اُن کا پایہ ہم عصروں میں بہت ممتاز تھا اُن پر خشیۂ ربانی کا ہر وقت ایسا غلبہ رہتا تھا کہ وہ ہنستے بھی نہیں تھے ابن عمرو بن زرارہ کہتے ہیں "میں چودہ برس تک حضرت ابن علیہ کے ساتھ رہا ہوں۔ لیکن اس مدت میں ان کو کبھی ہنستے ہوئے اور سات سال تک انھیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا"۔[2]

احمد بن ابراہیم بیان کرتے ہیں میں نے اپنے بعض دوستوں سے سنا ہے کہ "ابن علیہ بیس سال سے نہیں ہنسے"۔[3]

تلاوتِ قرآن انھیں تلاوت قرآن مجید کا بیحد شوق تھا ابن مدینی نے ایک رات اُن کے ساتھ بسر کی تو انھوں نے دیکھا کہ حضرت ابن علیہ نے اسی شب میں ایک تہائی قرآن مجید

[1] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۵، ۲۳۶ [2] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۵

[3] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۵

کی تلاوت کی۔[1]

وہ کبھی کبھی نبیذ کا استعمال کرتے تھے بعض لوگوں کو اُن کا یہ عمل احتیاط اور ورع کے خلاف نظر آتا تھا۔ لیکن حضرت وکیع کے سامنے ایک مرتبہ اس کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا، "تم اگر کسی بصری شخص کو نبیذ پیتے دیکھو تو اُسے متہم کر سکتے ہو۔ لیکن اگر کسی کوفی کو دیکھو تو اُسے متہم نہ کرو۔ سائل نے دریافت کیا، "یہ کیونکر؟ فرمایا،" اس لئے کہ کوفی نبیذ از راہ تدین پیتے ہیں اور اسی طرح اہل بصرہ اسے از راہ تدین ترک کرتے ہیں۔"[2]

عبادت | وہ عبادت بھی بہت کرتے تھے۔ عفان کا بیان ہے کہ "حضرت ابن علیہ کا شمار اُن کے عہد شباب سے ہی بصرہ کے عبادت گذاروں میں ہوتا تھا۔"[3]

خلق قرآن کا فتنہ اور ابن علیہ | بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن علیہ خلق قرآن کے قائل تھے۔ اور اگرچہ اُن کے کسی قول سے اس کی صراحت نہیں ملتی لیکن اُن کے بعض ملفوظات سے اس کی تائید ہوتی ہے ـــ اسی سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن ابن علیہ ہارون رشید کے بیٹے محمد امین کے پاس گئے تو امین نے آپ کو بُرا بھلا کہا، اور پھر پوچھا "کیا آپ خلق قرآن کے قائل ہیں؟" ابن علیہ نے اس پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں آپ پر قربان جاؤں، یہ ایک عالم کی لغزش ہے"۔ اس واقعہ کی شہرت نے ابن علیہ کے بعض خاص معتقدین کے دل میں بھی اُن کی طرف سے تکدر پیدا کر دیا تھا۔

لیکن علامہ خطیب بغدادی اس واقعہ کی تردید میں لکھتے ہیں کہ ابن علیہ سے خلق قرآن

[1] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۰ [3] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۹

کے قول کو منسوب کرنا اُن پر سراسر بہتان و افترا ہے۔ عبد الصمد بن یزید مردویہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن علیہ سے خود سُنا ہے فرماتے تھے "القرآن کلامُ اللہِ غیرُ مخلوق"[1] حافظ ذہبی کا رجحان بھی ادھر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں ابنِ عُلیّہ سے تعبیر میں غلطی ہوگئی اور جو کچھ اُنھوں نے فرمایا تھا، اُس سے توبہ کرلی تھی۔[2]

وفات جمعرات کے دن ۲۴، یا ۲۵، ذیقعدہ ۱۹۳ھ کو وفات پائی اور بغداد میں دفن ہوئے۔

یحییٰ بن محمّد بن صاعد

نام و نسب یحییٰ نام۔ ابو محمد کنیت۔ والد کا نام محمد تھا۔ ابو جعفر المنصور کے غلام تھے۔

علم و فضل ۲۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل کا شوق شروع سے تھا۔ چنانچہ ۲۳۹ھ میں جبکہ ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ اُنھوں نے حدیثیں لکھنی شروع کردی تھیں۔[3] اور اس شوق و ذوق میں اُنھوں نے شام، عراق۔ مصر۔ اور حجاز کے طویل سفر کئے۔[4] یہی وجہ ہے کہ اُن کے شیوخ و اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے جس میں سے چند نام یہ ہیں:۔

حسن بن عیسیٰ بن ماسرجس۔ محمد بن سلیمان لوَین۔ یحییٰ بن سلیمان بن نضلۃ الخزاعی۔ سوار بن عبد اللہ العنبری۔ احمد بن منیع البغوی۔ حسین بن الحسن المروزی۔ ابراہیم بن سعید الجوہری

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۶ ص ۲۳۵ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶

[3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۲۳۱ [4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۸۰

ابو ہشام الرفاعی ۔ یوسف بن موسیٰ القطان ۔ محمد بن اسماعیل البخاری

جلالت شان اُن کی محنت اور طلبِ صادق ثمر آور ہوئی ۔ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا شمار عظیم المرتبت حفاظِ حدیث میں ہوتا ہے ۔ علامہ بغدادی فرماتے ہیں ،، حضرت یحییٰ حدیث کے حافظ تھے ۔ انہوں نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا اور اس کی طلب میں سفر کئے ۔ ابنِ عماد الحنبلی انھیں ،، الحافظ الثقۃ الحجۃ ،، لکھتے ہیں ۔

،، ایں خانہ ہمہ آفتاب است ،، کے مطابق حضرت یحییٰ تین بھائی تھے ۔ ایک کا نام یوسف تھا جو سب سے بڑے تھے ۔ منجھلے بھائی کا نام احمد تھا ۔ حضرت یحییٰ سب سے چھوٹے تھے یہ تینوں بھائی علم حدیث کا ذوق رکھتے تھے ۔ یوسف نے خلاد بن یحییٰ سے روایات کی ہیں اور احمد نے ابوبکر و عثمان ابن ابی شیبۃ سے لیکن حضرت یحییٰ برادر خورد ہونے کے باوصف دونوں بھائیوں سے اعلم اور اثبت تھے [1] ،،

درایت جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے حضرت یحییٰ کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے لیکن ان کی شہرت حفظ سے زیادہ درایت میں تھی ۔ ابو علی النیشاپوری کہتے ہیں ۔ حضرت یحییٰ کے ہم عصروں میں تمام عراق میں کوئی ایسا نہیں تھا جو فہم کے لحاظ سے اُن کے برابر ہو ،، پھر کہتے ہیں ،، اور فہم ہمارے نزدیک حفظ سے زیادہ اہم ہے [2] ،، ابن الجعابی سے کسی نے پوچھا ،، کیا آپ کے نزدیک ابن صاعد حافظ تھے ،، وہ مسکرائے ۔ اور کہنے لگے ۔ ،، ابو محمد کو حافظ تو نہیں کہا جا سکتا ۔ البتہ وہ صاحب درایت تھے ،، ابوبکر بن عبدان سے کسی نے

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۴ ص ۲۳۲ [2] شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۸۰

پوچھا، حفظ اور درایت میں فرق کیا ہے؟" بولے "الدرایۃ فوق الحفظ" درایت کا مرتبہ حفظ سے بڑا ہے۔[1]

خالد بن عبدان الشیرازی کا بیان ہے کہ یحیٰی بن محمد صاعد محمد بن محمد الباغندی سے زیادہ حدیث جانتے تھے اور درایت میں کوئی شخص ان پر فوقیت نہیں رکھتا۔[2]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت یحیٰی کے حفظِ حدیث سے متعلق بعض لوگوں کو شبہ تھا اور اس لئے وہ ان کا مختلف طریقوں سے امتحان لیتے تھے۔ لیکن امتحان میں اُن لوگوں کو ناکامی ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک اچھی شکل وصورت والا شخص حضرت یحیٰی کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ کی ہی روایت کردہ بعض حدیثیں آپ کے سامنے پڑھنی چاہتا ہوں" انھوں نے اجازت دیدی۔ لیکن اس شخص نے ان کی روایتوں کی بجائے ابوالقاسم البغوی کی روایتیں پڑھ ڈالیں۔ حضرت یحیٰی بکمالِ توجہ سنتے رہے۔ قرارت کے اختتام پر اس شخص نے کہا، میں نے غلطی سے آپ کے سامنے اس جزء کی قرارت کر دی ہے، یہ سب روایتیں تو ابوالقاسم البغوی کی تھیں۔ حضرت یحیٰی بولے "تم نے میرے سامنے جن روایتوں کی قرارت کی ہے۔ وہ سب انہی شیوخ کی زبانی جن سے تم نے سماع کیا ہے خود میری بھی سنی ہوئی ہیں" مزید توثیق کے لئے آپ اپنا صحیفہ نکال لائے۔ اور

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۴ ص ۲۳۳ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۰۵

ورق اُلٹ اُلٹ کر دکھاتے رہے کہ دیکھو یہ سب اس میں موجود ہیں اور انہی اسانید کیساتھ[1]

فقہ | حدیث کی طرح انھیں فقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ لیکن وہ حتی الوسع خود فتویٰ دینے سے احتراز کرتے تھے ایک دفعہ آپ کے پاس ایک عورت آئی۔ اور پوچھنے لگی۔ اگر کنوئیں میں مرغی گر پڑے تو اس کا حکم کیا ہے؟ پانی پاک رہتا ہے یا ناپاک ہوجاتا ہے؟" آپ نے فرمایا بھلا مرغی کنوئیں میں کس طرح گر سکتی ہے؟ عورت بولی "کنوئیں کا منہ کھلا ہوا تھا" آپ نے جواب دیا "تو پھر تم نے کنوئیں کو ڈھانک کیوں نہیں رکھا تھا کہ اس میں کوئی چیز گرتی ہی نہیں" ابوبکر الابہری اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد بیان کرتے ہیں کہ در اصل یحییٰ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے عورت کو ٹال دیا۔ لیکن علامہ بغدادی ابوبکر ابہری کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "یہ ابہری کا محض خیال باطل ہے۔ ورنہ یحییٰ ایک جلیل القدر عالم تھے۔ سنن اور ان کے احکام کی ترتیب میں ان کی متعدد تصانیف ہیں جن سے ان کی فقہی مہارت کا ثبوت ملتا ہے رہا عورت کو جواب نہ دینا تو غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مسئلہ میں علماء باہم مختلف ہیں۔ اس لئے حضرت یحییٰ نے کسی ایک امام کی رائے نقل کر دینا ورع کے خلاف سمجھا۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ خود منصب افتاء سنبھال کر اپنی طرف سے کوئی جواب دیں[2]۔

وفات | ذوالقعدہ ۳۱۸ھ میں وفات پائی۔ اور باب کوفہ میں دفن ہوئے۔

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۱۴ ص ۲۳۳، ۲۳۴ [2] بغدادی ج ۱۴ ص ۲۳۳

ارباب کشف و کرامات اولیاء اللہ

اسلام میں علم اور عمل دونوں کا ساتھ رہا ہے علم ظاہری اور علم باطنی کی تقسیم کوئی حقیقی تقسیم نہیں ہے۔ اسلئے جو اُس عہد کے علماء تھے عمل کے اعتبار سے بھی وہ ابنا رعصر میں ممتاز ہوتے تھے لیکن یہاں تک تابعین اور تبع تابعین وغیرہم کے زیرعنوان صرف اُنہی اکابر اُمت کا ذکر کیا گیا ہے جن کا وصف غالب علم وفضل میں امتیاز تھا۔ اور اس بنا پر اُن کا شمار محدثین و فقہاء کی صف میں ہوتا ہے۔ اب ہم یہاں چند اُن بزرگوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اگرچہ علم وفضل کے لحاظ سے زیادہ نمایاں نہ تھے لیکن اُن کا شمار امتِ مسلمہ کے اکابرِ اولیاء اللہ میں ہوتا تھا۔ اور جو اپنے روحانی کمالات کے اعتبار سے اربابِ کشف وشہود سمجھے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بھی اگر استیعاب سے کام لیا جائے تو اس کثرت سے نام ملتے ہیں کہ ان کے حالات میں ایک مستقل ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے لیکن ہماری کتاب کی تنگ دامانی مجبور کرتی ہے کہ بطور مشتے نمونہ از خروارے۔ اس باب میں بھی صرف چند بزرگوں کا ہی ذکر کیا جائے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔

ابو یحییٰ مالک بن دینار البصریؒ[1]

نام و نسب مالک نام، ابو یحییٰ کنیت۔ والد کا نام دینار تھا بصرہ کے رہنے والے اور بنو اسامہ بن لوی بن غالب کی ایک عورت کے غلام تھے۔ ان کے والد سجستان یا کابل کے قیدیوں میں سے تھے۔

علم و فضل انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ، احنف، شہر بن حوشب، حسن بصری، ابن سیرین، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ سے روایت کی اور اُن سے جن حضرات نے روایت کی اُن میں اُن کے بھائی عثمان، ابان بن یزید، حارث بن وجیہ، بسطام بن مسلم العوذی، سعید بن ابی عروبہ، عبداللہ بن شوذب وغیرہم شامل ہیں۔ امام نسائیؒ، اور ابن حبان نے اُن کو ثقہ کہا ہے۔

ولایت و کرامت لیکن علم و فضل سے کہیں زیادہ اُن کی شہرت بہ حیثیت ایک عظیم المرتبت ولی اللہ اور بزرگ دین کے ہے۔ چنانچہ ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں "وہ بڑے سردار اور مشہور ولی تھے" علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں "وہ عالم اور زاہد اور کثیر الورع والتقویٰ تھے"۔ امام نووی بھی اُن کو الزاهد التابعی لکھتے ہیں۔

---

[1] یہ حالات حسب ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۴ و ۱۵۔ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۸۰ و ۸۱ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۲۲ و ۴۲۳۔ صفۃ الصفوۃ ج ۳ از صفحہ ۱۹۷ تا ۲۰۹۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۷۳۔

تقویٰ و طہارت

اُن کے زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ سے قرآنِ مجید کی کتابت کرتے اور اُس سے اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے تھے "میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ جو شخص اپنے ہاتھ سے کام کرے، وہ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں نیک بخت اور سعادت مند ہے"

ایک مرتبہ ایک مجلس وعظ میں تشریف رکھتے تھے۔ اس میں واعظ نے ایک قصّہ بیان کیا جسے سُن کر لوگوں کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے بعد بہت کافی مقدار میں کھانا آیا۔ سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ حضرت مالک بن دینار سے بھی کہا گیا کہ کھانا تناول فرمائیے۔ آپ نے انکار کر دیا، اور فرمایا "اس کھانے کے کھانے کا حق صرف اُن لوگوں کو ہے جو مجلس وعظ میں رو پڑے تھے، اور چونکہ میں نہیں رویا اس لیے مجھ کو اس کا حق بھی نہیں ہے۔

دنیا سے بے تعلقی

جمالِ خداوندی نے جس خوش نصیب انسان کے دل کو اپنا آشیانہ بنا لیا ہو اُس میں دنیا اور اہلِ دنیا کی محبت و الفت کو تھوڑی سی جگہ بھی نہیں مل سکتی۔ حضرتِ مالک کا حال بھی یہی تھا، انہوں نے کھُلے بندوں اعلان کر رکھا تھا کہ "میرے گھر میں داخل ہو کر کوئی شخص اگر کوئی چیز لینی چاہے تو وہ بے تکلف لے سکتا ہے، وہ اُس کے لیے حلال ہے، مجھ کو نہ اب قفل کی ضرورت ہے اور نہ کنجی کی"۔ آپ بسا اوقات مسجد میں سے کنکریاں اُٹھا کر فرماتے "کیا اچھا ہوتا اگر تمام دنیوی ضرورتوں کے لیے صرف یہ کنکریاں میرے لیے کافی ہوتیں اور میں کھانے پینے کی چیزوں سے مستغنی ہو کر ان پر ہی اکتفا کر سکتا"، کبھی کبھی آپ

عالم جذب میں یہ بھی فرماتے کہ اگر میرے لیے ریت کا پھانکنا یا مٹی کا کھانا درست ہوتا تو میں اس پر بھی قناعت کرلیتا۔" ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک ساتھی سے فرمائش کی کہ خالص دودھ اور روٹی لائے، اُس نے فوراً تعمیل کی حضرت مالک نے دودھ روٹی پر ڈال لیا اور اُسے ہاتھ میں لیکر اُلٹ پلٹ کرنے لگے۔ پھر زبان گرامی سے روٹی کو مخاطب کرکے ارشاد ہوا "میں چالیس سال سے اب تک برابر اپنے نفس کو تجھ سے روکتا رہا ہوں اور خدا کا شکر ہے اس مدت میں اپنے عزم میں کامیاب رہا" لیکن افسوس! آج تو میرے قریب آگئی ہے اور چاہتی ہے کہ مجھ پر غالب آجائے۔ چل ہٹ، دور ہو، یہ فرماکر آپ نے روٹی ہٹا دی اور اُسے تناول نہیں فرمایا۔

علاوہ ازیں آپ بارہا فرماتے تھے "بدن جب بیمار ہوتا ہے تو اُس وقت نہ کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے اور نہ پینا، نہ کوئی راحت راحت ہوتی ہے، اور نہ نیند کا مزہ حاصل ہوتا ہے پس یہی حال دل کا ہے۔ اُس میں دنیا کی محبت جڑ پکڑ لیتی ہے تو لاکھ وعظ کہے جائیں کسی کا مطلق اثر نہیں ہوتا" آپ یہ بھی فرماتے رہتے تھے "تم دنیا کے لیے جتنے غمگین ہوگے اُسی قدر آخرت کا غم دل سے کم ہوجائیگا اور تم آخرت کے لیے جتنا غم محسوس کروگے اتنا ہی دنیا کا غم تمہارے دل سے کم ہوجائیگا"

عبدالعزیز بن سلمان کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ حضرتِ مالک سے سُنا فرمارہے تھے "جو شخص یہ جانتا ہے کہ اُس کا انجام موت ہے، اور قبر اُس کا ٹھکانہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی اس شخص کی آنکھیں دنیوی لذائذ سے کس طرح شاد کام ہوسکتی

ہیں، اور اس دنیا میں اُس کی زندگی کس طرح خوشگوار بن سکتی ہے" یہ فرماکر آپ پر رقت طاری ہوجاتی اور آپ زار زار رونے لگتے تھے۔ یہاں تک کہ بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑتے تھے" وہ اگر کسی شخص کو دنیوی آسائشوں اور نعمتوں پر مسرور دیکھتے تھے تو اُنہیں رنج اور افسوس ہوتا تھا، اور فرماتے تھے " خدا کی قسم! آخرت کا غم اور دنیا کی خوشی دونوں کسی ایک شخص کے دل میں جمع نہیں ہوسکتیں" ابوالحسن البصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت مالک بن دینار جیلخانہ کا معائنہ کرنے گئے، وہاں اُنہوں نے ایک ایسا شخص دیکھا جو ٹیکس (خراج) کی رقم میں خیانت کرنے کے الزام میں محبوس تھا، اور اُس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس قیدی نے حضرت مالک کو دیکھ کر کہا:۔ حضرت! کیا آپ کو میری اس تکلیف پر رحم نہیں آتا؟" اتنے میں حضرت مالک نے اپنا سر اُٹھایا تو انہیں کنڈی لٹکی ہوئی نظر آئی۔ پوچھا "یہ کس کی ہے" قیدی نے کہا میری ہے" آپ نے اس کو نیچے اُتروا کر دیکھا تو معلوم ہوا اُس میں (بھنے ہوئے) مُرغ اور حلوی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ نے قیدی سے فرمایا "میاں یہی تو وہ چیزیں ہیں جنہوں نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوائی ہیں، تو پھر غم کس بات کا ہے؟" آپ نے یہ فرمایا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

بصرہ کے بازاروں میں چلتے پھرتے آپ کو مرغوب چیزیں نظر آتیں تو گھر واپس آکر اپنے نفس سے خطاب کرکے فرماتے تھے "اے نفس تو خوش رہ کیونکہ میں نے یہ چیزیں تجھ پر حرام نہیں کی ہیں، بلکہ میں تجھ کو صرف اس لیے ان سے روکتا ہوں کہ تیری حرمت و

عزت باقی رہے۔

وہ بسا اوقات یہ بھی فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو محبوب بناتا ہے تو دنیا میں سے اس کا حصّہ کم کر دیتا ہے تاکہ وہ اس سے فارغ القلب ہو کر ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ اور اگر وہ کسی کو ناپسند کرتا ہے تو دنیا کے کسی شغلہ کا طوق اس کی گردن میں ڈال کر فرماتا ہے "چل ہٹ میرے سامنے سے دور ہو۔ اب میں تجھ کو سامنے نہ دیکھوں۔

دنیا سے اس درجہ بے تعلق رہنے کی وجہ سے وہ مال ومتاع جہاں میں سے صرف چند چیزیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بصرہ میں ان کے گھر میں آگ لگ گئی۔ آپ اپنی چادر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔ لوگوں نے کہا "حضرت! گھر کی تو خبر لیجیے" فرمایا "گھر میں اور رکھا ہی کیا ہے، جو لوگ بھاری سامان رکھتے ہیں انکے لیے ہلاکت ہے۔ ایک دفعہ آپ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے سفر بحری تھا، کشتی گھاٹ کے قریب پہنچی تو ٹیکس وصول کرنے والا کشتی میں آیا اور کہا "تم میں سے کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے" حضرت مالک بن دینار نے یہ سنا تو آپ نے اپنے کپڑے کاندھے پر ڈالے اور پھر ایک چھلانگ لگائی تو سیدھے زمین پر تھے ٹیکس وصول کرنے والے نے پوچھا "یہ کیا، آپ کشتی چھوڑ کر کیوں چلے آئے" ارشاد ہوا "میرے ساتھ کوئی چیز ہی نہ تھی" وہ بولا "اچھا تو جائیے" حضرت مالک بن دینار فرماتے ہیں "اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا کہ بس آخرت کا معاملہ بھی اسی طرح ہوگا"

ایک مرتبہ چند اراد تمندوں کی ایک جماعت آپ سے شرف زیارت حاصل کرنے کے لیے رات کے وقت مکان پر حاضر ہوئی، دیکھا کہ گھر میں چراغ ندارد ہے۔ اور آپ ایک روٹی کو ہاتھ میں لیے ہوئے ٹہل رہے ہیں۔ ان لوگوں نے پوچھا "حضرت! کیا خوب! چراغ بھی موجود نہیں ہے، اور روٹی کھانے کے لیے کوئی سالن بھی نہیں ہے؟" فرمایا "بس مجھ کو چھوڑ دو بھی! خدا کی قسم میں تو اُن چیزوں پر ہی نادم ہوں جو میرے پاس پہلے تھیں۔

خوفِ خدا | تمام فضائل اعمال اور محاسن اخلاق کی جڑ اور بنیاد خوفِ خدا ہے۔ اس خاص وصف میں حضرت مالک بن دینار کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ کسی قاری نے آپ کے سامنے آیت اذا زُلزلت الارضُ زِلزالھا تلاوت کی تو اُسے سنتے ہی آپ پر لرزہ طاری ہوگیا اور زار و قطار رونے لگے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر تمام اہل مجلس بھی اپنے آپے سے باہر ہوگئے۔ اور اُنہوں نے بھی رونا پیٹنا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ قاری آخری آیت "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" پر پہنچا تو آپ کی حالت بالکل ہی دگرگوں ہوگئی اور آپ کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اسی بیہوشی کے عالم میں آپ کو گھر پہنچایا گیا۔

عبداللہ بن مرزوق بیان کرتے ہیں "ایک روز حضرت مالک بن دینار قبرستان میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک جنازہ دیکھا جسے دفن کیا جا رہا تھا۔ آپ بھی قبر کے کنارے پر آکر کھڑے ہوگئے۔ اور جنازہ کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اپنے نفس سے مخاطب ہو کر یوں

ارشاد فرمایا "اے مالک! دیکھ لے، کل تجھ کو بھی یہیں آنا ہے اور یہاں قبر میں ٹیک لگانے کے لیے تجھے کوئی تکیہ بھی نہیں ملیگا" آپ دیر تک بار بار یہی فرماتے رہے، یہاں تک کہ بیہوش ہو کر قبر کی آغوش میں گر پڑے۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے قبر سے باہر نکالا اور اسی حالت میں آپ کو گھر لے کر گئے۔

خوفِ خدا کی زیادتی کی وجہ سے خود تو کیا ہنستے، دوسروں کو بھی اگر ہنستے ہوئے دیکھتے تو اُن کی عاقبت فراموشی پر آپ کو قلبی صدمہ اور رنج محسوس ہوتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو خندہ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "اگر مجھ کو بصرہ کے تمام اموال اور بار دیدیے جائیں اور اس کے عوض مجھ سے ہنسنے کا مطالبہ کیا جائے تو میں اُس وقت بھی اسے پسند نہ کرونگا کہ میرا دل ہنسنے کے لیے فارغ ہو سکے۔

ابو صالح مغیرہ بن ابی حبیب حضرت مالک بن دینار کے داماد تھے، ایک مرتبہ ان کو خیال ہوا کہ حضرت مالک کا انتقال ہو جائیگا۔ اور میں اُن کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود اُن کے خاص خاص اعمال سے بھی واقف نہیں ہونگا۔ یہ تو بڑی افسوس کی بات ہوگی اس لیے آج رات کو چھپ کر دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے دیکھا کہ حضرت مالک گھر میں رات کے وقت تشریف لائے۔ کھانا اُن کی خدمت میں پیش کیا گیا وہ اُنھوں نے تناول فرمالیا، پھر نماز پڑھنی شروع کی۔ اسی حالت میں ان پر حد سے زیادہ رقت طاری ہوگئی۔ اور اُنھوں نے اپنی داڑھی پکڑ کر کہنا شروع کیا "اے خدا! قیامت کے دن جب تو اگلوں اور پچھلوں کو جمع کریگا تو اُس وقت مالک بن دینار کے

بڑھاپے کو دوزخ پر حرام کر دیجیو" ابو صالح بیان کرتے ہیں حضرت مالک اسی جملہ کو بار بار کہتے جاتے تھے، یہاں تک کہ میری آنکھ لگ گئی کچھ دیر کے بعد میں بیدار ہوا تو دیکھا حضرت مالک اسی حالت میں کھڑے ہیں اور اسی جملہ کو بار بار دہراتے جاتے ہیں اور اب شدّتِ جزع وفزع سے اس حالت میں اتنا اضافہ اور ہو گیا ہے کہ وہ ایک قدم آگے رکھتے ہیں اور ایک پیچھے۔ ابو صالح کہتے ہیں "طلوعِ فجر تک اُن کی یہی حالت رہی۔

ایک دفعہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن بارش ہوتی نہیں تھی لوگ بے چینی سے بارش کا انتظار کر رہے تھے حضرتِ مالک نے یہ دیکھ کر فرمایا "تم سب تو بارش کی آس لگائے بیٹھے ہو، لیکن مجھ کو خوف ہے کہ کہیں ان بادلوں سے پتھر نہ برسنے لگیں اگر پتھر نہ برسیں تو سمجھو بڑی خیر ہوئی اور خدا نے بڑا فضل وکرم کیا"

علم بے عمل کی مذمت | حضرت مالک بن دینار کے ارشاداتِ گرامی میں علم بے عمل کی مذمت میں متعدد عبرت انگیز مقولے ملتے ہیں، ایک موقع پر آپ فرماتے ہیں "عالم جب اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو اُس کا وعظ دلوں سے ایسا ہی پھسل جاتا ہے (یعنی کوئی اثر نہیں کرتا) جس طرح بارش کا قطرہ پتھر کی چٹان سے" ایک جگہ بے عمل قاریوں کی تمثیل میں آپ فرماتے ہیں۔

اس زمانہ کے قاریوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے ایک جال بچھا رکھا ہو اور جال میں گیہوں کا کوئی دانہ اُس نے ڈال دیا ہو۔ پھر کوئی چڑیا اُڑ کر جال کے پاس آئے اور پوچھے "اے جال! تجھ کو زمین میں کس چیز نے غائب کر دیا ہے" جال جواب دیتا ہے

"تواضع نے پھر چڑیا پوچھتی ہے" اچھا تو دبلا کیوں ہو رہا ہے" کہتا ہے " زیادہ عبادت کرنے کی وجہ سے" چڑیا سوال کرتی ہے" اور تو نے یہ گیہوں کا دانہ کیوں لٹکا رکھا ہے" جال کہتا ہے "یہ روزہ داروں کے لیے ہے" اب چڑیا اس کے چکمہ میں آکر کہتی ہے " بیشک تو بہت اچھا پڑوسی ہے" اس گفتگو کے بعد مغرب کا وقت ہوتا ہے اور چڑیا روزہ افطار کرنے کے لیے جال کے پاس آتی ہے اور جونہی وہ افطاری لینے کے لیے آگے بڑھتی ہے جال اُس کا گلا گھونٹنے لگتا ہے۔ اب غریب چڑیا کہتی ہے" اگر دنیا میں عبادت کرنے والے سب ایسے ہی ہوتے ہیں تو یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ عبادت گزار خیر اور بھلائی سے بالکل محروم ہیں۔

ایک موقع پر آپ نے نہایت فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ لعلہ یذکر او یخشی :-

"اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارِ فرار (بھاگ جانے کی جگہ) اور آخرت کو دارِ قرار (ٹھہرنے کی جگہ) بنایا ہے، پس اے لوگو تم اپنے مقر کے لیے مفر سے توشہ لیتے جاؤ، اور قبل اس کے کہ تمہارے بدن دنیا سے نکلیں تم دنیا کو اپنے دلوں سے نکال باہر کرو، اور دیکھو تم خود اپنی پردہ دری اس ذات مستجمع الصفات کے سامنے نہ کرو جو تمہارے تمام بھیدوں سے واقف ہے۔ تم اگرچہ دنیا میں زندگی بسر کرتے ہو لیکن تمہاری تخلیق اس دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا کے لیے کی گئی ہے۔ بس سمجھ لو دنیا کی مثال زہر کی سی ہے جو اسے جانتا ہے نہیں کھاتا۔ اور جو نہیں پہچانتا وہ اُسے کھا لیتا ہے۔ یا یوں کہو دنیا ایک خوبصورت سانپ کی مثال ہے کہ طرح طرح کی دھاریوں اور لکیروں کی وجہ سے حسین معلوم ہوتا ہے لیکن اُس کے

اندر زہر پوشیدہ ہوتا ہے عقلمند اُس سے بچتے ہیں لیکن بچے سانپ کی جلد پر مائل ہو کر اُسے اپنے ہاتھ سے پکڑنے لگتے ہیں"۔

معرفتِ نفس | معرفتِ نفس عرفانِ ایزدی کا زینہ ہے، اور معرفتِ نفس کی علامت یہ ہے کہ انسان کو کسی مدح سے مسرت ہو اور نہ کسی کی مذمت پر وہ رنج وقلق محسوس کرے۔ حضرت مالک بن دینار کا یہی حال تھا۔ وہ فرماتے تھے "جب سے میں نے لوگوں کو پہچانا، اس وقت سے میں نہ اُن کی مدح پر خوش ہوتا ہوں اور نہ اُن کی مذمت سے بددلی محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ جو شخص مدح کرتا ہے وہ افراط سے کام لیتا ہے اور جو مذمت کرتا ہے وہ تفریط کرتا ہے

للّٰہیت اور خلوص | اُن کا کوئی کام ایسا نہیں ہوتا تھا جس سے وہ تقرب الی اللہ کی توقع نہ کرتے ہوں۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "میں دیکھتا ہوں کہ تم میں سے ہر شخص ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے کا آرزومند رہتا ہے جو خوبصورت ہو۔ اور جس کو اُس کے والدین نے کھِلا پلا کر خوب فربہ اندام اور گداز بنا دیا ہو۔ یہ لڑکی اپنے جسم کی موزونیت اور دلکشی کے باعث اس شخص کے دل پر پوری طرح قبضہ جما لیتی ہے اور وہ اس کا اطاعت گذار بن کر اُس کی ہر قسم کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے ہمہ اوقات کمربستہ رہتا ہے لیکن اس کے برخلاف وہ شخص کس قدر خوش نصیب ہے جو ایک کمزور اور یتیم لڑکی سے نکاح کرے، اُس کو کپڑے پہنائے تو اجر ملے۔ اور اُس کے لیے سامانِ زینت وآرائش مہیا کرے تو اُس پر بھی اُس کو اجر و ثواب ملے۔

امر بالمعروف | جن آنکھوں میں جلال وجمال خداوندی بسا ہوا نہیں دنیا کے کسی امیر کبیر یا

والی سلطنت و حاکم کی شان و شوکت ایک لمحہ کے لیے خیرہ نہیں کر سکتی۔ حضرت مالک بن دینار نشۂ توحید سے ہر وقت مخمور رہتے تھے۔ انھیں کسی کی کوئی حرکت خلافِ شریعت نظر آتی تھی تو اُسے اُس کے سامنے بر ملا کہہ گذرتے اور انجام و نتیجہ کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بصرہ کا گورنر آپ کے سامنے سے گذرا، دولت و حکومت کے نشہ میں اٹھلاتا اور اکڑتا ہوا۔ حضرت مالک نے یہ دیکھ کر فوراً فرمایا "اپنی اس طرزِ رفتار کو بدل دو" حاکم بصرہ کے نوکر حضرتِ مالک کی طرف لپکے کہ انہیں اس گستاخی کی سزا دیں لیکن گورنر نے نوکروں کو منع کر دیا۔ اور خود حضرت مالک کی طرف رُخ کر کے کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ کو پہچانتے نہیں ہیں" آپ نے جواب دیا "اور جناب! مجھ سے زیادہ آپ کو جاننے والا ہے کون؟ تیرا آغاز ایک نسل پیدا کرنے والا نطفہ ہے اور تیرا انجام ایک بدبودار مردہ جسم ہے، اور آغاز و انجام کا درمیانی زمانہ تیرے کام کرنے کا زمانہ ہے، جیسا کریگا پائیگا۔ گورنر نے یہ سُن کر سر جھکا لیا اور اپنی راہ لی۔

وفات ۱۲۷ھ میں وفات پائی۔ وفات کا واقعہ بھی نہایت عبرت انگیز ہے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک شخص نے اصرار کیا کہ خواب سُنا دیجیے۔ آپ نے بیان کرنا شروع کیا۔ بیان کرتے کرتے انتہا درجہ کی رقت طاری ہوگئی، زار و قطار رونے لگے، مُنہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کو گمان ہوا جگر پھٹ گیا ہے۔ اسی عالم میں اُنھیں گھر پہنچایا گیا، کچھ دنوں تک بیمار رہے۔ دوست احباب اور عقیدتمند عیادت کے لیے آتے تھے۔ آخر کار اسی مرض میں انتقال ہوگیا۔

مرتے وقت خدا کا خوف اس درجہ غالب تھا کہ وفات سے چند لمحے پیشتر فرمایا اگر مجھ کو بدعت طرازی کے جرم کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اپنے متعلقین کو ہدایت کرتا کہ مرنے کے بعد وہ میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈالیں اور میرے ہاتھوں کو گردن کے پیچھے لیجا کر باندھ دیں۔ پھر اسی حالت میں مجھ کو دفن کر دیا جائے، تاکہ میں قیامت کے دن خدا کے سامنے حاضر ہوں تو ایک بھگوڑے غلام کی طرح حاضر ہوں۔

ابو محفوظ معروف بن فیروز الکرخیؒ[1]

نام و نسب معروف نام، ابو محفوظ کنیت، والد کا نام فیروز یا فیروزان تھا۔ بغداد میں ایک محلہ ہے کرخ، وہاں کے باشندے تھے، اس لیے کرخی کہلاتے ہیں۔

عام حالات حضرت معروف کا شمار اگرچہ علماء اور محدثین میں نہیں ہے، لیکن درحقیقت وہ بحرِ ناپیدا کنارِ روحانیت و معرفت کے ایسے کامیاب شناور تھے کہ اُن کی اس صفت کے سامنے علم ظاہر کے کمال کی کمی کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ ان کا شمار کبار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ اُن کی نظر حقیقت آشنا تھی، مجاز کے حجابات راہ میں حائل نہیں ہو سکتے تھے اُن کا علم قیاس و تخمین کی حد بندیوں سے بہت بلند، ایمان و یقین کی طمانیت بخشیوں سے

---

[1] یہ سب حالات تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۴ اور تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۳ از صفحہ ۱۹۹ تا صفحہ ۲۰۸ اور صفۃ الصفوۃ ج ۲ از صفحہ ۱۷۹ تا صفحہ ۱۸۳ سے ماخوذ ہیں۔ علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت معروف کرخی کے حالات میں الگ ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

صد آفتاب در کنار تھا۔ حضرت علی بن موسیٰ الرضا کے غلام تھے۔

بچپن | بچپن سے ہی ایسے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آگے چل کر زمانہ کی ایک نادر شخصیت بننے والے ہیں۔ ان کے والدین عیسائی تھے اپنے دستور کے مطابق انہوں نے حضرت معروف کو ایک عیسائی معلم کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ ان کا اُستاد کہتا "کہو، خدا تین معبودوں میں سے ایک معبود ہے" لیکن فرماتے "نہیں بلکہ وہ ایک ہی ہے" معلم عیسائی تھا، اور سخت متعصب۔ ایک بچہ سے اپنے عقیدہ کے خلاف یہ جملہ کس طرح سُن سکتا تھا، غضبناک ہو کر وہ انہیں سخت زد و کوب کرتا۔ کشمکش زیادہ بڑھی تو حضرت معروف اپنا گھر چھوڑ کر نکل بھاگے۔ ماں باپ کو اور خصوصاً ماں کو بیحد محبت تھی۔ فرقتِ پسر ناقابل برداشت ہو گئی تو دونوں نے کہنا شروع کیا "اے کاش معروف واپس تو آجائے، ہم بھی وہی دین اختیار کر لینگے جسے وہ اختیار کر چکا ہے۔ اور اس معاملہ میں اس کا اتباع کرینگے۔" میاں معروف کئی سال تک وادیٔ غربت میں دشت پیمائی کرتے رہے۔ توفیق خداوندی نے ہاتھ پکڑا۔ تبلیغ اسلام کے جوش نے حوصلہ دلایا، گھر کی اصلاح کے جذبہ نے ہمت کو اُبھارا، پہلے خود حضرت علی بن موسیٰ الرضا کے دستِ مبارک پر باقاعدہ مشرف باسلام ہوئے، پھر والدین کے گھر کا رُخ کیا۔ دروازہ پر پہنچ کر کُنڈی کھٹکھٹائی۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟" انہوں نے جواب دیا "میں ہوں معروف" پوچھا گیا "کس دین پر؟" بولے "علی الاسلام" اسلام پر۔ یہ سُنتے ہی ماں باپ اپنے قول کے مطابق اسلام لے آئے۔ اس طرح یہ مکتب سے بھاگا ہوا بچہ دو سنجیدہ اور عقیل و فہیم بوڑھوں کی

ہدایت کا سبب بنا۔

خوفِ خدا اُن پر خوفِ خدا کا غلبہ اس درجہ تھا اور حق یہ ہے کہ بحکم رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ یہی تمام نیکیوں اور سعادتمندیوں کا سرچشمہ ہے کہ یحییٰ بن جعفر بیان کرتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ حضرتِ معروف کو دیکھا اذان دے رہے تھے۔ جب اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہا تو مارے دہشت وخوف کے اُن کی داڑھی اور زلفوں کے بال کھڑے ہوگئے یہی وجہ تھی کہ وہ اذان دیتے اور اقامت بھی کہہ لیتے تھے لیکن نماز پڑھانے کی جرأت کبھی نہیں کرتے تھے۔"

دنیا سے بے رغبتی جس شخص کے دل میں خشیتِ ربّانی نے استیلا پالیا ہو۔ اس کی نظر میں دنیوی لذائذ ومرغوبات کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ حضرت معروف بھی دنیا سے بالکل بے تعلق رہتے تھے۔ انتہا یہ ہے۔ اُن کی وفات ہونے لگی تو لوگوں نے اصرار کیا کچھ وصیت کیجیے۔ فرمایا "میں مرجاؤں تو میری قمیص کا بھی صدقہ کردینا میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو جس طرح یہاں برہنہ آیا تھا۔ اسی طرح یہاں سے بھی برہنہ ہوکر جاؤں"۔ سری سقطیؒ جو خود اکابر فقہاءِ اسلام میں شامل ہیں، انھوں نے ایک مرتبہ حضرتِ معروف سے سوال کیا لوگ کب اللہ کی پوری اطاعت پر قادر ہوسکتے ہیں؟" ارشاد ہوا "اُس وقت جبکہ دنیا کی محبت اُن کے دلوں سے خارج ہوجائے۔ اگر دنیا کی محبت سے اُن کے دل فارغ نہیں ہیں تو اُن کا ایک سجدہ بھی درست نہیں ہوسکتا"۔ وہ عمر کے ایک لمحہ کو بھی ضائع دیکھنا

استغراق فی التوحید کمالِ توحید یہ ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات میں صرف خدا کی طرف

رجوع کرے۔ اور اُس کے ماسوا کسی اور سے اپنی کوئی حاجت متعلق نہ سمجھے حضرت معروف ایک دفعہ کوفہ کے بازار سے گذر رہے تھے، وہاں اُنہوں نے دیکھا کہ اُس عہد کے مشہور واعظ ابن السماک وعظ کہہ رہے ہیں۔ یہ بھی سُننے کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت ابن السماک کہہ رہے تھے "جو شخص اللہ سے بالکل اعراض کرتا ہے۔ اللہ اُس سے بالکل اعراض کرلیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی طرف اپنے دل سے متوجہ ہوتا ہے۔ اللہ بھی اُس کی جانب کامل التفات فرماتا ہے۔ اور جو شخص کبھی کبھی اللہ کو یاد کرلیتا ہے۔ اللہ بھی اُسے کبھی کبھی یاد کرتا ہے"۔ حضرت معروف کرخی کا بیان ہے "میں اس وعظ سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اور میں نے آئندہ کے لیے عزم بالجزم کرلیا کہ اب اپنے مولیٰ حضرت علی بن موسیٰ الرضا کی خدمت کے علاوہ دنیا کی کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کرونگا اور ہمہ تن خدا کی طرف ہی متوجہ رہونگا یہاں سے روانہ ہو کر میں حضرت علی بن موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کو یہ پوری سرگذشت سُنائی تو اُنہوں نے فرمایا "اگر آپ نصیحت پذیر ہونا چاہیں تو یہی ایک نصیحت آپ کے لیے بہت کافی ہے" واقعات سے ثابت ہے کہ حضرت معروف کی تمام زندگی اس اثر سے آخر دم تک روشن رہی اور وہ فنا فی التوحید کے جام جاں نواز سے ایسے سرشار و مست ہوئے کہ غیر اللہ سے انہیں کوئی علاقہ ہی نہیں رہا۔

ایک شخص نے اُن سے کسی نصیحت کی درخواست کی، آپ نے فرمایا "اللہ پر توکل کرو، یہاں تک کہ وہ تمہارا جلیس و انیس بن جائے۔ اور وہی تمہاری شکایتوں کا مرجع ہو اور تم موت کا ذکر زیادہ کرو جس کی وجہ سے تمہارا جلیس سوائے خدا کے کوئی اور ہو ہی نہ سکے

اور ہاں یہ سمجھ لو کہ لوگ تم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر۔ وہ تم کو کوئی چیز دے سکتے ہیں اور نہ کسی چیز سے منع کر سکتے ہیں۔

رحمتِ خداوندی پر بھروسہ اس فنا فی التوحید کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ خدا کی رحمت کے تصور سے بار بار اپنے دل کو تسکین دیتے اور یاس و ناامیدی کو غالب نہیں ہونے دیتے تھے وہ بسا اوقات علی الصباح اُٹھ کر یہ شعر پڑھتے تھے۔

ای شیٔ ترید منی الذنوب　　　شغفت بی فلیس عنی تغیب

ما یضر الذنوب لو اعتقتنی　　　رحمۃ لی فقد علانی المشیب

ترجمہ:۔ ان گناہوں نے آخر میرے متعلق ارادہ کس چیز کا کیا ہے۔ یہ مجھ سے چمٹ گئے ہیں اور غائب نہیں ہوتے، اچھا! اگر اللہ کی رحمت نے مجھ کو آزاد کر دیا تو اب جبکہ مجھ پر بڑھاپا غالب ہو گیا ہے، یہ گناہ مجھ کو کیا نقصان پہنچا سکینگے۔

دعاءِ خیر دوسروں کو اگر بُرے کاموں میں مبتلا دیکھتے، تو اُن کے حق میں دعاءِ بد نہیں بلکہ ہمیشہ دعاءِ خیر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے چند رنگین مزاج نوجوان ایک کشتی میں بیٹھے ہوئے گاتے بجاتے اور شراب کے جام چھلکاتے ہوئے گذر رہے تھے۔ یہ منظر اندوہگیں دیکھ کر آپ کے ساتھیوں نے کہا "حضرت! آپ ملاحظہ نہیں فرماتے، یہ لوگ پانی میں اللہ کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ آپ ان کے حق میں دعاءِ بد کیجیے"۔ حضرت معروف کرخیؒ نے آسمان کی جانب ہاتھ اُٹھائے اور یہ دعا کی "خدائے میرے معبود، اے میرے آقا و مولا، میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو ان کو جنت کی

مسرتیں بھی اسی طرح عنایت فرما جس طرح تو نے ان کے لیے دنیا کی مسرتیں ارزاں کر رکھی ہیں" آپ کے ساتھیوں نے کہا "ہم نے تو آپ سے عرض کی تھی" ان کم بختوں کے لیے دعائے بد کیجیے" آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ جب آخرت میں ان کے لیے سامانِ فرحت و انبساط مہیا کر دیگا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اُس نے دنیا میں اُن کے گناہ معاف کر دیے ہیں (اس سے ان غریبوں کا بھلا ہو جائیگا) اور تمہیں کوئی نقصان پہنچیگا نہیں"۔

عبادت کا اخفا | شب روز عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے لیکن اُس کا اظہار نہ کرتے تھے اور حتی الوسع اُسے مخفی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ واقعی طور پر صائم النہار اور قائم اللیل تھے۔ اُن کے مرضِ وفات میں ایک دفعہ ایک شخص نے اُن سے پوچھا "آپ اپنے روزوں کی نسبت مجھ سے کچھ بیان فرمائیے"، کہنے لگے "حضرت عیسیٰؑ ایسا ایسا روزہ رکھتے تھے" سائل بولا "میں آپ کے روزہ سے متعلق سوال کرتا ہوں"، فرمایا "حضرت داؤدؑ اس اس طرح روزہ رکھتے تھے"، پھر سائل نے وہی کہا کہ میں تو آپ کے روزوں کی نسبت پوچھ رہا ہوں۔ آپ نے جواب دیا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اس طرح روزہ رکھتے تھے"۔ اس مرتبہ سائل نے پھر اسی سوال کا اعادہ کیا تو آپ نے فرمایا "رہا میں! تو ہمیشہ روزہ سے رہتا تھا، لیکن اگر کوئی شخص میری دعوت کرتا تو میں کھانا کھا لیتا تھا اور یہ نہیں کہتا تھا کہ میں روزہ سے ہوں"۔

محمد بن منصور کی روایت ہے کہ میں نے ایک دن حضرت معروف کی خدمت میں حاضر ہو کر دیکھا کہ اُن کے چہرہ پر زخم کا کوئی نشان ہے، میں نے چاہا کہ اُن سے اس کی وجہ

دریافت کروں، لیکن ان کے رعب و جلال کی وجہ سے ہمت نہ ہوئی۔ ان کے پاس ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو مجھ سے زیادہ جری تھا، اس سے نہ رہا گیا، اور اس زخم کا سبب پوچھ ہی بیٹھا۔ حضرت معروف نے بات کو ٹالنے کے لیے فرمایا" بھائی تم اپنا کام کرو۔ اس نوع کے سوالات سے تم کو کیا فائدہ پہنچے گا" اس نے دوبارہ پھر اصرار کیا۔ اس مرتبہ بھی حضرت معروف نے وہی جواب دیا۔ مگر جب تیسری مرتبہ اس نے سوال کیا اور زیادہ اصرار کے ساتھ، تو اب آپ کو فرمانا پڑا" میں گذشتہ رات بیت اللہ الحرام چلا گیا تھا۔ جب بیرِ زمزم پر پانی پینے کے لیے حاضر ہوا تو وہاں میرا پاؤں پھسل گیا اور میرا چہرہ دروازہ سے ٹکرا گیا۔ یہ نشان اسی وجہ سے ہے"

اس واقعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معروف صاحبِ کرامت بزرگ تھے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے احوال و مزایا کا اخفا بہت کرتے تھے

مقبولیتِ دعاء | وہ مستجاب الدعاء تھے۔ ان کے زمانہ میں ایک شخص خلیل الصیاد نامی تھے۔ ان کا بیٹا ایک دفعہ گھر سے نکل کر انبار پہنچ گیا۔ ماں بہت پریشان تھی۔ خلیل نے حضرت معروف کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا ماجرا سنایا اور لڑکے کی واپسی کے لیے دعاء کی درخواست پیش کی۔ آپ نے دعاء کی" اے اللہ! کوئی شبہ نہیں آسمان، تیرا آسمان ہے، اور زمین تیری زمین ہے، اور جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے وہ بھی تیرا ہی ہے، تو اس لڑکے کو یہاں پہنچا دے" خلیل کہتے ہیں "میں اس کے بعد باب الشام تک ہی آیا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ لڑکا کھڑا ہوا ہے"

رحمتِ خداوندی کی جستجو اور طلب | ہمیشہ رحمت ایزدی کی طلب و جستجو میں سرگرم رہتے تھے ایک مرتبہ ایک

سقہ کے پاس سے گذر رہے تھے وہ کہہ رہا تھا " اللہ اُس پر رحم کرے جو اس پانی کو پی کر جائے "
حضرتِ معروف اُس وقت روزہ سے تھے لیکن یہ سُن کر آگے بڑھے اور پانی پی کر فرمانے
لگے " کیا عجب ہے اللہ تعالیٰ اس سقہ کی دعار کو ہی قبول فرمالے "

شفقت علی الخلق | اخلاق فاضلہ میں سے ایک بڑا خلق یہ ہے کہ انسان کے دل میں اپنے
ہم جنسوں کے لیے جذبہ محبت وانسیت ہو اور وہ اُن کے دکھ درد میں پورا شریک بنا رہے۔
حضرت معروف کی ذات اس خلق عظیم سے بھی بہرۂ وافر رکھتی تھی، حضرت سِرّی فرماتے تھے
" تم مجھ میں جو کچھ دیکھتے ہو وہ سب حضرت معروف کی برکات ہیں ۔ میں ایک مرتبہ عید کی نماز
سے واپس آرہا تھا کہ راستہ میں حضرت معروف مل گئے ۔ اُن کے ساتھ ایک لڑکا تھا، پراگندہ
مو، آشفتہ رو ۔ میں نے پوچھا " حضرت ! یہ کون ہے ؟ " ارشاد ہوا " سب بچے کھیل رہے تھے
یہ غریب دلگرفتگی کے ساتھ ایک طرف الگ کھڑا ہوا تھا ۔ میں نے اُس سے پوچھا " میاں
تم کیوں نہیں کھیلتے " ، بچہ بولا " میں یتیم ہوں " یہ سُن کر حضرت معروف نے بچہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے
ساتھ لے آئے ۔ وہ اس سے بڑی محبت کرتے تھے اور اُس کی دلجوئی کے لیے اخروٹ اور
بادام کے مغز جمع رکھتے تھے "

علم وفضل | حضرت معروف کا شمار اگرچہ کبار اولیار اللہ میں ہوتا ہے اور وہ زیادہ تر اسی حیثیت
سے روشناس ہیں لیکن علم لدنی اور معرفت روحانی کے علاوہ وہ علم ظاہر میں بھی کم نہیں تھے
علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ حضرت یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل اُن کے پاس آکر
(مسئلے مسائل یا احادیث) لکھتے تھے لیکن حق یہ ہے جس کا آئینہ قلب جمال حقیقت کی ضیا پاشیوں

سے عکس پذیر ہو رہا ہو اُس کے لیے علوم رسمیہ وظاہریہ کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر انہیں ان چیزوں کی کمی پائی بھی جائے تو اُس کے کمالاتِ معنوی وروحانی کے مقابلہ میں وہ چنداں قابل اعتنا نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کی مجلس میں حضرت معروف کا ذکر آیا۔ ایک شخص بول اُٹھا "وہ تو کوتاہ علم ہیں" امام احمد کو یہ سُنکر تابِ سکوت نہ رہی۔ آپ نے فرمایا "اے شخص خاموش رہ! خدا تجھ کو معاف کرے۔ حضرت معروف جن حقیقتوں سے آشنا ہیں کیا علم کا مقصد اُن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟" ایک دفعہ امام احمد بن حنبل کے صاحبزادہ نے اپنے پدر بزرگوار سے پوچھا "کیا حضرت معروف عالم بھی تھے؟" آپ نے ارشاد فرمایا "اے بیٹے! کَانَ مَعَہٗ رَاسُ الْعِلْمِ، خَشْیَۃُ اللّٰہِ" اُن کے پاس تو علم کی جڑ تھی یعنی خدا کا خوف۔

کرامات وفیاضی علامہ بغدادی نے "کرامات معروف" کا ایک مستقل عنوان قائم کر کے حضرت معروف کرخی کے چند حیرت انگیز واقعات نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہا درجہ کے فیاض، سیر چشم، ہمدردِ خلائق، اور مصیبت زدوں کے مددو معاون تھے۔ ابو العباس المؤدب بیان کرتے ہیں کہ میرے پڑوس میں ایک ہاشمی رہتا تھا۔ یہ غریب نہایت مفلوک الحال اور عسرت زدہ تھا، ایک دن اس کے گھر میں ایک بچہ کی ولادت ہوئی۔ بیوی نے تنگ آکر کہا "اس وقت میری جو کچھ حالت ہے تم پر اچھی طرح روشن ہے۔ صبح کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور میری ناطاقتی حد سے زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ

کھاؤں؟" اس وقت رات زیادہ گذر چکی تھی۔ توکل بخدا یہ غریب ہاشمی طلبِ رزق میں اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ایک بقال کے پاس آیا۔ اُس کو اپنی داستانِ مصیبت سنائی اور بطور قرض کچھ چیزیں طلب کیں۔ ہاشمی بقال کا پہلے سے مقروض تھا۔ اُس نے مزید قرض دینے سے انکار کر دیا۔ یہاں سے مایوس و ناکام ہو کر ہاشمی غریب نے ایک دوسرے بقال کی دوکان کا رُخ کیا۔ اس سے پہلے سے کچھ جان پہچان تھی لیکن یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ اب اس حسرت زدہ و ناکام کی سراسیمگی و پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ نظر آتی تھی اور کوئی تدبیر اس فشارِ الم سے بچنے کی سمجھ میں آتی تھی، اسی عالمِ حیرت و بیخودی میں دریائے دجلہ کی طرف رُخ کر دیا۔ لبِ ساحل پہنچ کر سنا کہ ملاح بغداد کے مختلف محلوں کا نام لے لے کر پکار رہا ہے کہ کسی کو ان محلوں میں سے کسی محلہ میں جانا ہو تو کشتی میں آجائے۔ ہاشمی نے ملاح کو آواز دی۔ اُس نے اپنی کشتی کنارے سے لگا دی۔ ملاح نے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟" ہاشمی بولا "مجھ کو پتہ نہیں" ملاح کہنے لگا میں نے تم سے زیادہ عجیب و غریب کوئی شخص آج تک نہیں دیکھا۔ ایسے ناوقت میں تم کو اپنی کشتی میں بٹھا کر لیجا رہا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ کہاں جاؤ گے۔ تم جواب دیتے ہو "مجھے معلوم نہیں" مظلومیت کے احساس نے دل و جگر کو محرومی و ناکامی کے دھوئیں سے دخان زار بنا دیا آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور ہاشمی نے مجبور ہو کر ملاح کو بھی اپنی داستانِ غم کہہ سنائی۔ ملاح کا دل پسیج اُٹھا، اور اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں اصحاب السلاح کے محلہ میں پہنچائے دیتا ہوں، وہاں اُمید ہے تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی چنانچہ ملاح

ہاشمی کو لے کر اصحاب الساج محلہ کی ایک مسجد میں آیا جہاں حضرت معروف کرخی تشریف رکھتے تھے۔ ہاشمی نے ملاح کی ہدایت کے بموجب وضو کیا، اور مسجد میں داخل ہو کر حضرت معروف کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا حضرت معروف اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد وہ ہاشمی کی طرف متوجہ ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد آپ نے حال پوچھا، اور یہاں ایسے وقت میں آنے کی وجہ دریافت کی۔ ہاشمی نے اپنا پورا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے یہ سُن کر پھر اپنی نماز شروع کر دی اتنے میں بادل آئے اور اس زور کی بارش برسی کہ جل تھل بھر گئے مفلسی میں آٹا گیلا۔ بیچارے ہاشمی کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ بیوی کو مفلسانہ زچگی کے عالم بیکسی میں تنہا چھوڑ کر آیا تھا مقصد ابھی تک حاصل نہیں ہوا تھا کہ رات تیرہ و تار، مسافت بعید، اور بارش موسلا دھار اب غریب کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ فقر و فاقہ کے ساتھ ہی سہی اپنی بیوی کے پاس تو پہنچ جائے۔ ہاشمی کا توسنِ فکر و خیال فرطِ غم والم میں انہی افکار پریشاں کے تھپیڑوں سے کھیل رہا تھا کہ یکایک مسجد کے دروازہ پر کسی سواری کی آہٹ محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے بعد ہی دیکھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، اور حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا "میں فلاں شخص کا بھیجا ہوا قاصد ہوں۔ وہ صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں، اور کہتے ہیں "میں اپنے بستر پر سو رہا تھا جسم پر فقط بنیان تھا، کہ ناگاہ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنے اوپر اللہ کی ایک بڑی نعمت دیکھی۔ اب میں اُسی رب کے شکرانہ میں آپ کے پاس یہ پانسو دینار کی ایک تھیلی بھیج رہا ہوں، آپ اسے مستحقین میں تقسیم

کر دیجیے، حضرت معروف نے قاصد سے فرمایا "تم یہ تھیلی ان کو (ہاشمی کو) دیدو" قاصد نے حکم کی تعمیل کی۔ ہاشمی نے خوش ہو کر یہ تھیلی کمر سے باندھی، اور کیچڑ اور گارے میں گھستا، چلتا پھرتا بڑی مشکل سے بقال کی دکان پر آیا، اور یہاں سے شہد، شکر، خیرہ، چاول، اور روغن لے کر گھر آیا یہاں بیوی شدت انتظار میں جاں بلب ہو گئی تھی۔ ہاشمی کو دیکھتے ہی بُرا بھلا کہنے لگی تب ہاشمی نے اپنی پوری سرگذشت سُنائی جس سے بیوی کی جان میں جان آئی۔ دونوں نے مل کر حضرت معروف کرخی کو دعائیں دی۔ ہاشمی نے ان دنانیر سے ایک جائداد خرید لی فقر و مصیبت کے دن ختم ہوئے۔ اور پہلے جس گھر میں فلاکت و افلاس کا دور دورہ تھا وہ اب مسرت و شادمانی کا گہوارہ بن گیا"

اسی طرح کا ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا "رات میرے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس بچہ کی نگاہ آپ پر پڑے اور وہ میرے لیے سرمایۂ سعادت و برکت ہو۔ حضرت معروف نے فرمایا "تم سو مرتبہ "ما شاء اللہ کان" پڑھو۔ یہ شخص سو مرتبہ پڑھ چکا تو آپ نے پھر دوبارہ اس کو سو مرتبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح اس شخص نے پانسو مرتبہ یہ وظیفہ پڑھا جس دفعہ یہ وظیفہ تمام ہوا ہی تھا کہ خلیفہ ہارون رشید کی مشہور بیوی زبیدہ کا ایک نوکر پانسو درہم کی ایک تھیلی لیے ہوئے حاضر ہوا۔ اور ملکہ کی طرف سے سلام و پیام پہنچاتے ہوئے کہنے لگا آپ ان دراہم کو مستحقین میں تقسیم کر دیجیے۔ حضرت معروف نے یہ تھیلی سب کی سب اس شخص کو دیدی، اور فرمایا "اگر تم وظیفہ پانسو مرتبہ سے زیادہ پڑھتے تو تمہیں روپیہ بھی اس سے

زیادہ ملتا۔

اسی سلسلہ میں ایک پُرلطف و عجیب یہ واقعہ ہے کہ حضرت معروف کے خاندان میں کوئی تقریب شادی تھی۔ ان کے بھائی نے ان کو دکان پر بٹھا دیا تاکہ وہ اُس کی رکھوالی اور نگرانی کریں۔ یہاں سائلوں کا تانتا بندھ گیا، اور حضرت معروف کسی سائل کو رد کرنا جانتے نہیں تھے جو آیا اور اُس نے جتنا مانگا وہ اُس کے حوالہ کر دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دکان آٹے سے خالی ہوگئی۔ حضرت معروف کے بھائیوں نے پوچھا "آٹا کیا ہوا؟" آپ نے فرمایا "بتاؤ آٹا کتنے کا تھا۔ وہ دیکھو اُس صندوق میں اُس کی تمام قیمت محفوظ ہے۔ حضرت معروف کے بھائیوں نے صندوق کھول کر دیکھا تو واقعی اُس میں تمام آٹے کی قیمت جمع تھی۔

ایک یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو محمد بن منصور الطوسی کا خود بیان کیا ہوا ہے۔ کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ روزہ رکھا اور عہد یہ کیا کہ سوائے مال طیب کے کسی اور چیز سے روزہ افطار نہیں کرونگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پے بہ پے تین دن گذر گیے اور مجھ کو روزہ افطار کرنے کے لیے کوئی طیب چیز نہیں ملی۔ جب چوتھا دن ہوا تو میں نے دل میں عزم بالجزم کیا کہ آج شب کو کسی بزرگ کے ہاں جا کر جن کا کھانا سر بسر حلال و طیب ہو روزہ افطار کرونگا، چنانچہ میں حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہوا، انہیں سلام کیا، اور پاس ہی جا کر بیٹھ گیا۔ آپ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد مسجد سے باہر آئے تو میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے طوسی! تم اپنے بھائی کے پاس جاؤ اور شب کا کھانا بھی اُن کے ساتھ ہی کھاؤ" طوسی کا بیان ہے "میں نے اپنے دل میں کہا کہ چار دن تو ہو گیے

مسلسل روزہ رکھتے ہوئے اور اب بھی پتہ نہیں کہ کھانا کس قسم کا کھانا پڑیگا حضرت معروف کرخی سے میں نے عرض کیا "حضرت! میرے پاس طعام شب ہے کہاں!" لیکن آپ نے میرے کہنے پر کچھ توجہ نہیں کی اور پھر اسی بات کا اعادہ کیا۔ میں نے بھی اُس کے جواب میں وہی کہا۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا، تیسری بار پھر یہی گفتگو ہوئی تو حضرت معروف میرا جواب سُن کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہے، اور اس کے بعد ارشاد فرمایا "اچھا تم میرے پاس آؤ" میں ضعف و نقاہت کی وجہ سے بیدم ہو رہا تھا، بہ مشکل تمام اُٹھا اور حضرت کرخی کے بائیں جانب جاکر بیٹھ گیا۔ حضرت معروف نے میرا داہنا ہاتھ پکڑا اور اُس کو اپنے بائیں ہاتھ کی آستین میں داخل کر دیا۔ مجھ کو آستین میں ایک سفرجل ملا جس پر دانت سے کاٹنے کے نشانات تھے۔ میں نے اُسے کھایا تو اُس کا ذائقہ عجیب و غریب تھا۔ میں نے آج تک اس طرح کا کوئی میوہ نہیں کھایا۔ اور اس میوہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اُسے کھا کر میں پانی سے مستغنی ہو گیا۔"

ہر دلعزیزی حضرت معروف اپنے باطنی و روحانی کمالات کی وجہ سے اس درجہ ہر دلعزیز تھے کہ لوگ اپنے بچوں کا نام ان کے نام پر رکھتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ شرف ہمنامی سے برکت حاصل کریں۔ حضرت سفیان بن عیینہ کی خدمت میں بغداد کا ایک وفد حاضر ہوا، آپ نے اُس سے پوچھا "کہاں سے آئے ہو" اُنھوں نے جواب دیا "بغداد سے" بغداد کا نام سُن کر آپ نے دریافت کیا "تمہارے عالم اجل کا کیا حال ہے؟" اہل وفد نے پوچھا "وہ کون؟" حضرت سفیان نے فرمایا "ابو محفوظ معروف" بغدادیوں نے کہا "وہ

بخیریت ہیں" حضرت سفیان نے ارشاد فرمایا "جب تک وہ بغداد میں رہینگے اہل بغداد بخیریت رہینگے"

وفات ۲۰۰ھ یا ۲۰۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ بغداد میں ان کا مزار پرانوار بہت مشہور ہے، لوگ اُس سے برکت وسعادت حاصل کرتے ہیں۔ ابراہیم الحربی کا بیان ہے "معروف کی قبر ایک آزمودہ تریاق ہے"۔

ابو بشر صالح بن بشیر المری

نام ونسب صالح نام، ابو بشیر کنیت، والد کا نام بشیر تھا جو عربی الاصل تھے لیکن ان کی ماں خراسانی تھیں اور نام میمونہ تھا۔ صالح بنو مرہ بن الحارث کی ایک عورت کے مملوک غلام تھے ان کی مالکہ نہایت نیک بخت اور ستودہ صفات خاتون تھیں۔ صالح کو بچپن میں ہی تعلیم کے لیے ایک کندی شخص کے مکتب میں داخل کر دیا تھا۔ وہاں ایک دن صالح کی مکتب کے کسی بچہ سے لڑائی ہوگئی۔ بچہ کے باپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو غصہ میں بھرا ہوا مکتب میں آیا، صالح کے بال پکڑ کر زدوکوب کیا، اور گالی دیتے ہوئے کہا "اے غلام خبیث" صالح کو اتنا مارا کہ اُن کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ یہ روتے ہوئے اپنی مالکہ کے پاس آئے اور ساری داستان کہہ سُنائی۔ مالکہ کو ان کی حالتِ زار پر رحم آگیا، اور اس نے ان کو اور ان کے بھائی کو دونوں کو آزاد کر دیا[1]۔

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۳۰۷۔

تحصیل علم | جیساکہ اوپر گذر چکا ہے، صالح بچپن میں ہی تعلیم کے لیے ایک مکتب میں بٹھا دیے گئے تھے۔ یہاں اُس زمانہ کے دستور کے مطابق انہوں نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی، پھر بڑے بڑے محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے حدیث کا سماع کیا۔
چنانچہ انہوں نے جن بزرگوں سے روایت کی ہے ان میں یہ حضرات بھی ہیں، حسن بصری ابن سیرین، قتادہ، ہشام بن حسان، سعید الجریری، ابو عمران الجونی، سلیمان التیمی لیکن حق یہ ہے کہ حدیث ان کا خاص فن نہیں تھا۔ اور نہ یہ اس اعتبار سے اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ امام بخاری اور ابن عدی ان کو منکر الحدیث قرار دیتے ہیں اور ابن حبان نے انہیں ضعفا میں شمار کیا ہے[1]۔

زہد و اتقاء | ان کا اصل زیور اور طغرائے امتیاز زہد و اتقاء، خشیۃ ربانی، اور وعظ گوئی تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ حدیث میں ثقاتِ محدثین کا مرتبۂ عظمیٰ حاصل نہیں کر سکے۔ ابنِ حبان کا بیان ہے "صالح بن بشیر المری بصرہ کے بڑے عبادت گذار اور مشہور قاریوں میں سے تھے، اور یہ وہی ہیں جن کو صالح بن بشیر الناجی کہا جاتا ہے۔ ان کی آواز میں بڑا درد تھا، اور ان کی قرأت بڑی اثر انگیز ہوتی تھی۔ ان پر خیر و صلاح کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ حفظ حدیث میں پختگی حاصل کرنے سے بھی تغافل کرتے تھے۔ اور حسن اور ثابت البنانی اور اسی نوع کے دوسرے اصحاب سے محض توہم کی بنا پر روایتیں نقل کر دیتے تھے۔ اسی بنا پر ابو اسحاق الحربی نے کہا ہے" اگر صالح بن بشیر کسی روایت کو بیان کرتے وقت ارسال کریں یعنی

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۸۲، ۳۸۳

یعنی اصل راوی کا نام نہ بتائیں تو ممکن ہے انہوں نے صحیح حدیث بیان کی ہو، ورنہ اسناد نقل کریں تو ان سے بچنا چاہیے[1]۔"

خوفِ خدا | ان پر خوفِ خدا کا بیحد غلبہ تھا۔ عفان کا بیان ہے: "کان شدید الخوف من اللہ کثیر البکاء"[2] ایک مرتبہ انہوں نے خود بیان کیا "رونے کے بہت سے اسباب ہیں ان میں سے ایک سبب اپنے گناہوں کا خیال اور ان میں غور و فکر ہے۔ اگر نفس اس غور و فکر سے ہی گناہوں سے باز آجائے تو سبحان اللہ! ورنہ پھر تم اس کو روزِ محشر کی یاد دلاؤ۔ دوسرا سبب قیامت کے شدائد و محن کا تصور ہے۔ اگر نفس اسی سے نصیحت پذیر ہو جائے تو خیر! ورنہ پھر تم یاد کرو اس وقت کیا حالت ہوگی جبکہ تم کو دوزخ کے طبقات میں الٹ پلٹ ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائیگا" حضرتِ صالح نے اتنا ہی کہا تھا کہ ان پر رقت طاری ہوگئی، دہاڑیں مار مار کر رونے لگے، اور بیہوش ہوگئے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر مسجد کے گوشوں میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی چیخ اٹھے اور مسجد کا صحن ایک عرصۂ آہ و بکا بن گیا[2]۔

وعظ گوئی | چونکہ وہ خود بڑے صاحب باطن اور اہل دل تھے، اور ہر وقت خدا کی عظمت وجلالت کے تصور سے ان پر کیفیت خوف و فزع طاری رہتی تھی اس لیے ان کے وعظ میں بھی بڑا اثر ہوتا تھا۔ منہ سے جو بات نکلتی تھی سامعین کے دل پر تیر و سناں کا کام کرتی تھی حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی بیان کرتے ہیں "میں کبھی کبھی حضرت سفیان کے سامنے صالح کا ذکر کرتا تھا تو کہتے تھے "ہاں! صالح ایک اچھے قصہ گو ہیں" اور یہ کچھ اس انداز سے کہتے تھے

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۳۰۸ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۲۶۶۔

جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ میں اور وہ دونوں علی الصباح بیدار ہو کر کسی ضرورت سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، چلتے چلتے ہمارا گذر اس مسجد سے ہوا جس میں صالح فجر کی نماز کے بعد وعظ بیان کرتے تھے۔ میں نے حضرت سفیان سے کہا "آیئے اس مسجد میں نماز پڑھ لیں" وہ راضی ہو گئے، ہم دونوں نے مسجد میں نماز ادا کی نماز سے فراغت کے بعد حضرت صالح کا وعظ سننے کے لیے لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ ہم اپنی جگہ سے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں حضرت صالح تشریف لائے، اور وعظ شروع کیا، وہ وعظ کیا تھا! بلا کے اثر اور درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے سن کر حضرت سفیان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، بے قابو ہو کر رونے لگے۔ جب مجلس وعظ برخاست ہو گئی تو میں نے حضرت سفیان سے پوچھا "فرمائیے اب آپ صالح کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟" بولے "یہ تو قصہ گو نہیں بلکہ قوم کے نذیر یعنی قوم کو ڈرانے والے ہیں"[1]

عفان بن مسلم بیان کرتے ہیں "ہم لوگ حضرت صالح کی مجلس وعظ میں شریک ہو کر ان کا وعظ سنتے تھے، تو وہ اپنے حزن و غم اور فرطِ گریہ و بکا کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا وہ انتہائی خوف زدہ ہیں ان کا گریہ اس غم رسیدہ ماں کے گریہ کی طرح ہوتا تھا جو اپنے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے دنیا میں اکیلی چھوڑ دی گئی ہو"[2]

امر بالمعروف حضرتِ صالح حق کہنے اور امر بالمعروف میں نہایت جری اور بیباک تھے۔

---

[1] صفۃ الصفوہ ج ۳ ص ۳۶۵ [2] تاریخ بغدادی ج ۹ ص ۳۰۸۔

بڑے سے بڑے بادشاہ یا امیر کی سطوت وشوکت انہیں اعلانِ حق سے باز نہیں رکھ سکتی
تھی، ان کے عہد کا خلیفۂ وقت مہدی ان کی بڑی توقیر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ
آپ مہدی کی دعوت پر شاہی محل میں تشریف لائے تو سواری پر سوار تھے۔ مہدی نے
آپ کو دیکھتے ہی اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون کو جو ولی عہد تھے حکم دیا "تم دونوں
کھڑے ہو جاؤ اور آگے بڑھ کر اپنے چچا (صالح المری) کو سواری سے اتارو" دونوں بیٹوں
نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ حضرت صالح کے قریب پہنچے تو حضرت صالح اپنے
نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور دل میں کہنے لگے "اے صالح! اگر تو نے یہ تمام اعمال خیر
صلاح اسی دن کے لیے کیے تھے تو یقیناً تو ہلاک و برباد ہو گیا"

حضرتِ صالح مہدی کی اس غیر معمولی توقیر و تعظیم سے ذرا متاثر نہ تھے۔ اور کلمۂ حق
وخیر کہنے میں کبھی پس و پیش نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ مہدی کے پاس تشریف لے گئے
جبکہ وہ بغداد کے محلہ رصافہ میں قیام پذیر تھا۔ آپ نے اس کے سامنے پہنچتے ہی کہنا
شروع کیا۔

"اے امیر المومنین! میں آج جو کچھ آپ سے کہنا چاہتا ہوں آپ اسے ذرا صبر و
تحمل سے سنیے۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک بہتر وہی شخص ہے جو سخت سے سخت نصیحت کی
بات سن کر بھی چین بجبیں نہ ہو۔ اور پھر جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرفِ
قرابت رکھتا ہو اس کے لیے تو اور بھی سزاوار ہے کہ وہ اخلاقِ نبوی کا حامل ہو اور آپ
کے مسلک پر چلے، اور اس پر طرفہ یہ ہے کہ خدا نے آپ کو علم کی سمجھ اور حجت کی روشنی کی

ایک ایسی میراث عطا فرمائی ہے جس کے بعد آپ کے لیے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پس یاد رکھیے آپ جب کبھی کسی ایسی حجت کا دعویٰ کریں۔ یا کسی ایسے شبہ میں مبتلا ہو جائیں جس کے مقابلہ میں اللہ کی برہان صحیح نہ ہو اور اُس کے ساتھ تطبیق نہ پا سکے۔ تو آپ کے تجاہل علمی کے بقدر اللہ کی ناراضگی آپ پر نازل ہوگی، اور آپ جان لیجیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فریق مخالف ہونگے اُس شخص کے جو آپ کی اُمت میں ہونے کے باوجود آپ کی مخالفت کرے۔ اور شریعت محمدیہ میں قطع و برید سے کام لے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شخص کے خصم ہوں پس سمجھ لو کہ اللہ بھی اُس کا خصم (فریق مخالف) ہوگا۔ اگر تم اللہ اور اُس کے رسول کی مخاصمت کی تاب لا سکتے ہو تو اس کے لیے ایسے دلائل و براہین کا انتظام کرلو جو تم کو نجات دلا سکیں اور ہلاکتوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور یاد رکھو سب سے زیادہ بدبخت وہ انسان ہے جو اپنی خواہشات کا کشتہ ہو اور اُس نے اُن خواہشات کی تکمیل تقرب الی اللہ کے بہانہ سے کی ہو۔ اس کے برخلاف قیامت کے دن اُس شخص کا قدم بڑی مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما رہیگا جو کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمسک میں سب سے زیادہ قوی اور مستعد ثابت ہوگا۔ آپ جیسا بلند مرتبت بادشاہ اگر کسی معصیت کا ارتکاب کرے تو کوئی شخص اُس کو منع کرنے والا نہیں ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ کی برائیوں کو بھی اچھائی بنا کر پیش کیا جائیگا۔ اور جو خیانت شعار علماء ہیں وہ آپ کے افعال نازیبا کے استحسان کے دلائل بیان کرینگے، اور یہ وہ زبردست جال ہے جس کے ذریعہ دنیا آپ ایسے لوگوں کا شکار کرلیتی

ہے" آخر میں آپ نے فرمایا "اے امیر المومنین آپ میری نصیحتوں کو برداشت کیجیے میں نے
ان کے بیان کرنے کا حق ادا کر دیا ہے"

مہدی پر حضرت صالح کی اس پُر موعظت و نصیحت تقریر کا بیحد اثر ہوا اور وہ رونے
لگا۔ مہدی نے اس وعظ کو سُننے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اُس کو لکھوا کر سرکاری دفتروں میں
محفوظ کرا دیا۔[1]

حضرت صالح وعظ و نصیحت میں اس درجہ انہماک رکھتے تھے کہ وہ کسی موقع پر
بھی اس سے تساہل نہیں برتتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے کسی ملاقاتی یا دوست کے
بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ آپ اُس کے پاس تعزیت کے لیے تشریف لے گیے، اور وہاں
پہنچ کر فرمایا "اگر اس مصیبت (مرگ پسر) نے آپ کے نفس میں کوئی عبرت اور بیداری
پیدا نہیں کی ہے تو سمجھ لیجیے آپ کے نفس کی مصیبت بیٹے کی موت کی مصیبت سے
زیادہ ہے، پس اُسی کو رونا چاہیے۔[2]

بغداد میں ورود اور درس حدیث | حضرت صالح بصرہ کے رہنے والے تھے وہیں اُنھوں نے نشو و
نما پائی۔ اور علم حاصل کیا۔ مہدی نے ان کی شہرت سُنی تو اُنھیں بغداد بلا لیا، جہاں اُنھوں
نے حدیث کا درس دیا۔[3]

وفات | یہیں ۱۷۲ھ یا ۱۷۶ھ میں وفات ہوئی۔

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۳۰۶ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۲۶۶
[3] تاریخ خطیب بغدادی ج ۹ ص ۳۱۰۔

ذوالنون مصریؒ رحمۃ اللہ علیہ

نام و نسب | ثوبان نام ابوالفیض کنیت، ذوالنون لقب، والد کا نام ابراہیم تھا جو اسحاق بن محمد الانصاری کے غلام تھے[1] ان کے چار بیٹے تھے۔ ذوالنون، ذوالکفل، عبدالباری، الیسع۔ حضرت ذوالنون کی پیدائش اخمیم میں ہوئی جو مصر کا ایک گاؤں ہے یہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پرانوار ہے[2]۔

علم و فضل | علم و فضل کے لحاظ سے ان کا شمار اکابر امت میں ہوتا ہے۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کان اوحد وقتہ علماً وورعاً وحالاً وادباً وھو معدود فی جملۃ من روی الموطأ عن الامام مالک رضی اللہ عنہ۔ ترجمہ: حضرت ذوالنون علم تقویٰ، حال اور ادب کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے یگانۂ روزگار فرد تھے، اور ان کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے خود امام مالک سے موطا کی روایت کی ہے[3]۔

علم حدیث | انہوں نے امام مالک بن انسؒ، لیث بن سعدؒ، اور ابن لہیعہؒ سے حدیثیں روایت کی ہیں اور خود ان سے جنیدؒ اور دوسرے حضرات نے روایات نقل کیں[4] لیکن حضرت ذوالنون اُس سرمایۂ سعادت سے بہرہ اندوز تھے جو قوتِ بازو اور زورِ ہمت وجستجو سے

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۰ [2] نفحات الانس ص ۳۳ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۰۱

[4] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۲۱۸۔

نہیں بلکہ محض خدائے بخشندہ کے لطف خاص سے کسی کسی خوش قسمت انسان کو حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ معرفت و سلوک کے اُس مقام بلند کے طائر سدرہ پرواز تھے جہاں حجابات ظاہری یک قلم مرتفع ہو کر شاہد کو جلوۂ مشہود سے، ناظر کو تجلیاتِ منظور سے اور چشم شوق آگین کو حقیقت مقصود و مطلوب سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ اُن کا قلب تجلیات و انوار الٰہی کا آئینہ اور اُن کی آنکھیں جمال حقیقی کی مسلسل ضو فشانیوں سے روشن و منور تھیں۔ جو شخص حقیقت لم یزل سے بلا واسطہ شاد کام ہو رہا ہو، اس کو عالم مجاز کی رسم و راہ کا کیا خیال رہ سکتا ہے۔ اور جس کو مطلوب حقیقی سے بے حجاب و بے نقاب شرف تخاطب و ہم کلامی حاصل ہو۔ وہ کب کسی قاصد و مردِ درمیانہ کی منتِ پیغام رسانی کا ممنون ہو سکتا ہے۔ اربابِ ظاہر قیاس و تخمین کے اشاروں سے جس حقیقت مستور کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ اپنی چشم باطن و بصیرت سے اُسے خود اپنے دل کی گہرائیوں میں دیکھ لیتا ہے۔ لوگ واسطہ در واسطہ روایت کے ذریعہ جس فن کی عبارت تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے اذعان و یقین کی لوح پر اُس کے تمام نقوش صاف صاف پڑھ لیتا ہے۔ قفس ناسوت کے اسیران بلا پر عالم روح کے حقائق و اسرار کو کتنا ہی کھول کھول کر بیان کیا جائے، تردد و تذبذب اور احتمال و شک کی خام پنداراں پھر بھی ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن عالم لاہوت کا طائر برق پرواز اپنی ایک جست میں ہی اذعان و تیقن کے دائمی اطمینان و سکون سے سعادت اندوز ہو جاتا ہے پھر اُسے لفظوں کی نہیں، معنی کی، پیرایہ بیان و اظہار کی نہیں اصل منشا و مطلب کی جستجو ہوتی ہے اور وہ اسی پر حصر کر کے راویوں کی عدالت و ثقاہت، فن کے اصول

جرح و تعدیل، اور الفاظ کی تعیین و تشخیص سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، اس کے جسم و جان کو محنت و عمل کا آتشکدہ بنا دینے کے لئے صرف محبوب کی ایک جنبش لب کافی ہے۔ وہ کبھی پیام حبیب پر ایمان لانے کے لئے اس کا کھوج نہیں لگاتا کہ یہ پیام اس تک کس کے ذریعہ پہونچا ہے۔ اور وہ ثقہ ہے یا نہیں وہ مقصودِ حقیقی کے اندازِ کلام۔ طورِ گفتگو۔ اور اس کے آئین خطاب سے پورے طور پر آشنا ہوتا ہے۔ اسی لئے راوی کی ثقاہت و عدم ثقاہت سے قطع نظر وہ نفس کلام کو سن کر ہی معلوم کر لیتا ہے کہ یہ کلام کس زبان حق ترجمان سے صادر ہوا ہے "ولی را ولی می شناسد" مشہور مقولہ ہے حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جو کبار اولیا اللہ میں سے ہیں حضرت ذوالنون مصری کی شان میں فرماتے ہیں۔

آں پیشوائے اہل ملامت، آں شمع جمع قیامت، آں برہان موہبت و تجرید آں سلطان معرفت و توحید آں حجت الفقر فخری ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ از ملوکِ طریقت بود سالک راہِ بلادِ ملامت بود۔ و اسرار توحید نظرے عظیم دقیق داشت و روشنی کامل و ریاضات و کراماتِ وافر[1]

اہل فن اور ارباب جرح و تعدیل اپنے مقررہ اصول و ضوابط کے ماتحت حدیث کے باب میں ان کے اعتبار و استناد سے متعلق کلام کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے "روی عنه من مالك احادیث فی اسانیدها نظر"، کسی کا ارشاد ہے "ذوالنون اگر حدیثیں بیان کریں تو اُن کی اسناد کو دیکھو اگر وہ درست ہو تو انہیں قبول کر لو[2]" اور اس میں شبہ نہیں

---

[1] تذکرۃ الاولیاء ص ۸۰ [2] تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۴

انہیں اس طرح کا کلام کرنے کا حق بھی ہے، کیونکہ یہ عالم عالم اسباب اور دنیا، قوانین ہے اگر ایسا نہ کیا جائے اور محض کشف و شہود کو حجت و برہان سمجھ لیا جائے تو عالم کا نظم و انتظام مختل ہو جائے۔ لیکن جس شخص کا قلب انوار و تجلیات ایزدی کا محیط ہو۔ اس کو خود اپنے اطمینان کے لئے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں جو اہل نظر ہوتے ہیں وہ ان گدڑی میں چھپے ہوئے لعل و جواہر کو ایک ہی نظر میں پہچان لیتے ہیں اور ان کی وقعت و عزت کرتے ہیں

ابن جلاء کا بیان ہے ”میں نے چھ سو شیوخ سے ملاقات کی ہے لیکن مجھ کو ان میں چار جیسا کوئی نہیں ملا۔ انہیں چار بزرگوں میں سے ایک ذوالنون بھی ہیں“[1]

ذوالنون کے لقب کی وجہ ان کے لقب ذوالنون کی وجہ ان کا ایک عجیب و غریب واقعہ کرامات ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ذوالنون ایک مرتبہ کشتی میں سفر کر رہے تھے ان کا ہم سفر ایک بہت بڑا سوداگر بھی تھا جو کئی قسم کے قیمتی جواہرات اور کثیر مقدار میں سونا اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اتفاق سے سوداگر کے یہ تمام جواہرات چوری چلے گئے۔ کشتی میں حضرت ذوالنون کی مانند کوئی دوسرا غریب تھا نہیں۔ اس لئے کشتی کے لوگوں نے انہیں ملزم قرار دیا اور ان کو اذیت پہونچانے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت ذوالنون نے یہ دیکھ کر آسمان کی جانب دونوں ہاتھ اٹھائے اور التجا کی ”الٰہ‌ا جو حقیقت حال ہے تو اسے خوب جانتا ہے“ ان کا یہ کہنا تھا کہ کئی مچھلیوں نے دریا سے سر نکالے۔ ان میں سے ہر ایک کے منہ میں ایک ایک موتی تھا، حضرت ذوالنون نے یہ موتی ان مچھلیوں سے لے لئے اور

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۷

سوداگر کے حوالہ کر دیئے۔ اس عجیب و غریب واقعہ کو دیکھ کر کشتی کے تمام مسافر حیران رہ گئے، اور فوراً سب نے آپ کے قدموں پر گر کر آپ سے معافی طلب کی۔ عربی زبان میں "نون" مچھلی کو کہتے ہیں اس بنا پر لوگ حضرت ذوالنون کو ذوالنون یعنی مچھلی والا کہنے لگے۔[1]

استغراق فی التوحید | حضرت ذوالنون پر ہمہ وقت ایک عجیب محویت و استغراق فی التوحید کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ کائناتِ عالم کو بہ نگاہ عبرت دیکھتے۔ اور پھر خدا کی ذات و صفات میں محو ہو جاتے تھے۔ یہی استغراق ان کے لئے وجہ سکون و طمانیت تھا جسکے بعد انھیں دنیا و مافیہا سے مکمل استغنار حاصل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ آپ دریا کے کنارے رات کے وقت تشریف لے گئے وہاں آسمان اور پانی کو دیکھ کر فرمانے لگے "سبحان اللہ! اے آسمان اور اے پانی۔ تم دونوں کی شان کس قدر عظیم و جلیل ہے۔ نہیں بلکہ تم دونوں کو پیدا کرنے والا کس قدر عظیم الشان ہے۔ وہ یقیناً تم دونوں سے بہت زیادہ رفیع المرتبت ہے جب رات زیادہ تاریک ہوگئی تو آپ نے یہ اشعار پڑھنے شروع کر دیئے۔

اطلبوا لانفسکم — مثل ما وجدت انا
قد وجدت لی سکنا — لیس فی ھوا لا عنا
ان بعدت قربنی — او قربت منه دنا

ترجمہ:۔ تم بھی اپنے لئے ایسا ہی (ایک محبوب) تلاش کرو جیسا میں نے پایا ہے۔ میں نے اپنے لئے ایک سکون کا مامن پالیا ہے جس کی محبت میں کوئی مشقت نہیں ہے۔ اگر میں اُس سے

---

[1] تذکرۃ الاولیاء باب سیزدہم ص ۹۹

دور ہوں تو وہ مجھ کو قریب کر لیتا ہے۔ اور اگر میں اُس سے قریب ہوں تو وہ اور نزدیک آجاتا ہے۔[۱]

کیفیت جذب وحال وہ کیفیت جذب وحال سے ہمیشہ سرشار رہتے تھے، جب بغداد پہونچے تو صوفیاء کی جماعت کثیر نے اُن کا شاندار استقبال کیا۔ ان کیساتھ ایک قوال بھی تھا۔ لوگوں نے پوچھا حضرت! آپ کی اجازت ہو تو قوال کچھ سنائے، آپ نے اجازت دیدی۔ قوال نے یہ اشعار پڑھے۔

صغیر ھواک عذّبنی　　　فکیف بہ اذا احتنکا

وانت جمعت من قلبی　　　ھوًی قد کان مشترکا

اما ترثی لمکتئب　　　اذا ضحک الخلی بکا

ترجمہ:۔ تیری تھوڑی سی محبت نے ہی مجھ کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔ پس کیا حال ہوگا جبکہ یہ شدید ہوگی (اے محبوبہ) جو محبت مشترک اور کئی لوگوں میں تقسیم تھی۔ تو نے اُس کو میرے دل سے سمیٹ لیا ہے۔ کیا تجھے اُس غمزدہ انسان پر رحم نہیں آتا جو اس وقت بھی روتا رہتا ہے جبکہ عشق سے ناآشنا ہنستا ہے۔"

حضرت ذوالنون یہ اشعار سنتے ہی کھڑے ہو گئے۔ پھر منہ کے بل زمین پر گر پڑے خون آپ کے جسم سے بہہ رہا تھا۔ لیکن یہ عجب بات ہے کہ زمین پر اُس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے بعد حاضرین مجلس میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور وجد کرنے لگا۔ حضرت

---

[۱] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۷

ذوالنون نے پڑھا الذی یراک حین تقوم ۔ یہ سنتے ہی وہ شخص فوراً بیٹھ گیا۔[1]

آپ کے بھائی ذوالکفل کا بیان ہے ۔۔ ایک مرتبہ حضرت ذوالنون کا ایک غلام بغداد میں کسی قوال کے پاس جا پہونچا۔ قوال اس وقت کچھ گا رہا تھا۔ حضرت ذوالنون کی صحبت میں رہتے رہتے آپ کا غلام بھی صاحب وجد و حال ہو گیا تھا۔ غلام نے جو یہ اشعار سنے اس پر عجیب ایک کیفیت بیخودی و سرشاری طاری ہو گئی۔ اسی حالت میں اس نے ایک زور کی چیخ ماری۔ پھر جو دیکھا گیا تو وہ جسد بے روح تھا۔ حضرت ذوالنون کو اس واقعہ کی خبر ہوئی آپ نے قوال کو طلب فرمایا، اور انہیں اشعار کے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی تعمیل ارشاد میں کیا دیر ہو سکتی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان اشعار کے اثر سے چیخ تو نکلی حضرت ذوالنون کے دہانِ مبارک سے۔ لیکن قوال پر یہ اثر ہوا کہ اس کا طائر روح قفس جسم سے فوراً پرواز کر گیا حضرت ذوالنون نے فرمایا ۔۔ النفس بالنفس والجروح قصاص[1]"

گریہ وزاری اور عبرت پذیری جو اہل اللہ ہوتے ہیں۔ گردشِ دولاب پر بھی رقص کرنے لگتے ہیں اور بعض بہت معمولی معمولی چیزوں سے عبرت پذیر ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت ذوالنون کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک عورت ملی۔ اس نے آپ سے پوچھا "آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" فرمایا "میں پردیسی مسافر ہوں" عورت بولی ۔۔ افسوس! کیا اللہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی غربت زدہ لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ تو پردیسیوں کا مونس اور ضعیفوں کا مددگار ہے "حضرت ذوالنون عورت کی زبان سے یہ حکیمانہ فقرہ سنکر رونے لگے۔

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۷

عورت نے پوچھا، آپ کیوں روتے ہیں؟، فرمایا، میری بیماری جس نے ناسور کا حکم اختیار کر لیا تھا۔ اس کی جلد ہی دوا مل گئی، عورت نے کہا، اگر آپ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو پھر روئے کیوں؟ ارشاد ہوا، تو کیا سچا آدمی روتا نہیں ہے؟، وہ بولی، نہیں، آپ نے پوچھا، یہ کس طرح؟، عورت نے جواب دیا، یہ اس لئے کہ رونے سے دل کو راحت ملتی ہے۔ اور گریہ و بکا قلب کے لئے ایک امن کا حکم رکھتا ہے، دل کا راز مخفی رکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ انسان آہ و زاری کو نہاں خانۂ قلب میں چھپائے رکھے۔ آنسو بہانے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے اور دل کی یہ سبکساری عقلمندوں کے نزدیک کمزوری ہے، حضرت ذوالنون عورت کی اس گفتگو کو سنکر حیران رہ گئے۔ عورت نے پوچھا، آپ کا یہ کیا حال ہے؟، فرمایا، مجھے آپ کے کلام پر تعجب ہوتا ہے۔ پھر حضرت ذوالنون نے سوال کیا، مجھ کو کوئی ایسی بات بتائیے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ کو نفع دے،، عورت بولی، تو کیا اب تک آپ کو جو فوائد ایک حکیم کے ذریعہ حاصل ہو چکے ہیں اُنکے ہوتے ہوئے آپ زوائد سے مستغنی نہیں ہوئے؟ فرمایا، نہیں، میں زوائد سے مستغنی نہیں ہوں، عورت نے کہا، آپ سچ فرماتے ہیں، اچھا اپنے رب سے محبت کیجیے اور اس کا اشتیاق رکھیے، کیونکہ ایک دن آئیگا جبکہ خدا اپنی کرسی کرامت پر اپنے اولیاء اور احبار کے لئے جلوہ فگن ہوگا اور ان کو اپنی محبت کا ایک ایسا پیالہ عطا فرمائے گا کہ اس کے بعد ان کو تشنگی محسوس ہی نہیں ہوگی۔ حضرت ذوالنون یہ سُنکر پھر زار و قطار رونے لگے۔ اس کے بعد عورت نے ایک فقرہ کہا اور حضرت ذوالنون کو اسی حالت میں چھوڑ کر

روانہ ہوگئی۔[1]

دربار خلافت میں قدر و منزلت | حضرت ذوالنون کی ان عجیب وغریب کیفیات کو دیکھ کر پہلے پہل تو لوگوں نے ان پر طرح طرح کے شکوک و شبہات کئے۔ یہاں تک کہ ان پر الحاد و زندقہ کے الزامات لگائے گئے۔ متوکل علی اللہ جو اس زمانہ میں خلیفہ تھا اس نے بھی اسی طرح کے اعتراضات سے متاثر ہوکر ان کو قید خانہ میں بند کر دیا۔ ان کے تقویٰ و طہارت کا یہ عالم تھا کہ جیل خانہ کا محافظ ایک مرتبہ چوری سے حضرت ذوالنون کے لئے عمدہ کھانا تیار کرا کے لے آیا۔ اور خدمت سامی میں پیش کرکے درخواست کی آپ اس کو تناول فرمالیں۔ لیکن آپ نے اس کے تناول فرمانے سے انکار کر دیا۔[2]

متوکل علی اللہ کو جلد معلوم ہوگیا کہ اس نے حضرت ذوالنون ایسے باکمال و خدا رسیدہ بزرگ کو محبوس کرکے کس شدید غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس نے اُن کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ رہا کر دیا۔ متوکل کا اس زمانہ میں قیام سرمن رائی میں تھا۔ وہیں اُس نے حضرت ذوالنون کو طلب کیا۔ کچھ دنوں یہاں قیام کرنے کے بعد آپ بغداد چلے آئے۔ اور پھر یہاں سے مصر تشریف لے گئے۔[3]

متوکل اب آپ کے ساتھ بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ علامہ خطیب بغدادی نقل کرتے ہیں "وکان المتوکل مولعًا به يُفَضِّلُهٗ علی العباد والزهاد" لیکن حضرت ذوالنون شوکت شاہی سے ذرا مرعوب نہ ہوتے تھے۔ متوکل کے سوالات کے جوابات آزادی اور جرارت و جسارت سے

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۳۹۴ [2] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰۷ [3] تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۳

دیتے تھے۔ ایک مرتبہ متوکل نے دریافت کیا۔ اے ابوالفیض! آپ اولیاء کے صفات بیان فرمایئے۔ ارشاد ہوا۔ اے امیرالمومنین! یہ وہ قوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے بلند نور کا لباس پہنا دیا ہے اور جن کو اپنی کرامت کی چادروں سے رونق وزینت عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر مسرت کے تاج رکھے ہیں اور اپنی مخلوق کے دلوں میں ان کی محبت پھیلا دی ہے۔ پھر اس کے بعد خدا نے ان کو دنیا میں اس شان سے بھیجا کہ ان کے دلوں میں غیب کے ذخیرے جمع تھے اور اُن کے دل وصالِ محبوب کی تمنا میں سرگردان، اور اُن کی آنکھیں جلالِ ربانی کے مشاہدہ میں غرق و محو تھیں، پھر اپنے احسانات میں چھپا لینے کے بعد ان اولیا کو علاج اور مرض دونوں کی معرفت وتشخیص کی قوت مرحمت فرمائی اور ان کے شاگردوں کو ارباب تقویٰ وورع بنایا اور ان کے لئے اس بات کی ضمانت کی کہ جب یہ دعا کریں گے اسے شرفِ قبول عطا فرمایا جائے گا[1]"

ایک مرتبہ متوکل علی اللہ نے آپ سے درخواست کی "میرے لئے کوئی دُعا لکھ دیجئے" اور قاضی یحییٰ بن اکثم کو اس بات پر مامور کیا کہ حضرت ذوالنون جو کچھ بتائیں وہ لکھتے جائیں آپ نے یہ دُعا لکھوائی۔ اس دُعا کا لطف چونکہ عربی زبان میں زیادہ ہے اس لئے ہم اصل دعا نقل کرتے ہیں۔ پھر اس کا ترجمہ کریں گے:۔

رَبِّ اَقِمْنِی فِی اَهلِ وِلایَتِكَ مَقَامَ رَجَاءِ الزِّیَادَةِ مِن مَحَبَّتِكَ وَاجْعَلْنِی فَرِحًا بِذِکرِكَ فِی ذِکرِكَ وَفِی رَوحِ نَجَاحِ اَسْمَائِكَ لاسِمِكَ وَهَبْ لِی قَدَمًا

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۴

اعادلِ بما بفضلك اقدام من لم ینل عن طاعتك واحقق بها ارتیاحًا فی القرب منك واحف بها جَوَلًا فی الشغل بك، ماحییت وما بقیت رَبَّ العٰلمین اِنَّكَ رَءُوْفٌ رحیمٌ. اَللّٰھُمَّ ربك اعوذ والوذ واٰمل البلغۃ الٰی طاعتك والمثوٰی الصالح من مرضاتك وانت ولیٌّ قدیرہٗ

ترجمہ:- اے رب تو مجھ کو اپنے اہل ولایت میں ایک ایسے مقام پر فائز کر جہاں میں تیری محبت کی زیادتی کی اُمید کرسکوں اور مجھ کو اپنے ذکر کی وجہ سے اپنے ذکر کا دیوانہ بنا دے کہ تیرے ہی ذکر میں مجھ کو امن وچین اور راحت نصیب ہو۔ اور اپنے اسماء حسنیٰ کے باغیچوں میں لیجا کر مجھ کو اپنے نام کی لذت عطا فرما۔ اور مجھ کو ایسے قدم عطا فرما کہ تیری اطاعت سے منحرف نہ ہونے والوں کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ جا کھڑا ہوں اور میں تیرے قرب کی وجہ سے ایک لذت خاص محسوس کروں۔ اور میں ہمیشہ تیری یاد اور تیرے ذکر میں ہی سرگرداں رہوں۔ اے رب العالمین جب تک میں زندہ رہوں، میری یہی حالت رہے" تو بہت بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہو۔ اے اللہ میں تیری ہی پناہ چاہتا ہوں تیری طاعت تک پہونچنے کی اُمید کرتا ہوں اور تیری رضامندی کے درست ٹھکانے کی توقع کرتا ہوں۔ تو ولی و قدیر ہے"

حضرت ذوالنون یہیں تک پہونچے تھے کہ یحییٰ بن اکثم نے کہا "اے ابوالفیض یہ ہی کافی ہے" آپ نے جواب دیا "اگر اللہ نے خیر کا ارادہ کیا تو ہاں بیشک متوکل ایسے شخص کے لئے یہی بہت ہے" آپ نے یہ فرمایا اور یحییٰ بن اکثم کو الوداع کہہ کر تشریف لے آئے۔[۱]

[۱] تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۳۹۶

معرفت وسلوک میں ان کا مقام رفیع | حضرت ذوالنون معرفت وسلوک کے جس مقام رفیع پر متمکن

تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد الانصاری فرماتے ہیں:۔

حضرت ذوالنون اُن لوگوں میں نہیں ہیں کہ اُن کو کرامات سے آراستہ کیا جائے یا مقام وحال کے مقامات سے ان کی تعریف کریں۔ وقت تو اُن کے ہاتھ میں پورے طور پر درماندہ ومسخر تھا، وہ وقت کے امام، زمانہ کے یگانہ، اور اس گروہ (اولیاء اللہ) کے سردار تھے اور سب کو ان کے ساتھ نسبت واضافت ہے، ان سے پہلے بھی بڑے بڑے مشائخ گذرے ہیں لیکن اس لحاظ سے وہ سب سے پہلے آدمی ہیں کہ جو باتیں اب تک اشاروں میں کہی جاتی تھیں وہ اُنھوں نے صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیں[1]"

حضرت ذوالنون اپنے مقامات کی نسبت خود ایک موقع پر بیان فرماتے ہیں۔

"میں نے تین سفر کئے، اور تین علم حاصل کئے۔ پہلے سفر میں میں نے وہ علم حاصل کیا جس کو خاص وعام دونوں نے قبول کیا۔ دوسرے سفر میں میں نے وہ علم حاصل کیا جس کو خاص نے تو قبول کر لیا۔ لیکن عوام اُسے قبول نہ کر سکے۔ رہا تیسرا سفر، تو اُس میں میں نے ایسا علم حاصل کیا جس کو نہ خاص نے قبول کیا اور نہ عام نے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے اور میں تنہا رہ گیا، مجھ کو سب نے ہی چھوڑ دیا"

---

[1] نفحات الانس مولانا عبدالرحمٰن جامی ص ۳۲

شیخ الاسلام ابو اسماعیل الہروی حضرت ذوالنون کے اس جملہ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ آپ کا پہلا علم تو یہ تھا جس کو عام خاص دونوں نے قبول کیا۔ دوسرا علم توکل اور معاملت و محبت تھا جس کو خاص نے ہی قبول کیا، عام نے نہیں، تیسرا علم حقیقت تھا جو مخلوق کے علم و عقل کے دائرہ سے باہر تھا۔ اس بنا پر لوگ اُس کو سمجھ نہ سکے۔ اور اُسلئے اُن کے مخالف ہو گئے۔ ان مخالفوں کا یہ انکار حضرت ذوالنون کی وفات تک برابر جاری رہا۔[1]

فصاحت | حضرت ذوالنون نہایت فصیح گفتار تھے۔ جب اپنی زبان حق ترجمان سے وعظ شروع کرتے تھے تو سخت سے سخت مخالف کا دل بھی موم ہو جاتا تھا۔ متوکل علی اللہ کی ناراضگی کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے۔ اسی سلسلہ میں ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں۔ "متوکل علی اللہ کے پاس جب پے بہ پے حضرت ذوالنون کے خلاف شکایتیں پہونچیں اور اُن کو زندقہ و الحاد کی تہمتوں سے متہم کیا گیا تو اُس نے اُنھیں "سرمن رای" میں طلب کیا۔ لیکن حضرت ذوالنون نے متوکل کے سامنے پہونچتے ہی ایسا پُر درد و اثر وعظ کہا کہ متوکل بیساختہ رونے لگا۔ اور حضرت ذوالنون کو عزت و کرامت کے ساتھ لوٹا دیا۔[2]

حکیمانہ مقولے | اُن کے حکیمانہ مقولے بیشمار ہیں۔ سب کو نقل کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ذیل میں چند منتخب مقولے درج کر دینا کافی ہوگا۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کو عقل کی خلعت سے بڑھ کر کوئی دوسری خلعت نہیں دی۔ اور اسی طرح علم سے زیادہ خوبصورت کوئی ہار عطا نہیں فرمایا،

[1] نفحات الانس ص ۳۴ [2] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰۸

اللہ کی عطا کی ہوئی زینتوں میں سب سے بہتر زینت بُردباری ہے اور ان تمام چیزوں کا کمال تقویٰ ہے۔[1]

ایک مرتبہ یوں ارشاد فرمایا "جسم بیمار ہوتا ہے تو درد و کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسی طرح دلوں کا روگ گناہ ہیں۔ جس طرح جسم کی بیماری کے وقت کھانا لذیذ نہیں معلوم ہوتا، اسی طرح دل گناہ گار ہو تو اُسے عبادت کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی"۔ ایک دفعہ آپ نے کہا "جو شخص نعمتوں کی قدر نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں نامعلوم طریقوں سے سلب کر لیتا ہے"۔[2]

ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا "حضرت! میں آپ سے رخصت ہونے والا ہوں مجھ کو از راہ کرم کوئی ایسی وصیت کیجئے کہ وہ میرے کام آتی رہے"، آپ نے فرمایا۔ بس یہ خیال رکھنا کہ کہیں لوگوں کے عیوب کی چھان بین تم کو خود اپنے عیوب کو دیکھنے سے غافل نہ رکھے۔ یقین کرو کہ تمہیں لوگوں کا نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے" پھر فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب وہ بندہ ہے جو اُن میں سب سے زیادہ عقلمند ہو۔ اور ایک انسان کی غایت عقلمندی اور تواضع کی علامت یہ ہے کہ کوئی شخص اُس کو کوئی بات بتلائے تو وہ اُس کو بغور و خوض سُنے، اگرچہ وہ اُسے پہلے سے جانتا ہو۔ اور جب کوئی حق بات اُس کے روبرو کی جائے تو وہ فوراً اُس کو قبول کرلے۔ اگرچہ یہ حق بات کہنے والا مرتبہ میں اُس سے کم ہی ہو، اور اگر اُس سے کسی خطا کا صدور ہو جائے تو وہ اس کا اعتراف بے چون و چرا کرے۔[3]

---

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۸، ۲۸۹ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۸

[3] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۹، ۲۹۰

ایک دن آپ نے فرمایا: "انسان پر فساد چھ چیزوں سے آتا ہے۔

(۱) آخرت کا عمل کرتے وقت نیت کا کمزور ہونا۔

(۲) اپنے تن بدن کو شیطان کے گرو رکھ دینا۔

(۳) موت کے نزدیک ہونے کے باوجود حرص وہوس کی درازی

(۴) مخلوق کی رضامندی کو خدا کی رضامندی پر ترجیح دینا۔

(۵) خواہشات نفسانی کی پیروی کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کو ترک کر دینا۔

(۶) بزرگوں کی لغزشوں کو اپنے لئے حجت بنانا اور اُن کے ہنروں کو دفن کر دینا۔

ایک مرتبہ فرمایا: "زندگی کا لطف انھیں باہمت لوگوں کے ساتھ ہے جن کے دل تقویٰ اور پرہیزگاری پر مائل ہیں اور جن کو ذکر مولیٰ سے نشاط وانبساط حاصل ہوتا ہے" ایک دفعہ ارشاد ہوا: "ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرو جو تمہارے بدل جانے سے خود متغیر نہ ہوں" اور اگر تم چاہتے ہو کہ تمیں دوستوں کی صحبت کا صحیح لطف حاصل ہو تو ایسی صحبت اختیار کرو جیسی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصاحبت کی تھی کہ دین اور دنیا دونوں میں کسی ایک بات پر بھی مخالفت نہیں ہوئی۔ یقین ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر کا صاحب ہوگا۔

ایک دعا میں آپ نے فرمایا۔ خدا کی محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان اخلاق وافعال میں اور اوامر وسنن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو حبیب خدا ہیں اُن کا تابع اور پیرو ہو" فرمایا

"خدا کے ساتھ صحبت نہ رکھو مگر موافقت کے ساتھ، مخلوق کے ساتھ تمہاری مصاحبت محض مناصحت کی راہ سے ہونی چاہیئے، اور نفس کے ساتھ محض بطور مخالفت اور دشمن کے ساتھ بطور دشمنی مصاحبت ہونی چاہیئے " ایک جگہ فرمایا "میں نے اُس طبیب سے زیادہ جاہل نہیں دیکھا جو سرمستی کے وقت مستوں کا علاج کرے۔ مراد یہ تھی کہ جو لوگ دنیوی لذتوں میں مست ہیں اُنکو وعظ ونصیحت کرنا بالکل بے کار ہے۔ مست کے لئے کوئی دوا اُسی وقت موثر ہوسکتی ہے جبکہ وہ ہشیار ہو اُس وقت اُس کا علاج توبہ سے کرنا چاہیئے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے پوچھا "حضرت! عارف کس کو کہتے ہیں؟" فرمایا "عارف عام لوگوں میں سے ہوتا ہے، مگر اُن سے الگ بھی، عارف کو چاہیئے کہ خائف ہو یعنی اللہ کا خوف کرتا ہے نہ یہ کہ وہ واصف ہو یعنی یہ کہ وہ اپنی معرفت شناسی کا حال بیان کرتا پھرے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔ پھر فرمایا "عارف کو ایک ہی حالت پر برقرار رہنا زیبا نہیں ہے۔ کیونکہ اُس پر تو عالم غیب سے ہر ساعت ایک نئی حالت کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صاحب حالات کہلاتا ہے، نہ صاحبِ حالت" ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا "معرفت تین قسم کی ہوتی ہے ایک معرفت توحید۔ یہ عام مومنوں کو حاصل ہوتی ہے، دوسری معرفت حجت وبیان، یہ قسم حکماء، بلغاء۔ اور علماء کے لئے مخصوص ہے۔ تیسری قسم معرفت صفات وحدانیت ہے جو صرف اہل اللہ اور ارباب کشف وشہود کو حاصل ہوتی ہے، پھر اسی معرفت کے حاصل کرنے میں کسب وسعی کو دخل نہیں ہے۔ بلکہ جب حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کی چشم بصیرت وا

کر دیتے ہیں تو یہ معرفت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے[1]۔

یوسف بن الحسن بیان کرتے ہیں ،، ایک مرتبہ میں نے حضرت ذوالنون سے سُنا فرما رہے تھے ،، صالحین کی صحبت سے زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اور دنیا کی تمام بھلائیاں ایک ایسے دوست میں جمع ہیں جو تم کو اُسوقت بھی یاد کرے جبکہ تم نے اُس کو بھلا دیا ہو اور اگر تم اُس کو یاد کرو وہ تمہاری اعانت و امداد کرے[2]۔

وفات | دوشنبہ ۲ ذیقعدہ ۲۴۶ھ کو بمقام جیزہ انتقال ہوا۔

---

[1] یہ مقولے تذکرۃ الاولیاء ص ۹۵ و ۹۶ سے ماخوذ ہیں۔

[2] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۸۸

علما شعر و ادب

ابو دلامۃ زند بن الجون

نام و نسب | زند نام ابو دلامۃ کنیت ۔ بعضوں نے نام زید بتایا ہے مگر یہ غلط ہے ۔ چنانچہ علامہ ابن خلکان اور خطیب بغدادی دونوں زند لکھتے ہیں ، بنو اسد کا غلام تھا ابن خلکان میں ہے ” انہ کان اسود عبداً حبشیاً“[1] علامہ بغدادی نے اصمعی کا یہ قول نقل کیا ہے ” ابو دلامۃ حبشی غلام مگر نہایت فصیح زبان تھا“[2] ایک عربی النسل نے ابو دلامۃ کے نسب پر طعن کرتے ہوئے کہا ہے :-

الا ابلغ لدیک ابا دلامہ ۔۔۔ فلست من الکرام ولا کرامۃ

اذا لبس العمامۃ کان قرداً ۔۔۔ وخنزیراً اذا وضع العمامۃ

ترجمہ :- ارے ذرا ابو دلامۃ کو تم یہ پیغام تو پہونچا دو کہ تو نہ شریف آدمیوں کی نسل سے ہے اور نہ خود تو شریف ہے ۔ ابو دلامۃ عمامہ سر پر رکھ لیتا ہے تو بندر بن جاتا ہے اور اسے اتار دیتا ہے تو سور بن جاتا ہے ۔

غلامی سے آزادی | بعد میں اس کے آقا نے اُسے آزاد کر دیا تھا ۔ ابو جعفر المنصور نے اس کی حاضر جوابی اور طلاقت لسانی سے متاثر ہو کر اسے اپنا مصاحب بنا لیا مگر معلوم ہوتا ہے ابو دلامۃ نے

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۰ ۔ [2] تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۴۸۸

ابوجعفر کی شاہانہ معیت وصحبت میں بھی اپنے آقا کو فراموش نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ابودلامۃ نے منصور سے درخواست کی کہ وہ اس کے آقا کو بھی اپنے حلقہ مصاحبین میں شامل کرلے۔ منصور نے ابودلامۃ کے پاس خاطر سے اُس درخواست کو منظور تو کرلیا۔ لیکن آئندہ کے لئے اس نوع کی سفارش سے باز رہنے کی سخت تاکید کرتے ہوئے کہا کہ پھر دوبارہ اگر ایسی حرکت کی تو قتل کردیا جائے گا۔[1]

فضل وکمال ابودلامۃ کا شمار عہد بنی عباس کے باکمال شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ فصاحت وبلاغت جزالت شعر، بدیہہ گوئی اور رندانہ مضامین کے بیان کرنے میں اپنے ہمعصر شعراء میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ علامہ بغدادی فرماتے ہیں۔

"وہ فطری شاعر تھا۔ اُس کے نوادر بہت ہیں۔ فی البدیہ اشعار کہنے میں اُسے ملکہ خاص حاصل تھا، تمام فنون میں اُس کے اور دوسرے شاعروں میں چوٹیں رہتی تھیں، شراب کے ذکر و وصف میں یگانہ تھا۔ اسی طرح باغوں کا سماں باندھنے اور اُن کے منظر بیان کرنے میں اُس کا ہمسر نہیں ہوسکتا تھا۔"[2]

بدیہہ گوئی ابودلامۃ کو بدیہہ گوئی میں خاص کمال حاصل تھا۔ ایک مرتبہ خلیفہ مہدی اور علی بن سلیمان دونوں شکار کے لئے گئے۔ ابودلامۃ اُن کے ہمراہ تھا۔ دوران شکار میں مہدی نے ایک ہرن پر تیر چلایا اور کامیاب رہا۔ لیکن علی بن سلیمان نے بھی ایک ہرن کو نشانہ بنایا تو اس کا تیر خطا کرکے ایک کتے کے جا لگا۔ اور وہ وہیں مر کے رہ گیا۔ اس پر مہدی کو بڑی ہنسی آئی اُس نے ابودلامۃ سے

---

[1] تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۴۸۹

[2] بغدادی ج ۸ ص ۴۸۹

موقع کے مناسب شعر کہنے کی فرمائش کی۔ ابودلامۃ نے برجستہ کہا۔

قد رمی المہدی ظبیاً شکّ بالسہم فؤادہٗ

وعلی بن سلیما ن رمی کلباً فصادہٗ

فھنیئاً لکما کل امرئٍ یاکل زادہٗ

ترجمہ:۔ مہدی نے ایک ہرن پر تیر چلایا اور تیر سے اس کا دل پھاڑ ڈالا اور علی بن سلیمان نے ایک کتے کے تیر مارا اور اس کا شکار کر لیا۔ پس تم دونوں کو مبارک ہو ہر شخص اپنا اپنا توشہ کھاتا ہے مہدی اس سے بڑا خوش ہوا اور ابودلامۃ کو تیس ہزار درہم دینے کا حکم دیا۔

ایک مرتبہ ایک گدھے پر ایک عورت میں اور ایک مرد میں جھگڑا ہو گیا۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ کی عدالت میں معاملہ پیش ہوا۔ عورت نے اپنی طرف سے ابودلامۃ کو اور اس کے ساتھ ایک اور شخص کو گواہی میں پیش کر دیا۔ ابن ابی لیلیٰ نے قاعدہ و قانون کے مطابق ابودلامۃ کے شریک شہادت شخص کی تعدیل کی۔ یعنی اس کے معتبر گواہ ہونے کا ثبوت مانگا جو بہم پہونچا دیا گیا۔ اس کے بعد ابودلامۃ کی باری تھی۔ لیکن قبل اس کے کہ قاضی اس کی عدالت پر بحث کرے قاضی کے پاس جا کر یہ شعر پڑھے۔

اِنِ الناس غطونی تغطیت عنھم وان بحثوا عنی ففیھم مباحثٗ

واِن حفر وابئری حفرتُ بئارھم لیعلم قومی کیف تلک النبائثٗ

ترجمہ:۔ اگر لوگوں نے میرے ساتھ پردہ پوشی کا معاملہ کیا تو میں بھی ان کے ساتھ پردہ پوشی کا معاملہ کروں گا اور اگر انھوں نے میرے ساتھ چھان بین کا سلوک کیا (تو میں بھی ایسا ہی کروں گا) کیونکہ

ان کے اندر بھی قیل وقال کی بہت گنجائش ہے۔ اگر انھوں نے میرا کنواں کھودا تو میں ان کے کنویں کھودوں گا۔ تاکہ میری قوم کو معلوم ہو جائے کہ کنویں کھودنے کا کام کیسا ہوتا ہے۔"

ابن ابی لیلیٰ نے یہ شعر سن کر کہا۔ ابو دلامۃ! ہم نے تیری شہادت معتبر ان لی ہے۔ اس کے بعد اس نے مدعیہ سے پوچھا۔ تیرے گدھے کی قیمت کیا تھی؟ وہ بولی "چار سو" ابن ابی لیلیٰ نے اُسے چار درہم دے کر رخصت کر دیا۔"

ایک دفعہ خلیفہ منصور نے ابو دلامۃ سے کہا کہ تم کو ظہر اور عصر کی نماز پابندی سے جماعت کے ساتھ پڑھنی چاہیئے۔ دیکھو اس میں خلاف نہ ہو، ابو دلامۃ نے برجستہ کہا۔

یکلفنی الاولیٰ جمیعاً وعصرھا   ومالی وللاولیٰ ومالی وللعصر

وماضرہٗ۔ واللہُ یغفر ذنبہٗ   لو انّ ذنوب العٰلمین علیٰ ظہری

"خلیفہ مجھ کو ظہر اور عصر کی نماز با جماعت پڑھنے کی تکلیف دیتا ہے حالانکہ ظہر اور عصر کی نماز کا معاملہ صرف میری ذات سے متعلق ہے اللہ خلیفہ کی مغفرت فرمائے۔ اگر تمام عالم کے گناہ بھی میری پشت پر لاد دیئے جائیں تو اس میں خلیفہ کا کیا نقصان ہوگا۔

حاضر جوابی بدیہہ گوئی کی طرح ابو دلامۃ کو حاضر جوابی میں بھی بڑا کمال تھا۔ اور خلفاء ابو العباس السفاح۔ ابو جعفر المنصور اور ابو عبداللہ المہدی سے اُس کو اس درجہ اختصاص تھا کہ وہ حاضر جوابی میں کوئی مرعوبیت محسوس نہیں کرتا تھا۔

حمادہ بنت عیسیٰ خلیفہ منصور کی بیوی تھی اس کی وفات ہوئی تو منصور کو طبعی طور پر بہت رنج ہوا۔ جنازہ سے پہلے قبرستان پہونچ گیا اور وہاں حمادہ کی قبر پر بیٹھ کر جنازہ کے پہونچنے کا

انتظار کرنے لگا۔ اس وقت ابودلامہ بھی پاس بیٹھا ہوا تھا۔ منصور کی نظر ابودلامہ پر پڑی تو اس نے قبر کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ "ما اعددت لهذا المصرع" تونے اس بچھڑنے کی جگہ کے لئے کیا چیز تیار کی ہے؟ ابودلامہ نے فوراً کہا۔ "حمادہ بنت عیسیٰ کو" منصور اس جواب پر بہت ہنسا اور اس کے ساتھ تمام حاضرین بھی ہنس پڑے۔

ایک دفعہ منصور نے ابودلامہ کو حکم دیا کہ تم فوج کے ساتھ عبداللہ بن علی سے جنگ کرنے جاؤ۔ ابودلامہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے کہا "امیرالمومنین! میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ مجھ کو لڑائی پر نہ بھیجیں کیونکہ اس سے پہلے میں نو لشکروں میں شریک ہوچکا ہوں اور وہ سب کے سب شکست کھا گئے" منصور کو اتنی ہنسی آئی کہ ضبط نہ ہوسکا اور ابودلامہ کو جنگی خدمت سے معاف کردیا[1]

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا کہ روح بن حاتم المهلبی بصرہ کا گورنر تھا۔ یہ خراسان کی جنگ پر گیا تو ابودلامہ بھی ہمرکاب تھا۔ جنگ کے اثنا میں دشمن کی صف سے ایک بہادر نکلا۔ اس طرف سے کئی جنگ آزما اس کے مقابلہ کے لئے بڑھے لیکن اس نے ان سب کو قتل کردیا۔ اب گورنر بصرہ نے ابودلامہ سے فرمائش کی کہ اسے آگے بڑھ کر اس بہادر کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ابودلامہ نے معذرت کی لیکن اس کے انکار پر روح بن حاتم کا اصرار بڑھتا رہا تو ابودلامہ نے یہ شعر پڑھے

انی اعوذ بروح ان یقدمنی	الی القتال فیخزی بی بنو اسد
ان المهلب حب الموت اورثکم	ولم ارث انا حب الموت من احد
ان الدنو الی الاعداء اعلمه	مما یفرق بین الروح والجسد

---

[1] یہ سب واقعات تاریخ بغدادی ج ۸ ص ۴۸۹، ۴۹۰ سے ماخوذ ہیں۔

ترجمہ:۔ میں روح سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو جنگ میں نہ بھیجے۔ ورنہ میری وجہ سے بنو اسد رسوا ہو جائینگے۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ طلب نے موت کی محبت تم کو ورثہ میں دی ہے لیکن میں نے یہ محبت کسی سے ورثہ میں نہیں پائی ہے، اور دشمنوں سے قریب ہونا میں جانتا ہوں ان چیزوں میں سے ہے جو روح اور جسم کے درمیان تفریق پیدا کر دیتی ہیں۔"

روح ان اشعار کو سننے کے بعد بھی نہیں پسیجا اور اس نے قسم دیکر کہا کہ نہیں، تم کو ہر حال جنگ میں شریک ہونا پڑے گا۔ روح نے مزید برآں کہا کہ اگر تم خلیفہ کی طرف سے جنگ نہیں کرتے ہو تو وظیفہ شاہی کس بات کا پاتے ہو؟ ابو دلامۃ نے جواب دیا "میں وظیفہ اس بات کا پاتا ہوں کہ سلطان کی طرف سے مدافعت کروں۔ اس بات کا نہیں کہ اس بہادر کے مقابلہ میں آکر مقتولین سے جا ملوں"۔ غرض یہ کہ ابو دلامۃ نے اپنی حاضر جوابی سے ہر چند گورنر کو قائل معقول کرنا چاہا مگر اس کی ایک شنوائی نہیں ہوئی۔ اور ابو دلامۃ کو چار و نا چار گھوڑے پہ بیٹھ، تلوار لگا۔ اور ناشستہ بادہ مقابلہ میں جانا پڑا۔ لیکن اس نے وہاں پہونچکر قتل و قتال کے بجائے بہادر دشمن کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اسے خود روح کے پاس ایک طالب امن کی حیثیت سے لے آیا جس کا ثمرہ یہ ہوا کہ خراسانی لشکر شکست کھا گیا اور روح کو کامیابی ہوئی[1]۔

خلفا سے راہ و رسم | ابو دلامۃ اگرچہ غلام تھا، اور غلام بھی حبشی لیکن اپنے فضل و کمال، شاعری،

---

[1] یہ واقعہ بڑی تفصیل سے ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۰، ۱۹۱ میں لکھا ہے۔ لیکن ہم نے طوالت کے ڈر سے اس کی غیر ضروری تفصیلات قلم انداز کر دی ہیں۔

حاضر جوابی، اور بدیہہ گوئی کی وجہ سے خلفاء کے دربار میں بڑی وقعت حاصل تھی اور وہ اُس کی دلجوئی و دلدہی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ شراب پینے کے جرم میں ابوجعفر منصور نے اُس کو قید کرادیا۔ اور قید کرایا بھی تو کہاں؟ مرغیوں کے بند ہونے کی جگہ میں تاکہ وہ اپنے نفس کو حقیر و ذلیل سمجھے۔ ابودلامۃ کو نشہ اُتر جانے کے بعد ہوش آیا۔ اور اُس نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں دیکھا تو چند اشعار کا ایک قطعہ لکھ کر محافظ قید خانہ کے حوالہ کیا اور کچھ دینے دلانے کا وعدہ کرکے اُس کے ذریعہ وہ قطعہ خلیفہ تک پہونچا دیا۔ اس قطعہ کے آخر میں کہتا ہے۔

وقد کانت تحدثنی ذنوبی بانی من عذابک غیرُ ناج

علی انی وان لاقیت شرًا لخیرك بعد ذاك الشر راج

ترجمہ:۔ مجھ سے میرے گناہ بیان کرتے تھے کہ میں تیرے عذاب سے نجات نہ پاسکوں گا، مگر اس کے باوجود کہ تیری طرف سے آئی ہوئی مصیبت دیکھی ہے میں اس کے بعد تجھ سے خیر کی امید کرتا ہوں۔

امیرالمومنین نے یہ اشعار دیکھے تو خود ابودلامۃ کو بلاکر یہ اشعار اُس کی زبان سے سُنے اور ہنسے اور پھر اُس کو رہا کر دیا۔

حسنِ طلب عام درباری شاعروں کی طرح ابودلامۃ بھی حسنِ طلب میں کمال رکھتا تھا اور خلفاء قدر دان تھے۔ اس لئے اس کو کبھی اپنی طلب میں ناکامی نہیں ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ ابودلامۃ کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ اس رات کی صبح کو ہی خلیفہ منصور کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بیٹی کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ منصور نے پوچھا: نام کیا تجویز کیا

ہے؟" بولا۔ "ام دلامۃ"۔ خلیفہ نے کہا۔ "اس سے کیا مراد ہے؟" جواب دیا۔ "تاکہ امیرالمومنین اس کی وجہ سے میری امداد کریں۔ خلیفہ نے پھر سوال کیا۔ "کیا تم نے اس لڑکی سے متعلق کچھ اشعار کہے ہیں" ابودلامۃ نے کہا۔ "جی ہاں"۔ اور پھر خلیفہ کی خواہش پر یہ اشعار سنائے۔

فما ولدتک ام عیسیٰ ولم یکفلک لقمان الحکیم

ولکن قد تضمک ام سوء الیٰ لباتھا واب لئیم

ترجمہ:۔ "اے بچی۔ تجھ کو نہ تو حضرت مریم نے جنا ہے اور نہ تیری کفالت لقمان حکیم نے کی ہے، لیکن تجھ کو ایک بری ماں اپنے سینہ سے لگاتی ہے۔ اور تیرا باپ لئیم غیر شریف ہے۔"

ابوجعفر منصور کو یہ اشعار سنکر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ پھر ابودلامۃ نے چیتھڑوں سے سلا ہوا ایک تھیلا نکالا۔ خلیفہ نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" ابودلامۃ بولا۔ "جو کچھ آپ مجھ کو عنایت فرمائیں گے میں اس میں رکھ لوں گا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ یہ تھیلا دراہم سے پُر کر دیا جائے۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں دو ہزار درہم سما گئے ہیں۔

ایک دفعہ ابودلامۃ خلیفہ مہدی کے پاس گیا، اور ایک کتے کی فرمائش کی۔ پھر بولا کہ اس کے لئے ایک نوکر کی ضرورت ہے جو شکار میں کتے کو لیکر چلے۔ مہدی نے ایک غلام بھی دلوا دیا۔ پھر ابودلامۃ نے کہا۔ "ایک سواری بھی تو چاہئے جس پر لاد کر شکار لایا جائے۔ خلیفہ نے اسے بھی منظور کر لیا اور ایک سواری دیدی۔ اس کے بعد ابودلامۃ بولا۔ "سرکار! ایک باندی بھی درکار ہے جو شکار کا گوشت پکائے، مہدی نے اس فرمائش کو بھی پورا کر دیا۔ اب اس نے کہا۔ "امیرالمومنین! کوئی ایسا سہارا بھی چاہئے جس کی وجہ سے میں ان سب چیزوں کے اخراجات برداشت کر سکوں

امیرالمومنین نے اس کے جواب میں سو جریب آباد زمین اور سو جریب غیر آباد زمین دے دی"
عربی میں غیر آباد زمین کو غامر کہتے ہیں خلیفہ کی زبان سے غامر کا لفظ نکلا تو ابو دلامہ نے پوچھا "یہ غامر زمین کونسی ہوتی ہے۔ مہدی نے کہا۔ یہ وہ خراب زمین ہے جس میں کوئی چیز اگی نہ ہو"
ابو دلامہ کی جرأت و بے تکلفی دیکھئے کہتا ہے "تو پھر اے امیرالمومنین بنو اسد کی زمینوں میں سو پانسو جریب غیر آباد (غامر) زمین میں نے آپ کو دی" اس کے بعد خلیفہ نے پوچھا "کیا اب بھی تمہارے دل میں کوئی حاجت رہ گئی ہے" ابو دلامہ نے کہا "جی ہاں" خلیفہ نے پوچھا "وہ کیا" ابو دلامہ بولا "وہ یہ کہ میں آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دوں آپ مجھے اس کی اجازت دیدیجئے"
مہدی نے کہا "ایسا ہونا تو ناممکن ہے" ابو دلامہ نے کہا "آپ نے میری ایسی کوئی حاجت رد نہیں کی جس کا رد ہو جانا اس حاجت (دست بوسی) کے رد ہو جانے سے زیادہ آسان ہو۔ یعنی یہ میری سب سے بڑی حاجت تھی جس کا منظور نہ ہونا مجھ کو بہت شاق ہے۔

خلفاء کی مسامحت اور قدردانی نے ابو دلامہ کو اس درجہ بیباک اور گستاخ بنا دیا تھا کہ بعض اوقات وہ زرطلبی کے لئے خلیفہ اور اس کی حرم کے ساتھ رکیک قسم کا مذاق کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابو دلامہ خلیفہ مہدی کے پاس آیا اور غمگین صورت بنا کر کہنے لگا "امیرالمومنین! ام دلامہ (ابو دلامہ کی بیوی) کا انتقال ہو گیا، اور اب میرا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں رہا۔ مہدی نے انا للہ کہا اور ابو دلامہ کو دس ہزار درہم دینے کا حکم دیا کہ تم اس رقم سے ایک باندی خرید لو جو گھر کے کاموں میں تمہاری مدد کرے" ادھر ابو دلامہ نے خود یہ حرکت کی۔ اور ادھر ام دلامہ کو مہدی کی بیوی خیزراں کے پاس بھیجا جس نے جاتے ہی خیزراں

سے کہا۔ سرکار ابودلامہ کا انتقال ہوگیا۔ اور میں بغیر سہارے کے رہ گئی" خیزراں کو ابودلامہ کی خبر موت سے بڑا رنج ہوا اور اُس نے اُم دلامہ کو ایک ہزار درہم دینے کا حکم دیدیا۔ اس واقعہ کے بعد مہدی محل میں گیا تو اُس کے چہرہ پر حزن والم کے آثار دیکھ کر خیزراں نے دریافت کیا۔ "امیرالمومنین کیا بات ہے؟ جو آپ ملول نظر آتے ہیں" خلیفہ بولا۔ "اُم دلامہ کا انتقال ہوگیا" خیزراں نے کہا "نہیں بلکہ ابودلامہ کا انتقال ہوا ہے۔ اب مہدی کو شبہ ہوا کہ اُس کے اور خیزراں کے ساتھ کیا چال چلی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ صرف یہ کہہ کر کہ دونوں میاں بیوی نے ہم کو دھوکا دیا ہے، چپ ہوگیا۔

ایک عجیب لطیفہ ابودلامہ اپنی جرأت اور بیباکی سے فائدہ اُٹھا کر بعض اوقات مذاق مذاق میں کلمۂ حق بھی کہہ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ابودلامہ کئی روز تک ابوجعفر منصور کے دربار میں حاضر نہیں ہوا، پھر وہ آیا تو خلیفہ نے تاکید کردی کہ وہ محل شاہی میں روز حاضر ہو، اور ساتھ ہی مسجد میں جا کر نماز باجماعت میں شرکت کرے، اور ایک شخص کو اس کی نگرانی پر مقرر کردیا۔ اس کے بعد ابو جعفر کا وزیر ابوایوب المرزبانی ابودلامہ کے پاس سے گزرا تو اُس نے وزیر کو ایک سربمہر لفافہ دیا اور اس سے خلیفہ تک اُس کو پہونچا دینے کی درخواست کی۔ لفافہ میں چند اشعار کا ایک قطعہ تھا جس میں لکھا تھا کہ مجھ سے نماز باجماعت کی پابندی نہیں ہوسکتی۔ منصور کو یہ رقعہ پڑھ کر ہنسی آئی اور اُس نے ابودلامہ کو بلا کر کہا تم خود اس قطعہ کو پڑھ کر سناؤ۔ ابودلامہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے خود اس قطعہ کو پڑھ کر سُنایا تو چونکہ اس میں نماز باجماعت کے ترک کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے خلیفہ اس پر حد جاری کردیگا۔ اس خیال سے ابودلامہ نے کہا۔ "میں اس قطعہ کو اچھی طرح

احمد بن محمد بن عبد ربّہ

نام و نسب احمد نام۔ ابو عمر کنیت، قرطبہ کا رہنے والا تھا۔ اس لئے قرطبی کہلاتا ہے۔ اس کا جدِ اعلیٰ سالم ہشام بن عبد الرحمٰن جو اندلس کے بنو امیہ میں سے ہے، غلام تھا۔ ۱۰ رمضان ۲۴۶ھ میں ولادت ہوئی۔

علم و فضل ابن عبد ربّہ کا شمار افاضل علماء اسلام میں ہوتا ہے۔ علامہ ابن خلکان کہتے ہیں "کان من العلماء المکثرین من المحفوظات والاطلاع علی اخبار الناس"، وہ ان علماء میں سے تھا جن کی محفوظات کا ذخیرہ بہت وسیع ہو۔ اور جن کو اخبار و روایات کا علم بہت زیادہ ہو۔[1] حمیدی کا بیان ہے "وابو عمر من اھل العلم والادب والشعر"[2]

شاعری اور ادب ابن عبد ربّہ کو عربی نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت تھی، نظم میں اسے تغزل اور قصیدہ دونوں میں کمال حاصل تھا۔ غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عشق و محبت کے مضامین سادہ اندازِ بیان کے ساتھ اس طرح ادا کئے جائیں کہ ان میں انسان کے حقیقی جذباتِ محبت کا عکس نظر آئے اور اس میں شاعرانہ مبالغہ پردازی سے زیادہ واقعیت کا رنگ نمایاں ہو۔ ابن عبد ربہ کے غزلیہ اشعار میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ مثال کے لئے اشعار ذیل دیکھئے

وَدّعتنی بزفرۃ واعتناقٍ	ثم نادت متی یکون التلاقِ
وَبدت لی فاشرق الصبح منھا	بین تلک الجیوب والاطواقِ

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲ [2] معجم الادباء ج ۴ ص ۲۱۳

یا سقیمَ الجفونِ من غیر سُقمٍ　　بین عینیک مصرعُ العشاق

انَّ یومَ الفراقِ افظع یومٍ　　لیتنی مِتُّ قبلَ یومِ الفراقِ

ترجمہ :۔ میری محبوبہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے اور گلے ملتے ہوئے مجھ کو الوداع کہا، پھر اُس نے (بھرائی ہوئی آواز سے) کہا "اب کب ملاقات ہوگی؟"

وہ میرے سامنے آئی تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا اُس کے گریبان اور ہار کے درمیان صبح کی پو پھٹ رہی ہے، یعنی اُس کی گردن کا نچلا حصّہ جو قمیص کے کالر سے باہر نکلا ہوا تھا صبح کی طرح چمک رہا تھا۔

(میں نے کہا) اے بغیر بیماری کے بیمار پلکوں والی محبوبہ تیری دونوں آنکھوں کے درمیان ہی تو عاشقوں کی قتل گاہ ہے۔ کوئی شبہ نہیں فراق کا دن سب سے زیادہ سخت اور کڑا دن ہے۔ اے کاش! میں جُدائی کے دن سے پہلے ہی مرگیا ہوتا۔

رمز شناسانِ بلاغت جانتے ہیں۔ پہلے شعر میں "نَحْتَہ" کا لفظ کس درجہ برمحل اور معنی خیز ہے۔ نحتہ عربی زبان میں تراخی کے لیے آتا ہے، تو شاعر نے یہ کہہ کر اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محبوبہ نے پہلے پہل فرطِ اضطراب سے معانقہ کیا اور ٹھنڈے سانس بھرتی رہی پھر اُس سے جب ذرا سکون ہوا، اور وہ چلنے لگی تو اُس نے پوچھا اب کب ملاقات ہوگی، پھر یہ بھی دیکھیے کہ اگر بجائے "نادت" کے شاعر "قالت" کہتا تو شعر میں وہ خوبی پیدا نہ ہوتی جو "نادت" کے لفظ سے پیدا ہوگئی ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فرطِ اضطراب کی وجہ سے محبوبہ کی آواز بھرّا گئی تھی، اور اس لیے اگرچہ وہ پاس ہی کھڑی ہوئی تھی، لیکن اضطراری طور پر آواز اُس کے حلق سے

نہیں پڑھ سکتا ہوں، آپ خود ہی پڑھ لیجئے " ابو جعفر منصور بولا "اگر تم اس قطعہ کو پڑھ دیتے تو میں تمہیں ضرور پٹواتا" ابو دلامتہ نے کہا "کیا خوب! درآنحالیکہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے یقولون مالا یفعلون " یہ لوگ وہ بات کہتے ہیں جسے خود نہیں کرتے " یعنی جب آپ خود مسجد میں پنجوقتہ حاضر ہو کر نماز جماعت سے ادا نہیں کرتے تو پھر مجھ سے کیوں اصرار کرتے ہیں کہ میں ایسا کروں " ابو دلامتہ کی زبان سے یہ بات سُن کر خلیفہ منصور کو کسی قسم کی ناگواری نہیں ہوئی، بلکہ اُسے ہنسی آگئی اور ابو دلامتہ کی حاضر جوابی پر خوش ہو کر اُس نے اُس کو انعام دلایا۔

ایک دفعہ منصور نے کسی ضرورت سے چند گھروں کے ڈھا دینے کا حکم دیا۔ ان میں ابو دلامتہ کا گھر بھی شامل تھا۔ ابو دلامتہ کو اس کی خبر ہوئی تو اُس نے یہ شعر لکھ کر خلیفہ کی خدمت میں روانہ کئے :-

یا ابن عم النبی دعوۃ شیخ   قد دنا ھدم دارہ و بوارہ

لکم الارض کلّھا فاعیروا   عبدکم ما احتوی علیہ جدارہ

ترجمہ:۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم تو اُس بڈھے کی فریاد سُن جس کا گھر گرنے کے قریب ہے اور اس کی ہلاکت و بربادی نزدیک ہے، تمہارے لئے تو ساری ہی زمین ہے، پس تم اپنے غلام کو عاریت کے طور پر اتنی زمین دیدو کہ اس پر اُس کی دیوار قائم ہو سکے

منصور نے یہ سُنکر حکم دیا کہ ابو دلامتہ کو اس گھر کے بدلے میں دوسرا گھر دیدیا جائے۔

خلفاء کی قدردانی کی وجہ سے حکومت کے عمال و اعیان بھی ابو دلامتہ کا بڑا خیال رکھتے اور اُس کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہتے تھے۔ ایک بار ابو دلامتہ پر دو ہزار کے قریب دراہم

کا قرض ہو گیا۔ قرضخواہ ایک اعرابی تھا۔ اُس نے سختی کے ساتھ اپنے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا تو ابو دلامۃ سخت پریشان ہوا اور اُس نے سعید بن دعلج کے نام جو بصرہ کا حاکم تھا ایک منظوم خط لکھ کر بغداد سے اپنے چچا زاد بھائی کے ذریعہ اُس کے پاس بھجوا دیا، ابن دعلج نے فوراً ابو دلامۃ کی خواہش کے مطابق مطلوبہ رقم اُس کے پاس بھیجدی[1]۔

ایک دفعہ مہدی رَی سے بغداد واپس آیا تو ابو دلامۃ سلام و تہنیت کی غرض سے حاضر ہوا، خلیفہ نے اس کی مزاج پرسی کی۔ اس پر اُس نے یہ شعر سنائے۔

إنّی حلفت لئن رأیتک سالمًا ‏ ‏ ‏ بقری العراق وأنت ذو وفر

لتصلّینّ علی النبی محمّد ‏ ‏ ‏ ولتملأنّ دراهما حجری

ترجمہ:- میں نے اس بات کی قسم کھا رکھی تھی کہ اگر میں نے آپ کو عراق کے علاقوں میں صحیح و سالم دیکھ لیا۔ درآنحالیکہ آپ مسرور و مطمئن ہوں، تو آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں گے اور میری گود کو دراہم سے پُر کردیں گے۔

مہدی نے (غالباً برسبیل مزاح) کہا، "تمہاری پہلی قسم تو ٹھیک ہے، مگر دوسری نہیں"

ابو دلامۃ بولا، "اللہ مجھ کو آپ پر قربان کردے، یہ دو ایسے کلمے ہیں جن میں تفریق نہیں ہوسکتی" مہدی نے حکم دیا کہ ابو دلامۃ کی گود دراہم سے پُر کردی جائے۔

وفات | ۱۶۱ھ میں انتقال ہوا، بعض کا خیال ہے کہ ابو دلامۃ ہارون رشید کے تخت نشین خلافت ہونے یعنی ۱۷۰ھ تک زندہ رہا۔ لیکن پہلی روایت ہی صحیح ہے۔

---

[1] یہ سب واقعات ابن خلکان اور تاریخ بغدادی سے ماخوذ ہیں۔

ترجمہ:۔ زینب کا گھر مٹ گیا، اور گویائی کے عوض اُس کو گنگ ملا۔

متنبی کا اعتراف | ابن عبد ربہ کے کمالِ شاعری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی کا مشہور شاعر ابو الطیب متنبی جو اپنی سخن سنجی کے سامنے بڑے سے بڑے کامل الفن شاعر کو نظر میں نہیں لاتا تھا، وہ بھی ابن عبد ربہ کی فصاحت و بلاغتِ شعر کا صدق دل سے معترف تھا، اور اندلس کا کوئی شخص اس سے ملتا تو وہ فرمائش کر کے ابن عبد ربہ کا کلام سنتا تھا۔ ایک مرتبہ خطیب ابو الولید بن عسال حج سے واپس ہوتے ہوئے مصر میں ٹھہرے تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر مسجد عمرو بن العاص میں متنبی سے بھی ملاقات کی۔ دونوں میں دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ اسی اثنا میں متنبی نے خطیب ابو الولید سے کہا "کیا آپ مجھ کو اندلس کے ملیح الکلام شاعر (ابن عبد ربہ) کے کچھ شعر نہیں سنائینگے؟" انہوں نے کہا "ضرور" اور پھر یہ شعر سُنائے۔

یا لؤلؤا یسبی العقول انیقا	ورشا بتقطیع القلوب رفیقا
ما إن رأیتُ ولا سمعت بمثلہ	ورداً یعود من الحیاء عقیقا
واذا نظرت الی محاسن وجہہ	ابصرت وجھك فی سناہ غریقا
یا من تقطع خصرہٗ من ردفہ	ما بال قلبك لا یکون رقیقا

ترجمہ:۔ اے صاف و شفاف موتی جو عقلوں کو گرفتار کر لیتا ہے۔ اور اے وہ ہرن جو دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیئے رفیق بنتا رہتا ہے۔

میں نے نہ کوئی ایسا گلاب کا پھول دیکھا اور نہ سُنا جو ہاتھ میں لیتے ہی عقیق بن جاتا ہو۔ اے مخاطب اگر تو اُس کے چہرہ کی خوبیوں کو دیکھے تو تجھ کو اپنا چہرہ اس کے چہرہ کی چمک

رونق میں ڈوبا ہوا نظر آئیگا۔

اے وہ کہ جس کی کمر بہت ہی نازک ہے..... تیرے دل کو کیا ہو گیا کہ وہ نرم نہیں ہوتا۔

خطیب یہ اشعار سنا چکے تو متنبی نے ان کو کرر پڑھنے کی فرمائش کی، پھر فرط مسرت و کیف سے تالیاں بجائیں اور عالم تصور میں ابن عبد ربہ کو مخاطب کر کے کہا ۔"اے ابن عبد ربہ تیرے سامنے تو عراق کے شعرا بھی زانو بستہ ہو کر آئینگے" اُس زمانہ میں عراق کو شعر و شاعری میں مرکز کا مرتبہ حاصل تھا[2]۔

کلام پر عجمیت کا اثر ابن عبد ربہ جس عہد کا شاعر تھا، اُس عہد میں عجمیوں اور بالخصوص ایرانیوں کے ساتھ معاشرتی اختلاط رکھنے کے باعث عربی شاعری میں طرز ادا، خیالات، اور مبالغہ پردازی کے اعتبار سے عجمیت کا کافی اثر پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ متنبی کے کلام میں بھی عجمی رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ابن عبد ربہ بھی اس اثر سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ اُس کے مجموعۂ کلام میں غور کیا جائے تو اس کی مثالیں کثرت سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ذیل کے قطعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اُس کا معشوق مونث کے بجائے کوئی مذکر ہے، جو ایرانی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:۔

یا ذا الذی خطّ الجمالُ بخدِّہ	خطّینِ ھاجا لوعۃً و بلابلا
ما صحّ عندی انّ لحظک صارمٌ	حتّٰی لبستَ بعارضیک حمائلا

---

[1] معجم الادباء ج ۲ ص ۲۲۲ و ۲۲۳ [2] ایضاً ج ۴ ص ۲۲۱، ۲۲۲

اس طرح نکل رہی تھی کہ گویا وہ کسی کو آواز دے رہی ہے۔

ایک دفعہ ابن عبد ربہ کے کسی محبوب ترین دوست نے سفر کرنے کا ارادہ کیا، اور روانگی کے لیے صبح کا وقت مقرر بھی کر دیا لیکن اتفاق سے صبح کو زور کی بارش ہونے لگی جس کی وجہ سے دوست کو روانگی کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس پر ابن عبد ربہ نے چند اشعار لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا، وہ اشعار یہ ہیں:۔

هَلَّا ابتكرت لبينٍ انت مبتكرٌ ۔۔۔ هيهات يأبى عليك الله والقدرُ

ما زلتُ ابكي حذار البين مُلتهفاً ۔۔۔ حتّى رثالي فيك الريح والمطرُ

يا بردةً من حيا مزنٍ على كبدٍ ۔۔۔ نيرانُها بغليل الشوق تستعرُ

آليتُ ألّا أرىٰ شمساً ولا قمراً ۔۔۔ حتّى اراك فانتَ الشمسُ والقمرُ

ترجمہ:۔ تم نے جدا ہو جانے میں جلدی کیوں نہیں کی۔ تم تو جلدی کرنے والے تھے، ہاں بس رہنے بھی دو، اللہ اور تقدیر تو دونوں تمہیں جانے سے روکنے والے تھے دیکھ تم کس طرح جلد رخصت ہو سکتے تھے)

میں حسرت زدگی کے ساتھ جدائی کے ڈر سے برابر روتا رہا، یہاں تک کہ تمہارے معاملہ میں ہواؤں اور بارش کو بھی میرے حال زار پر ترس آگیا۔

سبحان اللہ! بارش کی اُس ہلکی پھوار کا کیا کہنا جس نے تپش شوق سے مشتعل ہونے والی آگ میں جلتے ہوئے جگر کو ٹھنڈا کر دیا۔

میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک تمہیں نہیں دیکھ لونگا، سورج اور چاند کو نہیں دیکھونگا، کیونکہ

(دراصل) میرے آفتاب و ماہتاب تو تم ہی ہو۔

پہلے شعر میں شاعر نے جس محبت آمیز طنز کے پیرایہ میں دوست کے سفر نہ کر سکنے پر اپنی خوشی کا اظہار نہایت بلیغ انداز میں کیا ہے حق یہ ہے کہ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تو جانے کی بڑی جلدی کر رہے تھے، لیکن چلے نہیں گئے! اور جاتے کس طرح! قدرت تو تمہارے نہ جانے کا اٹل فیصلہ کر چکی تھی۔

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عبد ربہ کی نگہِ حقیقت آشنا سے انسانی جذبات و حسیات کا مخفی سے مخفی گوشہ بھی پوشیدہ نہ تھا، پھر اس کی قدرتِ کلام کا یہ عالم ہے کہ معنوی احساسات کو اس انداز سے نظم کرتا ہے کہ وہ پیکرِ محسوسات میں جلوہ نما ہو کر سننے والوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اور یہی شاعری کا منتہائے کمال ہے۔

غزلیہ اشعار کے علاوہ ابن عبد ربہ نے بعض قصائد بھی کہے ہیں جو منذر بن محمد بن عبدالرحمن بن الحکم کی مدح میں ہیں۔ منذر اندلس کے حکمرانِ بنو امیہ میں سے تھا، ان میں سے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:۔

یا المنذر بن محمد	شرفت بلاد الاندلس	اندلس کے شہر منذر بن محمد کے دم سے شرف اندوز ہو گئے
فالطیر فیھا ساکن	والوحش فیھا قد انس	پرندے ان شہروں میں ساکن ہیں، اور وحشی جانوران میں مانوس ہیں

ایک ہم عصر شاعر الایادی التونسی نے اس پر معارضہ کر کے اسی بحر اور قافیہ میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

ربع لزینب قد درس   واعتاض من نطق خرس

جن کے آنسو اب بہہ رہے ہیں۔ پس اگر کوئی اس دنیا سے چلا گیا ہے تو تو اس کے غم سے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کا سرمہ مت لگا، کیونکہ تو خود بھی جانے والا ہی ہے۔

العقد الفرید: اس میں شبہ نہیں جیسا کہ مذکورہ بالا منتخب اشعار سے واضح ہوتا ہے۔ ابن عبد ربہ عربی کا بہت باکمال شاعر تھا، لیکن اس کی شہرت زیادہ تر نظم کے بجائے نثر میں ہے۔ نثر میں اس کی مشہور اور ضخیم کتاب "العقد الفرید" عربی لٹریچر میں ایک نہایت بلند و وقیع مرتبہ رکھتی ہے صاحب بن عباد جو خود عربی زبان کا بلند پایہ انشا پرداز اور ادیب تھا، اس نے اس کتاب کا سماع کیا، تو از راہ اشتیاق و قدردانی اس کا ایک نسخہ حاصل کر کے اپنے کتب خانہ میں رکھا اور یہ الفاظ کہے "هٰذه بضاعتنا رُدَّت الینا" یہ تو ہماری ہی پونجی تھی جو لوٹا کر ہم کو دیدی گئی ہے۔[1]

اس کتاب نے ابن عبد ربہ کو شہرت و عظمت کے آسمان کا مہر منیر بنا دیا اور ہر طرف اس کی علمیت و قابلیت، وسعتِ معلومات، زورِ انشا، اور فصاحت و بلاغت کے چرچے ہونے لگے۔ حمیدی کے الفاظ یہ ہیں "ابو عمر کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا، دیانت اور پاکیزہ نفسی کے باوصف ادب میں اس کو ریاست و شہرت حاصل تھی لیل و نہار اس کے موافق تھے۔ علم کی وادیوں میں اس کے نام کا سکہ چلتا تھا، وہ علم و ادب میں غیر معمولی کمال رکھنے کے باعث ہی گمنامی کے بعد سردار، اور فقر کے بعد صاحبِ ثروت اور مالدار ہوا فضیلت و ہنر میں اس کا عام چرچا تھا۔"[2]

---

[1] معجم الادباء ج ۴ ص ۲۱۴، ۲۱۵ [2] معجم الادباء ج ۴ ص ۲۱۵۔

تو اپنے دل کی آنکھ سے مشاہدہ کر، کیونکہ یہ چشم ظاہر تو حقیقت سے بے خبر ہے اور تو سمجھ لے کہ دنیا دوزخ ہے جو سیاہ فام ہے، اور جو غصہ کے مارے پھنکاریں مار رہی ہے اس دوزخ کو جب ظالموں کے لیے گرم کردیا جائیگا تو یہ کسی ایک چیز پر نہ رحم کھائیگی اور نہ اُس کو باقی رہنے دیگی۔

اگر تیرے لیے موت کے سوا کوئی اور بھی نصیحت و پند نہ ہو تو یہی لذتوں سے روکنے کے لیے تجھ کو کافی ہے۔

ابن عبد ربہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو عبرت و نصیحت کے اشعار اُس میں کثرت سے پائے جاتے ہیں جن میں اُس نے دنیا کی بے ثباتی اور اس زندگی کی بے حقیقتی اور ناپائداری کا بہت موثر الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے۔

الا انما الدنیا غضارۃُ ایکۃٍ ۔۔۔ اذا اخضرّ منہا جانبٌ جفّ جانبُ

ھی الدار ما الآمال الا فجائعٌ ۔۔۔ علیھا ولا اللذات الا مصائبُ

وکم اسخنت بالامس عینا قریرۃً ۔۔۔ وقرّت عیونٌ دمعھا الآن ساکب

فلا تکتحل عینیک منھا بعبرۃٍ ۔۔۔ علی ذاھبٍ منھا فانک ذاھبُ

ترجمہ: ہاں سن لو کہ دنیا کی مثال درخت جھاؤ کی سرسبزی و شادابی کی سی ہے کہ جب اُس کی ایک جانب سبز ہوتی ہے تو دوسری جانب خشک ہو جاتی ہے۔

یہ دنیا ایک ایسا گھر ہے جس کی آرزوئیں محض پریشانیاں ہیں۔ اور جس کی لذتیں صرف مصیبتیں ہیں۔

اس دنیا نے کل کتنی ٹھنڈی آنکھوں کو (رنج و غم سے) گرم کردیا، اور کتنی ٹھنڈی آنکھیں ہیں

کرنے کے بعد وہ سنجار آیا۔ اور پھر یہاں سے وہ حلب چلا گیا جہاں آخری لمحۂ زندگی تک وہ مقیم رہا۔
مرو کے دورانِ قیام میں یاقوت نے اپنی کتاب معجم البلدان کے لیے بہت کچھ مواد فراہم کر لیا تھا لیکن اس کی تکمیل وزیر جمال الدین القفطی کی مدد سے حلب میں ہوئی۔

یاقوت کی قدر و منزلت حلب کے وزیر جمال الدین القفطی کو یاقوت سے بڑی ارادت تھی۔ اور وہ یاقوت کے علمی و ادبی کمالات کی بڑی قدر کرتا تھا۔ چنانچہ یاقوت نے وزیر کے نام موصل سے ایک طویل خط لکھا تھا جس کو علامہ ابن خلکان نے از اول تا آخر نقل کیا ہے۔ اس خط میں یاقوت نے تاتاریوں کے ڈر سے موصل بھاگ آنے اور دورانِ سفر میں اس کو جو جو مشکلات پیش آئی ہیں اُن سب کو بڑی تفصیل سے اور نہایت مؤثر پیرایہ میں قلمبند کیا ہے۔ اس خط میں مرو کی علمی و ادبی سہولتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

تصنیفات یاقوت نے چند در چند پریشان حالیوں اور شہر بشہر مارے مارے پھرتے رہنے کے باوجود کئی ضخیم کتابیں تصنیف کیں جن کی وجہ سے بقاءِ دوام کی لوح پر اُس کا نام جلی حروف میں کندہ ہے۔ کتابوں کے نام اور اُن کی کیفیت حسب ذیل ہے

(۱) ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب۔ یہ کتاب عام طور سے معجم الادبا یا طبقات الادباء کے نام سے معروف ہے۔ کشف الظنون اور ابن خلکان میں اس کا نام "ارشاد الالبا، الی معرفۃ الادبا" لکھا ہے۔ اس میں نحویوں، علماءِ لغت و قرأت، علماءِ اخبار و انساب، اور ارباب نثر و انشا کے اور جنہوں نے ادب میں تصنیفات کی ہیں اُن سب کے حالات ہیں۔ یہ کتاب پہلے پروفیسر مارگولیوتھ (D.S. Margoliouth) اُستاذ عربی آکسفورڈ یونیورسٹی کے اہتمام سے سات

اجزاء میں گب میموریل کی طرف سے شائع کی گئی تھی، مگر اس میں متعدد نقائص رہ گئے تھے۔ اب دوبارہ مزید اضافوں اور نہایت اہتمام کے ساتھ ڈاکٹر احمد فرید رفاعی کے زیر نگرانی مصر سے بیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۲) "المشترك وضعاً والمفترق صقعاً" یہ کتاب شہروں کے حالات میں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یاقوت نے یہ کتاب اپنی تصنیف معجم البلدان سے ہی اخذ کر کے حروف کی ترتیب کے اعتبار سے لکھی ہے۔ پروفیسر وسٹنفلڈ کے اہتمام سے ۱۸۴۶ء میں ۴۷۰ صفحات پر شائع ہوئی۔

(۳) "معجم البلدان" یہ جغرافیہ کی مشہور کتاب ہے، جس میں شہروں، دیہاتوں، ویرانوں آبادیوں کے جغرافیائی حالات و وقائع نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ یاقوت اس کتاب کی تصنیف سے ۱۰ صفر ۶۲۱ھ میں حلب میں فارغ ہوا تھا اور اس کو جمال الدین القفطی وزیر حلب کے کتب خانہ کے لیے نذر کر دیا تھا، پہلے یہ کتاب چھ اجزاء میں وسٹنفلڈ کے زیر اہتمام لیپزگ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چھٹے جز میں شہروں کے قبیلوں، اور عورتوں اور مردوں کے ناموں کی فہرست ہے، جو بارہ ہزار سے زیادہ ناموں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ یہ کتاب دس اجزاء میں سید امین الخانجی کے زیر اہتمام مصر سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک ذیل بھی ہے جو دو جلدوں میں ہے، جس کا نام "معجم العمران فی المستدرک علی معجم البلدان" ہے۔ جس میں صاحب ذیل نے موجودہ زمانہ کے مشہور مقامات، نیز یورپ و امریکہ کے ملکوں اور شہروں کے حالات درج کر دیے ہیں، اور اپنی معلومات کی بنیاد جدید علماء جغرافیہ کے بیانات و تحقیقات پر رکھی ہے[1]۔

[1] معجم المطبوعات ج ۱۰ ص ۱۹۴۳۔

ابو عبد اللہ یاقوت الحموی[1]

نام و نسب | یاقوت نام، ابو عبد اللہ کنیت، نسلاً رومی تھا، اور بغداد میں سکونت اختیار کرلی تھی، لقب شہاب الدین تھا۔

ولادت | روم کے شہر حماۃ میں ۵۷۴ھ یا ۵۷۵ھ میں ولادت ہوئی

غلامی اور آزادی | یاقوت بچپن میں ہی گرفتار ہو کر غلام بنا لیا گیا، اور فروخت کر دیا گیا تھا۔ بغداد کے ایک بڑے تاجر نے جس کا نام عسکر بن ابی نصر الحموی تھا خرید لیا۔ عسکر لکھنا پڑھنا اور تجارتی حساب جانتا نہیں تھا۔ اس لیے اُس نے یاقوت کو کاروبار میں مدد دینے کے لیے لکھنے پڑھنے کے کام پر مقرر کر دیا۔

یاقوت نے زیادہ عمر ہو جانے پر نحو اور لغت کی تعلیم حاصل کی اور اب عسکر نے یاقوت کو تجارتی سفر پر لگا دیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یاقوت کو کیش اور عمان آنا جانا پڑتا تھا اور پھر وہ شام واپس آجاتا تھا بہت دنوں تک یاقوت یہ کام انجام دیتا رہا، لیکن سوئے اتفاق سے آقا اور غلام دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی اور آقا نے تنگ آکر غلام کو آزاد کر دیا۔ یہ واقعہ ۵۹۶ھ کا ہے۔

علمی مطالعہ | آزاد ہونے کے بعد یاقوت نے کتابت کر کے معاش پیدا کرنی شروع کی جس میں اُس کو بہت سی عمدہ اور مفید کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ کچھ مدت کے بعد جب عسکر کا غصہ فرو ہو گیا تو اُس نے یاقوت کو پھر اپنے پاس بلا لیا اور اُس کو کچھ دے دلا کر کیش کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیج دیا

---

[1] معجم الادبا کے طابع و ناشر نے کتاب کے شروع میں یاقوت الحموی کے جو حالات و سوانح لکھے ہیں وہ سب تاریخ ابن خلکان ج ۲ از ص ۲۱۰ تا ص ۲۱۴ اور شذرات الذہب ج ۵ از ص ۱۰۵ تا ص ۱۰۶ سے ماخوذ ہیں۔ یاقوت کے حالات کے لیے ہمارا ماخذ بھی یہی دونوں کتابیں ہیں۔

یاقوت اس سفر سے واپس آیا تو یہاں عسکر کا انتقال ہو چکا تھا۔ یاقوت نے کیش کے سفر میں جو کچھ نفع حاصل کیا تھا، اُس کا ایک قلیل حصّہ اپنے پاس رکھا، اور اس کے علاوہ جو کچھ بچا وہ سب اپنے آقا کی بیوی اور اُس کی اولاد کے سپرد کر دیا جس سے یہ سب لوگ راضی ہو گئے۔ یاقوت کو جو کچھ ملا تھا اُس کو اُس نے راس المال بنا کر تجارت شروع کر دی اور اس تجارت میں کتابوں کو بھی شامل کر لیا۔

خارجی عقیدہ اس زمانہ میں یاقوت کی نظر سے چند خارجی عقائد و خیالات کی کتابیں گذریں جن سے یاقوت بہت زیادہ اثر پذیر ہوا۔ ۶۱۳ھ میں اُس نے دمشق کے ایک بازار میں دکان کھول لی، اور یہیں اُس کو ایک بغدادی سے مناظرہ کا اتفاق ہوا۔ اس مناظرہ میں یاقوت کی زبان سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں بعض نہایت ناشائستہ الفاظ نکل گئے، مسلمان ان الفاظ کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ ایک گروہ نے اُس پر حملہ کر دیا اور اتنا زدوکوب کیا کہ وہ مرتے مرتے بچا، لیکن اب دمشق میں اُس کا قیام دشوار ہو گیا۔ اور وہ یہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلا۔

دمشق کے حاکم کو یاقوت کی بدزبانی کا علم ہوا تو اُس نے اُس کے تعاقب میں اپنے گماشتے روانہ کر دیے، لیکن یاقوت ان لوگوں کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا، وہ دمشق سے فرار ہو کر حلب آیا۔ اور پھر یہاں سے جمادی الاخریٰ ۶۱۳ھ میں وہ موصل پہنچا، یہاں سے اربل، اور اربل سے خراسان میں داخل ہوا، خراسان پہنچ کر اُس نے اپنا تجارتی کاروبار شروع کر دیا اور ایک مدت تک مرو میں قیام پذیر رہا۔ آخر کار اُس کو یہاں سے بھی منتقل ہونا پڑا، اور وہ نسا ہوتا ہوا خوارزم پہنچا۔ یہاں اُس کو تاتاریوں کے حملے کی خبر ملی جس نے اُس کے رہے سہے اوسان خطا کر دیے۔ اب وہ پریشان ہو کر پھر موصل آیا۔ دوران سفر میں اُس کو لباس و طعام کی تنگی نے بہت دل شکستہ کیا، ایک مدت مدید تک موصل میں قیام

ان کتابوں کے علاوہ علامہ ابن خلکان نے یاقوت کی کئی اور کتابوں کے بھی نام لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں :۔

(۱) کتاب المبدء والمآل فی التاریخ (۲) کتاب الدّوَل (۳) مجموع کلام ابی علی الفارسی (۴) عنوان کتاب الاغانی (۵) المقتضب فی النسب (۶) کتاب اخبار المتنبی

مختصر تبصرہ

یاقوت کے علمی کارنامے یاقوت کے عمیق ذوقِ مطالعہ اور اُس کے تبحرِ فن کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ اُس کو کسی ایک مقام پر بھی اطمینان سے ٹھہرنے کا موقع نہیں ملا تاہم اُس نے اپنا مطالعہ برابر جاری رکھا۔ اُس کی دو ضخیم کتابیں "معجم الادبا" اور "معجم البلدان" ہماری نظر سے گذری ہیں۔ اُن کو دیکھ کر یہ بوثوق کہا جاسکتا ہے کہ یاقوت غیر معمولی قوتِ انشاء وسعتِ علم، اور مہارتِ ادبیات کا مالک تھا۔ یاقوت کو صرف مرو میں کسی قدر اطمینان سے قیام کا موقع ملا تھا۔ اُس نے ان لمحاتِ فرصت کو ضائع نہیں جانے دیا۔ اور ان سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

"میں نے مرو کے قیام کے زمانہ میں علوم وآداب کی، اور ارباب فہم وخرد کی ایسی کتابیں پائیں جنہوں نے مجھ کو بال بچوں اور وطن کی یاد سے، اور اپنے دوستوں اور ہر قسم کی راحت وآسائش کے خیال سے بے پروا کردیا۔ یہاں مجھ کو گویا میری دولتِ گمشدہ مل گئی، اور میں نے اپنا مقصد دیرینہ حاصل کرلیا۔ میں ایک حریص اور للچائے ہوئے انسان کی طرح ان کتابوں کے مطالعہ پر متوجہ ہوگیا۔ میں ان کتابوں کی چراگاہوں میں لطف اندوز ہوتا پھرتا تھا، اور اس لطف وراحت سے بہرہ ور ہوتا تھا۔"[1]

[1] ابن خلکان ج ۲ ص

معجم الادباء کے شروع میں یاقوت نے ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں بتایا ہے کہ شعراء و ادباء کے حالات میں مجھ سے پہلے بھی متعدد علماء ادب و انشاء نے کتابیں لکھی ہیں، مگر وہ سب ناتمام ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے جس خوبی سے یاقوت علماء و ادباء کے حالات اور اُن کے نمونہائے کلام بیان کرتا ہے اس طرح اُس سے پہلے کسی اور مصنف نے بیان نہیں کیے۔ چنانچہ آج بھی علماءِ ادب و انشاء کے حالات میں سب سے بڑا ذریعہ معلومات یہی کتاب ہے۔ پھر اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یاقوت نے محض سُنی سنائی باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جو کچھ لکھا ہے کمالِ تحقیق اور غایت ژرف نگاہی سے لکھا ہے۔ ایک ایک ادیب کے حالات کی تحقیق میں اُس نے شہر بشہر پھر کر سیکڑوں لوگوں سے ملاقات کی ہے، اور پھر اُس کا سنہ پیدائش و وفات، اور دوسرے احوال و سوانح جامعیت سے قلمبند کئے ہیں۔ وہ مقدمہ میں خود کہتا ہے:۔

"میں نے اس کتاب میں علماءِ نحو و لغت، علماءِ انساب، مشہور قرّاء، علماءِ تاریخ و اخبار، مورخین، مشہور نسّاخ، معروف انشاپرداز، ارباب تصنیف و تالیف، ان سب کے حالات اختصار و ایجاز کے ساتھ جمع کردیے ہیں، اور میں نے تاریخہائے پیدائش و وفات اور اُن کی تصانیف کے ذکر میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان چیزوں کے ساتھ میں نے ان ادباء کے پسندیدہ احوال، اُن کے نسب نامے اور اُن کے اشعار بھی لکھے ہیں۔ وہ ادباء جن سے میں نے خود ملاقات کی ہے، یا جن سے ملاقات کرنے والوں سے مجھ کو ملاقات کا موقع ملا ہے اُن کے احوال اور حقائق اخبار تو میں نے اس طرح قلمبند کیے ہیں کہ اس کے بعد آپ کو کسی اور چیز کے معلوم کرنے کا شوق باقی ہی نہیں رہیگا۔ رہے وہ ادباء و فضلاء جن کا عہد میرے عہد سے پہلے گذر

چکاہے، تو اُن کے حالات کی تحقیق میں میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ شہر بشہر اور ملک بملک کے سفروں میں لوگوں سے مل کر جو تحقیق و تفتیش کرسکتا تھا میں نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ایسے اصحاب سے متعلق معلومات کے اخذ کرنے میں میں نے مستند علماء کی کتابوں پر اعتماد کیا ہے[1]۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یاقوت نے اس کتاب میں کسی خاص عہد اور کسی خاص ملک کے ادباء کا ہی نہیں بلکہ بصرہ، کوفہ، بغداد، خراسان، حجاز، یمن، مصر، شام اور مغربی ممالک ان سب کے اور ہر زمانہ کے علماء و ادباء کا تذکرہ کیا ہے۔

یاقوت نے چونکہ اس کتاب کو نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا تھا۔ اس لیے وہ اُسے بے حد عزیز رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ چند افاضل کی جماعت اس کے پاس آئی اور درخواست کی کہ اپنی کتاب کے نسخے لکھوا دیجیے تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔
یاقوت نے اس واقعہ کو ایک نظم میں نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ آخر شعر میں کہتا ہے۔

وامنعہا الجہال فہی حبیبۃ ۔۔۔ جری حبہا مجری دمی فی مفاصل

ترجمہ:۔ میں اس کو جاہلوں سے باز رکھتا ہوں کیونکہ یہ مجھے اس قدر محبوب ہے کہ اُس کی محبت خون کی طرح میرے بدن کے جوڑوں میں جاری و ساری ہے۔

ایک اور نظم میں اس کتاب کے ساتھ اپنی غیر معمولی محبت کا اظہار اس طرح کرتا ہے:۔

ولو انني انصفته في محبتي ۔۔۔ لجلدته جلدي وصنته عظمي
عزيز على فضلي بالا اطيعه ۔۔۔ على بذله للطالبين على العلم

---

[1] مقدمہ معجم الادباء، ص ۴۹۔

ولو انّني استطيع من فرط حبّه ۔۔۔ لما زال من كفّي ولا غاب عن كمّي

ترجمہ: "اگر میں اس کتاب کی محبت میں انصاف سے کام لیتا، تو اپنی جلد کو اس کی جلد اور اپنی ہڈیوں کو اس کا صندوق بنا دیتا، یہ کتاب مجھ کو اپنے فضل کے باوجود اس درجہ عزیز ہے کہ میں طلبائے علوم کے لیے اس کو خرچ کر ہی نہیں سکتا، اس کتاب کی فرطِ محبت کی وجہ سے اگر میں استطاعت رکھتا ہوتا تو یہ کبھی میرے ہاتھ اور میری آستین سے غائب نہیں ہوتی"۔

اس کتاب میں جن حضرات کے حالات لکھے گئے ہیں اُن کی تعداد ایک ہزار پچاس کے قریب ہے۔ دوسری اہم کتاب معجم البلدان ہے مصنف کو اس کے لکھنے کا خیال ایک عجیب واقعہ کی بناء پر پیدا ہوا جس کو خود اُس نے اس طرح بیان کیا ہے: "۶۱۵ھ میں جبکہ یاقوت مرو میں قیام پذیر تھا، ایک دن شہید فخر الدین کی مجلس میں شریک تھا کہ وہاں کسی شخص نے لفظ "حُبَاشَہ" کی نسبت سوال کیا (یہ لفظ ایک حدیث میں آیا ہے اور عہدِ جاہلیت عرب میں جو بازار لگتے تھے اُن میں سے ایک بازار کا نام ہے) یاقوت نے جواب دیا "یہ لفظ "حُباشہ" بضم الحاء ہے حَباشہ بفتح الحاء نہیں" یاقوت کا خیال یہ تھا حبشت لہ حباشۃ کے معنیٰ جمع کرنا آتے ہیں، اس لیے فُعَالَۃٌ کے وزن پر حُباشہ بضم الحاء کے معنیٰ ہیں وہ جگہ جہاں مختلف قبیلے اکٹھے ہو گئے ہوں لیکن ایک محدث جو اس وقت وہاں موجود تھے اُنھوں نے یاقوت کی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس پر ہی مصر رہے کہ یہ لفظ "حَبَاشَہ" ہے، حالانکہ اُن کے پاس اس کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں تھی۔ اب یاقوت کے لیے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ غرائبِ احادیث اور دواوینِ لغات سے اپنے دعوے کی کوئی سند پیش کرے۔ مرو میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود تھا، یاقوت نے تلاش شروع کر دی، اور آخر کار محنت بسیار کے بعد اُسے اپنے دعوے کی قوی دلیل مل گئی۔ اس معاملہ

میں یاقوت کو کامیابی تو حاصل ہو گئی لیکن اُسی وقت سے اُس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ عوام تو عوام علما تک کو ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جس میں دنیا کا جغرافیہ مع شہروں، دیہاتوں، قصبوں اور پہاڑوں وغیرہ کے ناموں کی تصحیح کے صحیح صحیح بیان کیا گیا ہو، چنانچہ یہ کتاب بھی معجم الادبا کی طرح حروفِ تہجی کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے اس میں پہلے مصنف لفظ کا صحیح تلفظ بتاتا ہے پھر اُس کا جائے وقوع۔ اور دوسری ضروری جغرافیائی معلومات بہم پہنچاتا ہے اور موقع بموقع اُس مقام کی مناسبت سے اشعار نقل کر کے ایک خشک علمی موضوع کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔

یاقوت نے معجم البلدان کے شروع میں بھی ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں جغرافیہ کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں لکھتا ہے کہ عالم خواہ کسی مرتبہ اور درجہ کا ہو اُس کو جغرافیہ کا جاننا ازبس ضروری ہے۔ تمثیلاً یاقوت نے اپنے زمانہ کے ایک نامور ادیب کا ذکر کیا ہے جنہوں نے مقاماتِ حریری کی شرح بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھی ہے، اور جن کے ادیب کامل ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس ادبی مہارت کے باوجود انہوں نے اپنی شرح میں ایسی جغرافی غلطیاں کی ہیں جن کے باعث اُن کا اصل کمال بھی چھپ گیا، اور خود اربابِ فن کے لیے سامانِ تمسخر بن کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً مقامۂ کرجیہ میں شارح فاضل لکھتا ہے کہ کرج ہمدان اور آذربیجان کے درمیان ایک شہر ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے، بلکہ وہ ہمدان اور اصفہان کے درمیان ہے۔ اسی طرح تبریزیہ مقامہ میں شارح نے لکھا ہے کہ تبریز عواصم شام سے ہے اور اس میں اور منبج میں بیس فرسنگ کا فاصلہ ہے۔ شارح کا یہ لکھنا بھی غلط ہے کہ تبریز تو بہت مشہور شہر ہے اور ہمارے زمانہ میں وہ آذربیجان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے، الغرض یہ ہے شارح مقامات نے اپنی جلالتِ علم و ادب کے باوجود جغرافیہ دانی

کے میدان میں قدم قدم پر ایسی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

یاقوت نے اس کتاب کو بھی انتہائی امکانی تحقیق اور سعی وکاوش سے مرتب کیا ہے۔"معجم العمران" کے فاضل مرتب سید محمد امین الخانجی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ گذشتہ سالوں اور دنوں کے کسی شخص کی نسبت غلطی سے محفوظ رہنے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف ابوعبداللہ یاقوت الحموی الرومی کی ذات ہے[1]۔

وفات | پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ یاقوت آخر میں حلب میں فروکش ہو گیا تھا یہیں اُس کو فرشتہ اجل کا پیغام پہنچا، اتوار کے دن ۲۰۔ رمضان ۶۲۶ھ کو وفات پائی۔ وفات سے قبل یاقوت نے اپنا کتب خانہ بغداد کی مسجد الزیدی کے لیے وقف کر کے اُس کی کتابیں تاریخ ابن اثیر کے مشہور فاضل مصنف شیخ عزالدین ابوالحسن علی بن الاثیر کے سپرد کر دی تھیں۔ زندگی میں تو یاقوت کی کچھ ایسی زیادہ قدر نہیں ہوئی لیکن وفات کے بعد لوگ اُس کے فضل وادب کا ذکر کر کے اُس کا ماتم کرتے تھے اور اُس کی ثناء کے گیت گاتے تھے۔

ابوالدر یاقوت بن عبداللہ الرومی

نام ونسب | یاقوت نام، ابوالدر کنیت، والد کا نام عبداللہ تھا، لقب مہذب الدین تھا، نسلاً رومی تھا لیکن سن شعور وتمیز کو پہنچنے کے بعد اُس نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا تھا چنانچہ ابن ذہبی نے کتاب الذیل میں اس کا شمار اُن لوگوں میں کیا ہے جن کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ابومنصور الحیلی

[1] خطبۃ الکتاب معجم البلدان ج ۹

کا غلام تھا۔

پیدائش اور تعلیم: بغداد میں پیدا ہوا، اور یہیں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہو کر پہلے قرآن مجید حفظ کیا خط کی مشق کی اور علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ عربی ادب سے اس کو قلبی لگاؤ تھا چنانچہ اس کو نہایت محنت و شوق سے حاصل کر کے اس میں اتنا کمال بہم پہنچایا کہ آج اس کا شمار عربی کے بہترین غزلگو شعراء میں ہوتا ہے۔

شاعری: علامہ ابن خلکان اس کی نسبت لکھتے ہیں " یاقوت نے اشعار کثرت سے کہے ہیں اس کے اشعار زیادہ حسن و عشق کے رموز، اور محبت و الفت کے وارداتِ قلبی پر مشتمل ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں۔ یہ اشعار عراق اور بلاد شرق و شام میں بہت رائج ہیں، اور شام کے فقہا تک انھیں کثرت سے پڑھتے ہیں۔

یاقوت کی خصوصیت زبان کی سلاست، اندازِ بیان کی دلکشی اور بے ساختگی ہے وہ بعض پیش پا افتادہ مضامین کو اس خوبی اور جدت ادا سے بیان کرتا ہے کہ سننے والے پر ایک عجیب کیفیتِ سُکر طاری ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک نظم میں کہتا ہے۔

ان غاض دمعك فالاحباب قد بانوا ۔۔۔ فكل ما ادعى زور و بهتان

وكيف تأنس او تنسى خيالهم ۔۔۔ وقد خلا منهم ربع واوطان

لا اوحش الله من قوم نأوا فنأى ۔۔۔ عن النواظر اقمار و اغصان

ساروا فسار فؤادي اثر ظعنهم ۔۔۔ وبان جيش اصطباري ساعة بانوا

ترجمہ:۔ جتنے دوست تھے، سب چلے بھی گئے۔ اب اگر تیرے آنسو خشک ہو جائیں تو تیرے

تمام دعوے سراسر جھوٹ اور گپ ہیں۔

(۲) تو کس طرح چین سے بیٹھ سکتا ہے، یا کس طرح اُن احباب کے خیال کو بھول سکتا ہے، جبکہ اُن سے مکانات اور وطن دونوں خالی ہو گئے۔

(۳) خدا اُس جماعت سے متوحش نہ کرے جو ہم سے دور ہو گئی، اور جس کے دور ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ گویا کتنے ہی چاند اور لچکتی ہوئی ڈالیاں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں

(۴) جب وہ چلے تو دل اُن کے پیچھے پیچھے ہی چل پڑا۔ اور جس گھڑی وہ جدا ہوئے میرے صبر کا لشکر بھی مجھ سے جدا ہو گیا۔

یاقوت صاحب دیوان شاعر تھا۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "مجھ کو سنہ ۶۶۷ھ میں دمشق کے قیام میں یاقوت کے دیوان کے دو نسخے ملے تھے۔ یہ دیوان زیادہ ضخیم نہیں ہے۔

وفات | یاقوت کی وفات کا واقعہ عجیب قسم کا ہے۔ اُس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی کہ بدھ کے دن بتاریخ ۱۵۔ جمادی الاولیٰ سنہ ۶۲۲ھ کو اُسے ایک مکان میں مردہ پایا گیا۔[1]

تمام شد

---

[1] یہ سب حالات ابن [illegible] ۲۰۸، ۲۰۹ سے ماخوذ ہیں۔